حرفِ چند

(حصہ دوم)

جمیل الدین عالی

انجمن ترقی اردو پاکستان

حرفِ چند

(حصہ دوم)

جمیل الدّین عالی

انجمن ترقی اردو پاکستان
ڈی-۱۵۹ بلاک (۷) گلشن اقبال
کراچی- ۷۵۳۰۰

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان ۷۰۵
I.S.B.N 969-403-032-3

اس کتاب کی اشاعت کے لیے حکومت پاکستان نے اکادمی ادبیات پاکستان کے توسط سے مالی امداد فراہم کی ہے۔

پہلی اشاعت:	۱۹۹۳ء
طابع:	مشہور آفسیٹ پریس۔ کراچی
ناشر:	انجمن ترقی اردو پاکستان ڈی۔ ۱۵۹۔ بلاک (۷) گلشن اقبال کراچی۔ ۷۵۳۰۰
قیمت:	ایک سو پچیس روپے

مندرجات

مقدمہ	مشفق خواجہ	۵
مقدمہ (حصۂ اول)		۱۱

۱۹۷۴ء

۱۔ خطباتِ گارساں دتاسی	دوسری اشاعت	۲۳

۱۹۷۵ء

۲۔ فرہنگ اصطلاحاتِ پیشہ وراں	دوسری اشاعت	۲۷
۳۔ اردو تھیٹر		۳۱

۱۹۷۸ء

۴۔ جنگ نامہ آصف الدولہ نواب رام پور		۳۷
۵۔ ماخذات (جلد اول)		۴۱

۱۹۸۴ء

۶۔ ماخذات (جلد سوم)		۴۵

۱۹۸۹ء

۷۔ کاروانِ صحافت	دوسری اشاعت	۴۹
۸۔ غالبِ آشفتہ نوا		۵۳
۹۔ مولانا احسن مارہروی		۵۷
۱۰۔ مضامین اختر جوناگڑھی		۶۳
۱۱۔ تنقید اور جدید اردو تنقید		۷۵
۱۲۔ غالب کے خطوط (جلد اوّل)	دوسری اشاعت	۸۱

۱۳۔ اردو اور ہندی کے جدید مشترک اوزان ۹۵
۱۴۔ مولانا صلاح الدین احمد ۹۹
۱۵۔ سیف الملوک ۱۰۳

۱۹۹۰ء

۱۶۔ جدید اردو شاعری ۱۰۷
۱۷۔ دیوانِ غالب (کامل) ۱۱۱
۱۸۔ البیرونی تیسری اشاعت ۱۱۵

۱۹۹۱ء

۱۹۔ مقالاتِ برنی (حصہ دوم) ۱۵۹
۲۰۔ داستانِ سحر البیان ۱۶۳
۲۱۔ اردو۔ قومی یکجہتی اور پاکستان ۱۷۵
۲۲۔ فرہنگ اصطلاحات بینکاری ۲۰۵
۲۳۔ مرقع اقوال و امثال ۲۶۵

۱۹۹۲ء

۲۴۔ مضامین غلام ربانی ۲۷۹
۲۵۔ بابائے اردو ۲۹۳
۲۶۔ مشترک حرفے چند ۲۹۷

مشفق خواجہ

مقدمہ

"حرفِ چند" کے زیرِ نظر دوسرے حصے کے بارے میں لکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اگر ایک ہوش مند قاری اردو ادب کے گزشتہ تیس برسوں کے ادبی و علمی رجحانات کا اندازہ کرنا چاہے تو اُس کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ کیوں کہ یہاں وہ سارے رجحان، تقاضے، مسئلے، علمی و تحقیقی دید و دریافت اور زبان و ادب کے جائزے موجود ہیں جن سے ہمارے عہد کا ادب عبارت ہے۔

انجمن ترقی اردو اپنی مطبوعات کے سلسلے میں بڑی حد تک محتاط اور کسی قدر روایت پسند بلکہ یوں کہیے کہ قدامت پسند ہے۔ ہر شائع ہونے والی کتاب کو اوّل سے آخر تک پوری احتیاط سے دیکھا جاتا ہے اور جب اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس کی اشاعت سے متعلقہ موضوع کے حوالے سے پڑھنے والوں کے علم اور معلومات میں اضافہ ہوگا، اور یہ کتاب بڑے پیمانے پر نہ سہی، ایک محدود حلقے ہی میں پسند کی جائے گی تو پھر اُسے پریس کے حوالے کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن کی کتابیں شائع ہو کر طاقِ نسیاں کی زینت نہیں بنتیں، کم فروخت ہوتی ہیں، لیکن خریداروں کی چشمِ عنایت سے محروم نہیں رہتیں۔ اس صورتِ حال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انجمن کی مطبوعات اہم اور وقیع ہوتی ہیں۔ اسی مناسبت سے ان کتابوں پر لکھے گئے "حرفے چند" بھی اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ عالی صاحب نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ ہر کتاب کے دیباچے میں اُس کے تمام پہلوؤں کا دل جمعی اور تاریخی دیانت کے ساتھ جائزہ لیا جائے تاکہ پڑھنے والے کی رہنمائی بھی ہو اور کتاب روایتی قسم کے دیباچے سے گراں بار بھی نہ ہو۔ عالی صاحب چونکہ بذاتِ خود ادب کی تمام تحریکوں کے محض

ناظر یا تماشائی نہیں بلکہ اُن میں سر تا سر ڈوبے ہوئے ہیں، اس وجہ سے وہ جو کچھ لکھتے ہیں، محرم راز بن کر لکھتے ہیں۔ کتاب کا سرسری تعارف نہیں لکھتے، شرح و تفصیل کا حق ادا کرتے ہیں۔

یوں تو اس مجموعے کے سارے مضامین قابلِ قدر اور قابلِ ذکر ہیں، لیکن اس مختصر تحریر میں اُن سب کے بارے میں کچھ عرض کرنا، ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا میں چند اہم تر مضامین کا جو ذیل کی کتابوں پر لکھے گئے ہیں:

فرہنگ اصطلاحاتِ بینکاری

اردو۔ قومی یک جہتی اور پاکستان

البیرونی

مضامین غلام ربانی

خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

"فرہنگ اصطلاحاتِ بینکاری" کی ترتیب و اشاعت انجمن کا ایک بہت بڑا علمی کام ہے۔ اس میں بینکاری کی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ متعلقہ شعبوں، صنعت اور تجارت کی اصطلاحوں کا بڑا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے اور اصطلاحوں کے تراجم میں اس بات کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے کہ ان کے استعمال میں عام لوگوں کو کوئی دقت نہ ہو۔ اس طرح یہ کتاب بینکاری اور اس کے متعلقہ شعبوں سے منسلک افراد کے لیے ناگزیر کتابِ حوالہ بننے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ عالی صاحب نے اس کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر "حرفے چند" بڑے اہتمام اور تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ حرفے چند اپنی عمیق معنویت، فکر انگیزی اور بعض رازہائے درونِ پردہ کے انکشاف کی وجہ سے ایک یادگار تحریر بن گیا ہے۔ عالی صاحب نے اپنی ذاتی معلومات کی روشنی میں اردو بنگلہ آویزش کی روداد بڑے واشگاف انداز سے بیان کی ہے۔ اس آویزش کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ مگر عالی صاحب نے بہت سے ایسے پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے جن سے عام پاکستانی قارئین کی اکثریت ناواقف ہے۔ یہ ایک ایسے آدمی کا بیان ہے جس نے ان واقعات کو صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ وہ پوری قوت اور شدت کے ساتھ ان میں اُلجھا بھی رہا ہے۔ پھر اردو، انگریزی کا مسئلہ ہے جسے پاکستانی نوکرشاہی نے بہت زیادہ اُلجھا دیا ہے۔ عالی

صاحب نے اردو انگریزی تنازعے اور انگریزی کی بالادستی برقرار رکھنے کی مہم میں نوکر شاہی کے کردار کو پوری تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بعض دوسرے دانشوروں کی طرح عالی صاحب بھی اُس مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں جو نوکر شاہی کو وطنِ عزیز میں گوناگوں مسائل پیدا کر کے قومی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ عالی صاحب کے اخباری کالموں میں اکثر و بیشتر ان عمالِ حکومت کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کا تذکرہ ہی نہیں مذمت بھی ملتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قومی زبان کے نفاذ میں تاخیری حربوں کا استعمال اسی طبقے کا "کارنامہ" ہے۔ صرف اپنے مفاد کو محفوظ رکھنے کی غرض سے اس طبقے نے عوامی فلاح اور اجتماعی مفاد کو قربان کر دیا ہے۔ قومی زبان کے نفاذ میں تاخیر نے احساسِ محرومی کی ایک ایسی لہر پیدا کی ہے جس نے پوری قوم پر بددلی اور افسردگی طاری کر رکھی ہے۔ عالی صاحب نے اس صورت حال کی بڑی جرأت سے اور بہت برمحل نشان دہی کی ہے۔

عالی صاحب نے اس حوالے سے اُن اداروں کی کارکردگی کا جائزہ بھی پیش کیا ہے جو حکومت کے ایما پر قومی زبان کے نفاذ کے لیے قائم ہوئے۔ ان میں سب سے اہم مقتدرہ قومی زبان ہے۔ عالی صاحب نے بڑے خلوص اور دردمندی سے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ یہ ادارہ بھی اپنے فرضِ منصبی یعنی قومی زبان کے نفاذ میں تمام تر ناکام رہا ہے کیوں کہ اسے نفاذ کے سلسلے میں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ حکومت کی نگاہ میں اس ادارے کی کوئی اہمیت ہے نہ اس کے کام کو وقیع خیال کیا جاتا ہے حالانکہ نفاذِ اردو کے سلسلے میں بہت ابتدائی اور بنیادی کام مقتدرہ کے ذریعے انجام پا چکا ہے اور اگر قومی زبان کے فوری نفاذ کا کوئی فیصلہ کیا جائے تو مقتدرہ کا یہ سارا کام اس سلسلے میں بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے، لیکن ایسے کام کا کیا فائدہ جب نفاذِ اردو کی منزل دُور سے دُور تر ہوتی جا رہی ہے۔ عالی صاحب نے یہ داستان جس انداز سے بیان کی ہے اُس سے اُن کے کرب و سوزِ دل کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

"اردو، قومی یک جہتی اور پاکستان" (از ڈاکٹر فرمان فتح پوری) کا حرفے چند اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں بھی عالی صاحب نے بڑی تفصیل سے پاکستان

میں اردو اور اردو کے نفاذ کے مسئلے کا جائزہ لیا ہے۔ یہ ایک ہمہ جہتی معروضی جائزہ ہے جسے ہر اُس شخص کو ضرور پڑھنا چاہیے جسے اردو زبان سے دلچسپی ہے۔ میرے نزدیک یہ محض ایک علمی و تحقیقی یا نظریاتی قسم کی بحث نہیں ہے بلکہ ایک ایسی قوم کی اپنے مقصد اور مرکز سے منحرف ہو جانے، بھٹک جانے اور بے حس ہو جانے کی الم ناک روداد ہے جس نے بڑی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد اپنی منزل حاصل کی تھی۔ اردو زبان کے تحفظ، فروغ اور سلامتی کو تحریک پاکستان کے منشور میں نمایاں حیثیت حاصل تھی لیکن قیام پاکستان کے بعد تحریکی منشور کے تمام مقاصد کو جس بے دردی اور شقاوت سے نظر انداز کیا گیا ہے وہ قومی تاریخ کا ایک دل دوز المیہ ہے۔ قومیں اپنے ثقافتی سرمائے پر فخر کرتی ہیں، اسے تحفظ دینے اور محفوظ رکھنے میں بہترین کوششوں اور صلاحیتوں سے کام لیتی ہیں، لسانی اور ثقافتی اقدار سے وابستگی قومی یک جہتی کے استحکام کا وسیلہ بنتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں ہر دور میں ایک ایسا طبقہ برسرِ اقتدار رہا جس نے اپنی ثقافتی میراث سے لاتعلقی کا اظہار بھی کیا اور ثقافت کے نام پر ذہنی انتشار اور سماجی بے راہ روی کو فروغ دیا اور قومی زبان جو یک جہتی کا موثر ترین ذریعہ ہے، سیاسی سازشوں کا شکار ہو کر اپنے جائز حق سے محروم ہوئی اور اُس انگریزی کو برتری حاصل ہوئی جس نے برصغیر میں غلامی کی روایت کو مستحکم کیا تھا۔ عالی صاحب نے یہ حرفے چند بڑی دل سوزی سے لکھا ہے اور ہمیں اس آئینے میں اپنے اصلی خدوخال نظر آتے ہیں۔

عالی صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ قدرت نے انھیں ایک شاعر کا دل اور دماغ عطا کیا ہے مگر وہ نثر بھی بہت اچھی لکھتے ہیں۔ شاعرانہ نہیں، ایسی نثر جو ترسیل اور ابلاغ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ ہر چند کہ انھوں نے اپنے آپ کو اخباری کالموں اور سفرناموں تک محدود کر لیا ہے، تاہم اُن کے مزاج میں کسی حد تک تحقیق کا عنصر بھی موجود ہے۔ اس تحقیقی عنصر کا بھرپور اظہار کتاب "البیرونی" کے حرفے چند میں ہوا ہے۔ اگرچہ انھوں نے ازراہ انکسار یہ معذرت کی ہے: "راقم الحروف تحقیق اور تنقید کا آدمی نہیں ہے۔ یہ بڑے مناصب ہیں۔" لیکن اس معذرت کے باوجود پچاس صفحات پر محیط یہ حرفے چند البیرونی کے بارے میں خاصی معلوماتی دستاویز ہے۔ سید حسن برنی مرحوم کی اس تالیف کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت

کے بعد البیرونی کے بارے میں جو کام ہوئے اور جو تحقیق ہوئی، البیرونی کانگریس میں جو مقالے پڑھے گئے، ان سب کی تفصیل اس حرفے چند میں ملتی ہے۔ عالی صاحب کی یہ تحریر ایک طرح سے سید حسن برنی کی تالیف کا تکملہ ہے۔ انھوں نے البیرونی کے بارے میں لکھی گئی تقریباً تمام تحریروں کے مطالعے کے بعد یہ حرفے چند لکھا ہے جو اُن کی محنت اور موضوع سے لگن کی بہترین مثال ہے۔

"مضامین غلام ربانی" کا حرفے چند بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ ذاتی تحقیق سے لبریز لیکن ہلکا پھلکا اور عالی صاحب کے مخصوص طرزِ نگارش اور نقطۂ نظر کا ترجمان۔ ایک دلّی والے نے دوسرے دلّی والے کی ثناخوانی نہیں کی بلکہ ایک صاحبِ نظر نے ایک صاحبِ کمال کے فن، قوتِ تحریر، ژرف نگاہی اور علمی لگن کی منصفانہ داد دی ہے۔

میں نے مختصر طور پر اس کتاب میں شامل چند مضامین کا تذکرہ کیا ہے لیکن مجھے احساس ہے کہ اس مجموعے میں شامل تمام مضامین بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ یہ ایک ایسے ادیب کے قلم سے نکلے ہیں جس نے گزشتہ نصف صدی کی تمام علمی، ادبی، سیاسی اور ثقافتی تحریکوں کو وجود میں آتے اور فروغ پاتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ ان میں سے اکثر سے ذاتی طور پر وابستہ رہا ہے۔ اُس کا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ اُسے اپنے ثقافتی ورثے، اپنے تہذیبی سرمائے اور اپنی قومی روایات سے عشق ہے۔

ہمارے ہاں یہ رسم عام ہو گئی ہے کہ کسی کتاب کا مقدمہ لکھنے بیٹھے تو زمین آسمان ایک کر دیے، وہ تمام محاسن بیان کر دیے جو خود صاحبِ کتاب کے ذہن میں بھی نہیں تھے۔ قدیم زمانے کی تقریظوں اور آج کے عہد کے دیباچوں میں بعد مکانی کے سوا اور کوئی بڑا فرق نہیں ہے مگر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس روایت کو توڑا اور مقدمہ نگاری کی ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی جو دیانت اور حق وانصاف پر مبنی تھی۔ عالی صاحب اسی روایت کے امین ہیں۔

۲ جون ۱۹۹۳ء

مشفق خواجہ

مقدمہ

تحریکیں ہوں یا ادارے، ان کی روح ہمیشہ کوئی ایسی شخصیت ہوتی ہے جو ان تحریکوں یا اداروں کے مقاصد کو خود اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتی ہے۔ رسمی طور پر کسی عہدے پر فائز رہنا اور بات ہے، کسی ادارے کے لیے اپنی تمام قوتیں اور توانائیاں وقف کر دینا دوسری بات ہے۔ یہی دوسری بات کسی ادارے اور فرد میں روح و تن کا تعلق پیدا کرتی ہے اور من و تو کا فرق مٹا دیتی ہے۔ ہمارے سامنے بے شمار مثالیں ایسی ہیں کہ کسی مرکزی شخصیت کے انتقال کے بعد کسی ادارے کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ یا تو وہ ادارہ ختم ہو گیا یا پھر وہ رسمی طور پر "زندہ" رہ کر اپنے مقاصد سے بے تعلق ہو گیا۔ مولوی عبدالحق کی وفات کے بعد انجمن ترقی اردو کے بارے میں بھی بہت سوں نے سوچا تھا کہ

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

کے مصداق یہ ادارہ بھی بہت جلد اپنی زندگی کے دن پورے کرے گا۔ ایسا سوچنا ناگزیر تھا، اس لیے کہ انجمن ترقی اردو دراصل مولوی عبدالحق کا ہی دوسرا نام تھا۔ ان کے بغیر انجمن کا تصور کرنا ایسا ہی تھا جیسے روح کے بغیر کسی جسم کا۔ مولوی عبدالحق نے اپنی زندگی کے پچاس سال اس ادارے کی نذر کیے اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک ذیلی شعبے کو جس کی حیثیت صرف کاغذی تھی، برصغیر کا سب سے بڑا علمی و ادبی ادارہ بنا دیا۔ کسی زبان سے محبت کی ایسی کوئی دوسری مثال شاید ہی مل سکے۔

خوش قسمتی سے مجھے مولوی عبدالحق کے ساتھ ان کی زندگی کے آخری چند برسوں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس ساری مدت میں میں نے انھیں انجمن کے

مستقبل کے لیے پریشان دیکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولوی صاحب کی انجمن کو ان سے چھین لیا گیا تھا۔ اس کی تفصیل خود مولوی صاحب کے قلم سے "انجمن ترقی اردو کا المیہ" کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اس لیے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صدر مملکت محمد ایوب خان کے ایک مارشل لا آرڈر کے ذریعے انجمن پر قابض گروہ کو الگ کیا گیا اور مولوی صاحب کی سربراہی میں نئی انتظامیہ نے انجمن کے معاملات ہاتھ میں لیے۔ مولوی صاحب اب بھی خوش نہیں تھے۔ پہلے انجمن مفاد پرستوں کے قبضے میں تھی تو اب کراچی کی انتظامیہ کے دفتری اہلکاروں کے قبضے میں۔ اس سے پہلے کہ یہ صورت حال مولوی صاحب کی مرضی کے مطابق تبدیل ہوتی، وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولوی صاحب کے بعد انجمن کلی طور پر کراچی کی انتظامیہ کا ایک غیر فعال شعبہ بن کر رہ گئی۔ انجمن کی مجلس انتظامی میں کچھ اہل علم و ادب ضرور شامل تھے لیکن انھیں انجمن کے روز مرہ معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک سال تک انجمن جسد بے جان کی حیثیت سے موجود رہی اور اس کا مستقبل تاریک سے تاریک تر نظر آنے لگا۔

۱۹۶۲ء میں حالات نے نئی کروٹ لی اور ایک سرکاری حکم کے تحت انجمن کی نئی انتظامیہ وجود میں آئی۔ اس نئی انتظامیہ کے صدر اختر حسین تھے اور معتمد اعزازی جمیل الدین عالی۔ میں انجمن کا ایک ادنیٰ کارکن ہونے کی حیثیت سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھا کہ دونوں کلیدی عہدوں پر ایسے اشخاص فائز ہوئے جنھیں میرے خیال میں، انجمن کے مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک بیوروکریٹ اور دوسرا شاعر۔ مولوی عبدالحق اس قسم کے لوگوں سے بہت گھبراتے تھے ان کے آخری دنوں میں دو ریٹائرڈ اعلیٰ افسروں کو جو شاعر بھی تھے، یکے بعد دیگرے انجمن کا معتمد بنانے کی کوشش کی گئی تو انھوں نے فرمایا: "پھر تو انجمن کا نام تبدیل کر کے "بیت الغزل" رکھنا پڑے گا کیوں کہ مشاعرہ گاہ کے لیے نام موزوں ہے۔

چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا کہ اختر حسین مرحوم صرف بیوروکریٹ نہیں تھے، اور عالی صاحب صرف شاعر نہیں ہیں۔ اور اب پچیس سال بعد جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ نظر آتا ہے کہ ان لوگوں نے انجمن ہی کو نہیں بابائے اردو کو بھی زندہ رکھا۔ اختر حسین مرحوم کا نام اور عالی صاحب کا کام انجمن کی حیات نو کا ضامن بن گیا۔

گزشتہ پچیس برسوں میں انجمن ترقی اردو کو زندہ فعال رکھنے اور اس کے اردو کالج کو ایک عظیم الشان تعلیمی ادارہ بنانے کے لیے عالی صاحب نے جس طرح تگ و دو کی ہے، وہ ایک الگ داستان ہے۔ میں یہاں صرف اتنا عرض کروں گا کہ علمی و ادبی کاموں کی وہ روایت جسے مولوی عبدالحق نے فروغ کیا تھا اور جو انجمن کا اصل کام ہے، اسے عالی صاحب نے نہ صرف جاری رکھا بلکہ بعض حیثیتوں سے آگے بھی بڑھایا۔ اسی کا ایک ثبوت زیر نظر کتاب ہے۔ یہ ان دیباچوں کا مجموعہ ہے جو عالی صاحب نے انجمن کی شائع کردہ کتابوں پر لکھے۔ اس مجموعے سے یہ اندازہ نہیں کرنا چاہیے کہ اس عرصے میں انجمن نے صرف اتنی ہی کتابیں شائع کیں کیوں کہ کئی کتابوں پر عالی صاحب نے کسی نہ کسی وجہ سے دیباچے نہیں لکھے اور کئی دیباچے ایسے ہیں جو بوجوہ اس مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بعض کتابیں تاریخ ساز، بعض تاریخی اور بعض تاریخ کے کسی لمحے کے تقاضوں اور رجحانات کی تفہیم میں معاون ہوتی ہیں۔ عالی صاحب کی زیر نظر کتاب آخرالذکر شق سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ گزشتہ پچیس برسوں کے علمی، ادبی اور تحقیقی رجحانات اور برصغیر میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے سب سے اہم اور قابل ذکر ادارے کی علمی کاوشوں کا آئینہ ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کو اردو کا سب سے بڑا "مقدمہ باز" کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی ایسی غلط بات نہیں۔ مولوی صاحب نے کتابوں پر سیر حاصل، پُرمغز اور محققانہ مقدمے لکھنے کی جس روایت کا آغاز کیا تھا، اس کے سب سے بڑے عامل بھی وہ خود ہی تھے۔ مولوی صاحب کے بعض مقدمے اردو ادب میں یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔ "حیات النذیر" اور "معرکۂ مذہب و سائنس" کے مقدمے ایسے ہیں کہ ان سے خود ان کتابوں کی اہمیت بڑھ گئی جن پر یہ لکھے گئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے صدر اور بعد ازاں معتمد اعزازی کی حیثیت سے مولوی صاحب نے انجمن کی مطبوعات پر مقدمے لکھے۔ ان مطبوعات میں شعرا کے تذکرے، انتخابات، تحقیقی مقالے، قدیم متون، جدید ادب سبھی کچھ شامل ہے۔ مولوی صاحب نے کسی کتاب پر سرسری مقدمہ نہیں لکھا۔ انھوں نے کتاب کے جملہ پہلوؤں کا تاریخی اور تنقیدی تجزیہ کرتے

ہوئے موضوع کتاب کے بارے میں خود اپنے خیالات کو بھی قلم بند کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن کی کتابوں پر مولوی صاحب کے مقدمے ہر اعتبار سے دیانت دارانہ علمی جائزے ہیں جن میں ایک مرد جہاں دیدہ کی ساری زندگی کے علمی تجربوں اور مشاہدوں کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے۔ مولوی صاحب نے ایک طویل عمر پائی، انھوں نے برصغیر میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کو پروان چڑھتے اور کامیابی سے ہم کنار ہوتے بچشم خود ملاحظہ کیا۔ سر سید احمد خاں کی چار نسلیں دیکھیں۔ دادا اور پوتے (سر سید اور سر راس مسعود) دونوں کے ساتھ کام کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس وجہ سے مولوی صاحب کی نظر میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوئی تھی اور وہ خود تاریخ بن گئے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنی تحریروں میں اس خصوصیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور انجمن کی تمام مطبوعات جو ان کے عہد میں اشاعت پذیر ہوئیں اپنے مقدموں سے بہت وقیع بنا دیا۔

جمیل الدّین عالی انجمن ترقی اردو میں مولوی صاحب کے جانشین اور ان کی قائم کردہ علمی و ادبی روایات کے امین ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصّہ پاکستانی ادیبوں کی تنظیم اور فلاح میں صرف ہوا ہے۔ انھوں نے پاکستان میں ادب کی تاریخ کو بنتے ہوئے دیکھا ہے اور تاریخ کو بنانے میں نمایاں اور مثبت کردار ادا کیا ہے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ وہ خود پاکستانی ادب کی تاریخ کا ایک حصّہ ہیں۔ پاکستانی ادب کے رجحانات و میلانات پر ان کی دسترس محرمانہ ہے کیوں کہ ان رجحانات اور میلانات کو بروئے کار لانے میں وہ خود بھی شریک رہے ہیں۔ اگرچہ عالی صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں اور اس وجہ سے ان کے طرزِ احساس میں شاعرانہ لطافت و نزاکت کو زیادہ دخل ہے لیکن انھوں نے ہر لکھے جانے والے لفظ کی عظمت و اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا اور اسے تحفظ فراہم کرنے میں پوری کوشش کی ہے۔

ادب، ادبی تحریکوں اور ادیبوں سے عالی صاحب کے ذاتی تعلق کی دو سطحیں ہیں۔ پہلی سطح تخلیقی ہے جو سفر نگاری، کالم نویسی اور دیگر تحریروں کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ انھوں نے پاکستانی ملّت کو متعدد ایسے نغمے عطا کیے ہیں جو ہمارے قومی شعور کی علامت بن گئے ہیں۔ ان کی غزل قدیم و جدید کے خوبصورت امتزاج کا ایک ایسا مرقع ہے جو اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ جدید عہد میں دوہے لکھنے

کی روایت انھیں کی رہون منت ہے، اور حق تو یہ ہے کہ اس صنف کا حق صرف وہی ادا کر پائے ہیں۔ اگرچہ ان کی تقلید میں بہت سوں نے اس ذریعۂ اظہار کو اپنایا ہے لیکن دوہا صرف اور صرف عالی ہی سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔

نثر نگار کی حیثیت سے عالی صاحب جن مختلف جہتوں میں نظر آتے ہیں، وہاں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت کے نقوش ثبت کیے ہیں۔ انھوں نے کئی اچھے شخصی خاکے لکھے ہیں جن میں نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی کا خاکہ یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بدلتی ہوئی قدروں کی سفاکی اور قدیم معاشرتی وضع داری کا ایک ایسا اشاریہ ہے جو بڑے خلوص اور ہمدردی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ عالی صاحب ایک جہاں دیدہ سیاح بھی ہیں۔ انھوں نے اردو میں سفرنامے کی روایت کو از سر نو زندہ کیا ہے۔ انھوں نے سفرنامے کو سفرنامہ ہی رہنے دیا ہے، افسانہ و افسوں نہیں بنایا۔ اسے ایک معنی خیز اور فکر انگیز صنف ادب بنا دیا ہے۔

عالی صاحب پاکستان کے ان چند کالم نویسوں میں سے ہیں، جنھوں نے ربع صدی سے زیادہ عرصہ سے اس دشت کی سیاحی اختیار کر رکھی ہے۔ اخباری کالم جیسی وقتی اور ہنگامی چیز کو انھوں نے دوامی اور مستقل حیثیت دے دی ہے۔ عالی صاحب کے کالم کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کتابوں کی ایک اپنی مستقل اہمیت ہے۔ ان کی کالم نویسی کی ایک نمایاں خصوصیت غیر معمولی وطن دوستی اور اپنے وطن کے افتخار کو نمایاں کرنا ہے۔ عالی صاحب کی وطن دوستی جزو ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ اس خصوصیت نے ان کی کالم نویسی کو بے شمار نئے افق عطا کیے ہیں۔ پاکستان کے پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں، معدنی دولت، زرعی پیداوار، تہذیب و ثقافت، رسوم و رواج اور طرز معاشرت معاشی حالات وغیرہ کے بارے میں انھوں نے جس دل سوزی کے ساتھ لکھا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ کبھی وہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں پر سجدۂ شکر ادا کرتے ہیں، اور کبھی ان نعمتوں سے فائدہ نہ اٹھانے پر اظہار افسوس۔ غلط اور نقصان دہ رسوم و رواج کے خلاف انھوں نے جس دردمندی اور خلوص کے ساتھ لکھا ہے اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

عالی صاحب کی کالم نویسی کا دوسرا اہم موضوع فروغ دانش ہے۔ آج ساری دنیا میں علم کے فروغ کا غلغلہ ہے۔ خود ہمارے ہاں بھی اس کا چرچا کم نہیں ہے۔

کتابیں چھپتی ہیں، دانش گاہوں میں رونق رہتی ہے، علمی ادارے سرگرم عمل رہتے ہیں، ان سب کے باوجود یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ہم نے اپنی قومی دانش میں کچھ اضافہ کیا ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب ایک افسوس ناک نفی کے سوا کچھ اور نہیں۔ خواندگی کی شرح میں معمولی اضافہ، کچھ نئی کتابوں کی اشاعت، کچھ علم و فضل کی گفتگو فروغ دانش نہیں ہے۔ علم و دانش کو جس انداز سے قومی مزاج میں سرایت کرنا چاہیے، قومی کردار کی تشکیل میں حصہ لینا چاہیے، اس کا ہمارے یہاں دُور دُور تک کوئی تصور نہیں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نئی نسل نے علم و دانش کو اپنا شعار بنانے کی بجائے جارحیت، عصبیت اور درشتی کو اختیار کیا ہے۔ عالی صاحب کو اس خطرناک صورت حال کا پورا احساس ہے، اسی لیے ان کی کالم نویسی کا ایک مقصد اس صورت حال کے خلاف ایک مؤثر احتجاج ہے۔

وہ تعداد و شمار کے حوالوں سے، دوسری قوموں کی ترقی کے تذکرے سے، از منۂ قدیم کی تاریخ کے تصورات سے ہمیشہ یہ تاثر عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قوموں کی ترقی کی بنیاد حصول دانش پر ہے، دانش کے فریب میں مبتلا ہونا نہیں جو ہمارا شعار اور مزاج بنتا جارہا ہے، بلکہ دانش کی اصل روح کو اپنانا جو روزمرہ زندگی کی ترجیحات میں تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔ عالی صاحب نے اس سلسلے میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے اور عمل پیرا ہونے سے ہم اپنے بہت سے قومی مسائل کو حل کرسکتے ہیں۔

عالی صاحب کی کالم نگاری کی سب سے بڑی خوبی جرأت اظہار ہے۔ آج کے دور مصلحت کوش میں بیشتر لکھنے والے آزادانہ اظہار خیال سے گریز کرتے ہیں۔ ملکی مسائل ہوں یا معاشرتی اور ثقافتی معاملات، علمی دید و دریافت ہو یا ادبی تنقید، کھری باتیں کم سننے میں آتی ہیں۔ اظہار خیال تحفظات کی چھاؤں میں ہوتا ہے۔ یہ صورت حال ایک بڑے خطرے کی نشاندہی کرتی ہے۔ عالی صاحب اس صورت حال کے خلاف مسلسل جہاد کررہے ہیں۔ انھیں کھری بات برملا کہنے میں طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ لگی لپٹی رکھنا، اعتذار کا انداز اختیار کرنا ان کا شیوہ نہیں۔ وہ شمشیر برہنہ ہیں جس کی کاٹ اپنے پرائے کا لحاظ نہیں کرتی اسی وجہ سے ان کا یہ حال ہے کہ:

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش

بہر حال کوئی نہ کوئی تو سچ بولنے والا ہونا چاہیے۔ بقول حافظ:

گفت آں یار کرد گشت سرِ دار بلند
جرمش آں بود کہ اسرار ہویدا می کرد

مجھے فارسی کا یہ شعر شاید اس لیے یاد آیا کہ عالی صاحب اپنے کالموں میں اکثر برمحل فارسی شعر درج کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ہماری نثر کا ایک وصف ہے جو بڑی تیزی سے معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ عالی صاحب کی وجہ سے یہ روایت زندہ ہے، اگرچہ اب انھیں فارسی شعر کے نیچے اس کا مطلب اردو میں لکھنا پڑتا ہے۔

میں نے یہ ساری تفصیل اس لیے بیان کی ہے کہ عالی صاحب کی ادبی شخصیت کے خدوخال نمایاں ہو سکیں وہ اپنے عہد کی ایک ممتاز اور قدآور ادبی شخصیت ہیں۔ نظم اور نثر دونوں میں ان کا سکّہ چلتا ہے مگر یہ ان کی ادبی شخصیت کا صرف ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ ان کی وہ سعی مسلسل ہے جو انھوں نے پاکستان میں ادب کے فروغ اور ادیبوں کی تنظیم کے سلسلے میں انجام دی ہے۔ عالی صاحب پاکستان رائٹرز گلڈ کے بانیوں میں سے ہیں۔ اس ادارے کے قیام اور پھر اسے پاکستانی ادیبوں کی معتبر، مستند اور نمائندہ تنظیم بنانے میں انھوں نے جو کوششیں کی ہیں، انھیں پاکستان کی ثقافتی تاریخ میں ہمیشہ اہمیت حاصل رہے گی۔ ملک کے ہر خطّے سے تعلق رکھنے والے مختلف الخیال ادیبوں کو ایک مرکز پر جمع کرنا اور انھیں ایک مشترک طرزِ احساس سے روشناس کرانا کوئی معمولی کام نہیں۔ گلڈ کے تعلق سے عالی صاحب کو پاکستانی ادب کے تمام رجحانات سے گہری واقفیت حاصل ہوئی جو عام حالات میں ممکن نہ تھی۔ اس واقفیت نے ان کی تحریروں کو ہمہ رنگ اور ہمہ جہت بنا دیا۔

پاکستان رائٹرز گلڈ نے قومی یک جہتی کے نظریے کو تقویت پہنچائی۔ قومی یک جہتی کا تصور عالی صاحب کی تحریروں میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ وہ اس کے بہت بڑے مبلغ ہیں۔ مبلغ تو ہم سب ہیں مگر ہماری تبلیغ زبانی جمع خرچ تک محدود ہے۔ عالی صاحب نے اسے مقصدِ حیات اور طریقِ زندگی بنا لیا ہے۔ وہ ہر جگہ، ہر موقعے پر حوالے سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور چوں کہ یہ تذکرہ خلوص، ہمدردی اور محبت سے ہوتا ہے، اس لیے اس کا خاطر خواہ اثر بھی ہوتا ہے۔ ادیبوں کی تنظیم نے عالی صاحب کو حوصلہ، ہمت، مستقل مزاجی اور ناگوار کو گوارا بنانے کے اوصاف عطا کیے۔

ان کی ادبی شخصیت نے اس تنظیمی کاوش سے جلا پاکر بڑا دلکش انداز اختیار کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے تعلق سے یہ ادبی شخصیت کچھ اور نکھر گئی۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، عالی صاحب گزشتہ پچیس برسوں سے انجمن کے معتمد اعزازی ہیں۔ انھوں نے یہ خدمت بڑی ذمہ داری، انہماک اور توجہ سے انجام دی ہے۔ انجمن اس وقت برصغیر کا قدیم ترین غیر سرکاری ادارہ ہے جو تسلسل اور تواتر سے فروغ اردو کا کام کیے جا رہا ہے۔ انجمن کو تاریخ ساز اور عہد ساز ادارہ ہونے کا افتخار حاصل ہے۔ بڑے بڑے نام اس سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ بڑے بڑے کام ظہور میں آ چکے ہیں۔ بابائے اردو نے کام کو عبادت بنانے اور سمجھنے کی جس روش کی داغ بیل ڈالی تھی اس سے اردو زبان و ادب کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ عالی صاحب اسی روایت کے امین ہیں۔ انجمن سے وابستگی نے انھیں ادب کے نئے نئے رجحانات، تحقیق کے نئے نئے گوشوں، اہل علم کے افکار و نظریات، فروغ ادب کے نئے امکانات، سب کا مزاج شناس بنا دیا ہے۔ انھیں اردو ادب ہی نہیں، تمام پاکستانی زبانوں کے ادب اور دنیا کی متعدد اہم زبانوں میں لکھی جانے والی قابل ذکر تحریروں کی معرفت حاصل ہے۔ یہ ایسا امتیاز و اختصاص ہے جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ عالی صاحب اس اعتبار سے ہمارے عہد کی بڑی اہم شخصیت ہیں کہ انھیں ایک ایسے بزرگ علمی و ادبی ادارے کی معتمدی حاصل ہے جس سے ادبی اعتماد کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔

انجمن سے وابستگی کی بنا پر عالی صاحب نے اپنے دور معتمدی میں مطبوعات انجمن پر دیباچے لکھنے کی روایت کو پوری طرح برقرار رکھا۔ "حرفے چند" انھیں دیباچوں کا مجموعہ ہے۔ اگر کوئی شخص گزشتہ پچیس برس کے علمی، ادبی اور ادب کی ربع صدی کا مطالعہ کرنا چاہے تو اس کے لیے "حرفے چند" ایک بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان دیباچوں میں اردو ادبی تنقید، مخطوطات کی توضیحی فہرستیں، حوالے کی کتابیں، دکنیات، قدیم متون، لغات، فلسفیانہ افکار و مسائل، ثقافتی دید و دریافت، علاقائی ادب، سب کچھ شامل ہے۔ "حرفے چند" کے مشمولات انھیں مباحث کے حوالے سے قلم بند ہوئے ہیں اور ان تمام موضوعات کی وضاحت کرتے

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ دیباچہ نگار کسی تصنیف یا تالیف کے بارے میں مختصر طور پر اظہار خیال کر کے دیباچہ نگاری اور تعلقات کا حق ادا کر دیتا ہے مولوی عبدالحق اس روش کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے دیباچہ نگاری کو بھی ایک فن کی حیثیت دے دی تھی۔ اردو دیباچے لکھنے میں وہ اتنی ہی محنت کرتے تھے جتنی علمی و تحقیقی مقالوں پر۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دیباچے یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔ عالی صاحب نے اس سلسلے میں مولوی صاحب کی پیروی کی ہے لیکن یہ پیروی تخلیقی انداز کی ہے۔ وہ ہر متعلقہ کتاب کا معروضی انداز میں تجزیہ کرتے ہیں اور اپنے خیالات و افکار کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتے ہیں عالی صاحب زندگی اور ادب دونوں کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتے ہیں، یہ نقطۂ نظر ان کی عام تحریروں کی طرح، ان کے دیباچوں میں بھی پوری طرح کارفرما نظر آتا ہے۔

عالی صاحب کا مخصوص نقطۂ نظر کیا ہے؟ ان کی شاعری، سفرنگاری اور کالم نویسی کے حوالے سے اس کی مختصر توضیح اوپر کی سطروں میں پیش کی جاچکی ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ عالی صاحب قدیم وجدید کا وہ سنگم ہیں جہاں سے ادب اور زندگی دونوں کی معنویت اور ہمہ گیری کا ایک نیا احساس ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کسی قدیم متن کی بازیافت پر وہ اس طرح خوش ہوتے ہیں جیسے کوئی تخلیق کار اپنی نئی تخلیق پر۔ یہاں مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کا "حرفے چند" بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس دیباچے میں عالی صاحب کا تحقیقی اور تخلیقی مزاج پوری طرح نمایاں ہے۔ انھوں نے اس مثنوی پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بہت سے نئے پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ کام کرنے والے تو بے شمار ہوتے ہیں لیکن راستہ دکھانے والے اور منزلوں کی نشاندہی کرنے والے کم ہوتے ہیں۔ عالی صاحب کی دیباچہ نگاری میں راہ دکھانے کی کیفیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کتاب "پاکستان میں اردو تحقیق" کا دیباچہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ ابن انشاء سے متعلق کتاب کا دیباچہ اصل پر اضافے کا درجہ رکھتا ہے کیوں کہ عالی صاحب نے اس میں ابن انشاء کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں بتائی ہیں جو اصل کتاب میں نہیں ملتیں۔ "افکار عالیہ" کے دیباچے میں عالی صاحب نے بتایا ہے کہ اس کتاب میں اہل مغرب کے جن خیالات کو پیش کیا گیا ہے، ان میں سے بہت سے خیالات اہل مشرق کی نظر میں پہلے

ے موجود ہیں۔ لیکن مرتبین نے مغرب کی برتری جتانے کے لیے مشرق کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ "مفکرین اسلام" کا حرفے چند اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں عالی صاحب نے نہایت ادب کے ساتھ کتاب کی کوتاہیوں کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں۔ اس طرح کی اور بھی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عالی صاحب رسمی دیباچہ نگار نہیں ہیں، وہ جس کتاب پر دیباچہ لکھتے ہیں، اس کے مطالب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

سو سے زائد کتابوں پر دیباچے لکھنا بذات خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور دیباچے بھی وہ جو برسنائے تعلقات یا سطحی اور سرسری انداز میں نہیں لکھے گئے بلکہ ہر دیباچہ ایک علمی شان رکھتا ہے۔ عالی صاحب کا حب وطن، فروغ علم و دانش کا جذبہ، اردو زبان و ادب کو ترقی دینے کی آرزو، عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مختلف علوم و فنون سے استفادہ کرنے کی خواہش، قومی یک جہتی کی نشوونما کے لیے سعی و کاوش ... "حرفے چند" میں یہ سب کچھ موجود ہے۔

عالی صاحب ہمارے دور کے سب سے بڑے اور قابلِ ذکر دیباچہ نگار ہیں۔ مولوی عبدالحق کے بعد علمی دیباچہ نگاری کی روایت انھیں کی وجہ سے تابندہ ہوئی ہے۔ زیر نظر مجموعہ عالی صاحب کی علمی و ادبی شخصیت کا ایسا موثر اظہار ہے جس کے بارے میں اب تک سنجیدگی سے غور نہیں ہوا۔ اس مجموعہ کی اشاعت سے ادب عالی کا ایک بالکل نیا اور بھرپور پہلو سامنے آتا ہے۔

عالی صاحب اگرچہ بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن ان کی نثر شاعرانہ انداز کی حامل نہیں ہے شاعر عام طور پر نثر لکھتے ہیں تو نثر کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتے حالانکہ نثر کا مقصد توضیح، تشریح، تحلیل اور تجزیہ ہے۔ عالی صاحب کی نثر میں یہ سارے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان کا نثری اسلوب سلیس، رواں دواں اور تشریحی انداز کا حامل ہے۔ بات کو سمجھانا، خیال کو پوری طرح واضح کرنا، موثر اور دل نشیں پیرایہ اختیار کرنا۔ عالی صاحب کی نثر ان عناصر سے مملو ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی نثر پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے لکھنے والا ایک واضح، مضبوط اور مستحکم شخصیت کا حامل ہے۔ تحریر شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ عالی صاحب اپنی تحریروں میں وہی نظر آتے ہیں جو وہ ہیں۔ حق گو، حق پسند، بے خوف،

بے ریا۔

"حرفے چند" اپنی فکر انگیزی اور اسلوب کی دل کشی کی وجہ سے ایک اہم کتاب ہے۔

مشفق خواجہ

۸ اگست ۱۹۸۸ء


MAAB 1431
maablib.org

خطباتِ گارساں دتاسی

حصہ دوم

ہندوستانی زبانوں پر پروفیسر موصوف کے سالانہ افتتاحی خطبات

۱۸۶۵ء تا ۱۸۶۹ء

مع مقدمہ

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

بعد نظرثانی

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

اشاعتِ ثانی

یوں تو ۱۹۲۳ء سے ہی رسالہ "اردو" کے ذریعے گارساں دتاسی کے خطبات کی اشاعت شروع ہو گئی تھی لیکن یہ پہلی بار کتابی شکل میں ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئے مقالات کی اشاعت ۱۹۴۳ء میں عمل میں آئی۔ قیام پاکستان کے بعد بابائے اردو مرحوم نے خطبات اور مقالات کے نئے ایڈیشن شائع کرنے کا کئی بار ارادہ کیا لیکن بعض ناگزیر وجوہ سے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے جو پیرس میں مقیم ہیں بابائے اردو کو لکھا کہ انھوں نے گارساں دتاسی کے اصل مقالات کا (جو فرانسیسی زبان میں ہیں) اردو ترجمے سے مقابلہ کر کے یہ معلوم کیا ہے کہ اصل اور ترجمے میں خاصہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے جواب میں مولوی صاحب مرحوم نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے درخواست کی کہ وہ مقالات و خطبات کے اردو ترجمے پر نظر ثانی فرما دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو پورا کرنے کی حامی بھر لی اور تقریباً چھ سات سال کی محنت کے بعد یہ کام مکمل کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کام کس قدر توجہ اور محنت سے کیا ہے اس کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ زیر نظر اشاعت کا سابقہ ایڈیشن سے مقابلہ کیا جائے۔ فاضل مترجمین نے ان گنت مقامات پر ترجمہ غلط کیا تھا یا بعض عبارتوں کو کسی نامعلوم وجہ سے ترک کر دیا تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے جا بجا ترجمے کی تصحیح کی ہے، متروک عبارتوں کا ترجمہ شامل کیا ہے۔ ناموں کے تلفظ کو اصل کے مطابق لکھا ہے مختصر یہ کہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب نے مقالات اور خطبات کا ازسر نو ترجمہ کیا ہے، یہ کام ایسا عظیم الشان ہے کہ اس کے لیے انجمن ترقی اردو ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا ان کی ممنون ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب برصغیر ہندو پاکستان کے چیدہ اور اہل علم میں سے ہیں اور اسلامی ادبیات اور علوم مشرقی پر ان کی نظر بہت گہری ہے ان کے علمی کارنامے مشرق و مغرب میں یکساں طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اگرچہ انھوں نے پاکستان کو مکانی طور پر خیر باد کہہ دیا ہے لیکن اردو زبان سے ان کا جو گہرا تعلق ہے وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا اور اس کا ایک ثبوت زیرِ نظر کتاب ہے جس کی نظرِ ثانی میں انھوں نے اپنے وقتِ عزیز کا بہت سا حصہ صرف کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کاوش کی وقعت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھیں کہ اس کا انھوں نے کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا۔ یہ ایک ایسا ایثار ہے جس کی مثال فی زمانہ ملنی مشکل ہے۔ خطبات و مقالات کی اولین اشاعتوں میں بابائے اردو کے بہت سے حواشی تھے، جن میں بعض موجودہ اشاعت سے حذف کر دیے گئے ہیں کیوں کہ متن کی نظرِ ثانی کے بعد بعض مقامات سے وہ اغلاط رفع ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے حواشی لکھے گئے تھے۔

بابائے اردو خطبات و مقالات کے موجودہ اشاعتوں پر ایک طویل دیباچہ لکھنے کا خیال رکھتے تھے انھوں نے سابقہ اشاعتوں کی اغلاط کی خاص طور پر نشان دہی کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن

آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند

اب چالیس برس بعد ایک بار ہم پھر اسے چھاپ رہے ہیں۔ اردو تاریخ کے طالب علموں اور اس پر کام کرنے والوں کے لیے گارساں دتاسی ایک ناگزیر مطالعہ ہے مگر اقتصادی طور پر ناشر کے لیے ایک مہنگا سودا بھی۔ خرچ کم از کم اتنا جتنا کسی ناول یا پاپولر کتاب پر آنے اور بافت کچھ نہیں۔ کم بکتی ہے اور بہت دیر میں بکتی ہے۔ دوسرا ایڈیشن اس وقت آ رہا ہے جب ہر چیز کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ اس پر لاگت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ بکنے میں نہ جانے کتنے برس لگیں۔

یہ سودا خسارے کا ہے۔ مگر ہمیں بہت عزیز ہے کیوں کہ اردو پر نئے کام کرنے والوں کے لیے یہ اشاعت بہت ضروری ہے جب تک ہم سے ممکن ہوا ہم ایسے سودوں سے گریز نہیں کریں گے۔

(۱۹۷۴ء)

فرہنگ

اصطلاحات پیشہ وراں

جلد اوّل

پاک وہند کے مختلف فنون اور صنعتوں
کے
اصطلاحی الفاظ و محاورات کا جامع مجموعہ

تالیف
مولوی ظفر الرحمٰن صاحب دہلوی

اشاعت دوم

آج کل اردو اصطلاحات کا چرچا پھر زور و شور سے ہو رہا ہے۔ یہ مبارک فال ہے۔

انجمن ترقی اردو نے اصطلاحاتِ پیشہ وران کی آٹھ جلدیں ۱۹۳۹ء میں شائع کی تھیں۔ جن میں مختلف پیشہ وروں اور پیشوں میں مستعمل ہونے والی اصطلاحات جمع کی گئی تھیں۔ یہ جلدیں اب نایاب ہیں اور ایک عام مطالبہ ہے کہ انھیں دوبارہ شائع کیا جائے۔ لہٰذا انجمن نے اپنے منصوبے کے تحت ان کو دوبارہ چھاپنے کا ارادہ کیا ہے اور فی الحال اس کی پہلی جلد پیشِ خدمت ہے۔

موجودہ دور، صنعتی دور ہے اور بے شمار درس گاہوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ انگریزی کی اہمیت اپنی جگہ اور یہ بھی سچ ہے کہ بہت سے انگریزی الفاظ متعلقہ اداروں اور عوام میں رائج ہو گئے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری قومی زبان میں ان کے مناسب اور سبک مترادفات موجود ہیں۔ اب اردو سرکاری کاروبار میں اور تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے استعمال ہونے لگی ہے۔ لامحالہ اساتذۂ فن اور طلبا و عوام کو اردو الفاظ کی ضرورت محسوس ہوگی۔ اس احساس نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم ان اصطلاحات کو جلد منظرِ عام پر لے آئیں جو تقریباً نصف صدی سے نایاب ہو چکی ہیں تاکہ جس حد تک ممکن ہو انگریزی اصطلاحات کی جگہ اردو الفاظ رائج ہو سکیں۔ اس طرح زبان کی وسعت اور وقعت دونوں میں اضافہ ہوگا اور روزمرہ کی قومی ضروریاتِ اظہار باآسانی پوری ہو سکیں گی۔

اصطلاحاتِ پیشہ وران کی طباعت فوٹو آفسٹ سے کی گئی ہے اس لیے یہ کتاب پہلی اشاعت کی بجنسہٖ نقل ہے۔

(۱۹۷۵ء)

اردو تھیٹر

(جلد چہارم)

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

اشاعت اوّل

کام تو ختم نہیں ہوا مگر یہ اس سلسلے کی چوتھی جلد ہے۔ اب ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا وہ بے نظیر تحقیقی مقالہ پوری طرح چھپ گیا جو بعض مقامات پر کسی قدر تشنگی کے باوجود بابائے اردو کے بقول اردو تھیٹر پر ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔

پہلی تین جلدیں بھی انجمن ہی نے چھاپی ہیں اور اب اس چوتھی جلد میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۶۵ء تک اردو میں اسٹیج کرنے والی تھیٹریکل کمپنیوں کا تفصیلی تذکرہ بھی آگیا ہے لیکن ایک کمی جس میں ڈاکٹر نامی صاحب کا قصور نہیں صاف محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حصہ دوم (ب) جو ۱۹۰۱ء سے ۱۹۶۵ء پر محیط ہے بہت ہی مختصر اور نامکمل معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور سے ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان میں اردو تھیٹر پر مصنف کے پاس کافی مواد معلوم نہیں ہوتا۔ مانا کہ یہ جلد بھی انھوں نے بمبئی میں بیٹھ کر لکھی لیکن ۱۹۶۵ء تک پاکستان اور ہندوستان میں نہ صرف بین الملکی سفر کی آسانیاں موجود تھیں بلکہ تحقیقی میدان میں سرگرم تعاون بھی جاری تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے پاکستان میں اردو تھیٹر کے بارے میں کن ذرائع پر انحصار کیا لیکن راقم الحروف کم از کم ایک مشہور کمپنی کا تو چشم دید گواہ ہے جو خود کراچی میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۲ء تک باقاعدہ کام کرتی رہی۔ اس کمپنی کا نام اسٹار تھیٹریکل کمپنی تھا (یا اس سے ملتا جلتا ہوگا لیکن اتنا یقین ہے کہ اس میں اسٹار کا لفظ ضرور آتا تھا)۔ اس کا کوئی ایک مالک نہیں کہا جاتا تھا بلکہ مشہور تھا کہ اس کے فنکار اور دوسرے کارکن اسے مل جل کر مشترکہ منافع کی بنیادوں پر چلاتے ہیں۔ یہ ایک متوسط قسم کا ہال تھا جو کراچی کی ایک سڑک پر کسی سینما کے ساتھ واقع تھا۔ اس میں زیادہ تر آغا حشر کاشمیری مرحوم کے کھیل اسٹیج ہوتے تھے۔ پرانے اندر سبھا، لیلیٰ مجنوں اور

شیریں فرہاد بھی کھیلے جاتے تھے۔ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد میں مردانہ کردار اکثر ایک خاتون فنکارہ بھی ادا کرتی تھیں جب کہ روایت یہ سنی تھی اور اپنے بچپن کی دلی میں دیکھا بھی تھا کہ اکثر اوقات مرد فن کار لیلیٰ اور شیریں بنتے تھے۔

پاکستان میں بطور خاص صوبہ سندھ میں اب بھی مستقل منڈلیاں گھومتی پھرتی ہیں جو اردو کھیل اسٹیج کرتی ہیں۔ یہ ان مقامی اور برساتی قسم کی ٹولیوں سے مختلف ہیں جو میلوں ٹھیلوں پر کام کرنے لگیں۔ یہ مستقل کاروباری اور فنی ادارے ہیں مگر افلاس، بد نظمی اور ناپذیرائی کا شکار۔

اسی طرح صوبہ پنجاب میں بے شمار ایسی چھوٹی مگر مستقل کمپنیاں ہیں جو قصبے قصبے گھومتی ہیں اور اردو کھیل دکھاتی ہیں۔

افسوس کہ میں ان کے نام یاد نہیں رکھ سکا مگر مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی جم کر کام کرے تو اس سلسلے میں کافی دلچسپ اور تاریخی لحاظ سے فوری مواد جمع کیا جا سکتا ہے۔

یہ تو تھیٹریکل کمپنیوں کی بات تھی۔ ایک اور بات پر توجہ کرنی ہے۔ پاکستان میں اردو تھیٹر کے سلسلے میں شوقین فنکاروں اور قسمت آزماؤں نے بہت کام کیا ہے اور برابر کیے جاتے ہیں۔ فلم اور اب ٹی۔ وی نے عوامی تفریح کا سامان الگ کر رکھا ہے اور مستقل تھیٹریکل گروپ قائم کرنا اور انھیں چلانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے مگر اس بات پر بھی سب نقادانِ فن اور دانشور متفق رہتے ہیں کہ یہاں تھیٹر قائم ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں مختلف حکومتوں نے کئی بار مختصر سروے کرا کے رپورٹیں بھی طلب کی ہیں اور ایک رپورٹ جس کی تدوین میں، راقم بھی شامل تھا اب بھی وفاقی حکومت کے زیر غور کہی جاتی ہے۔ اس سے کم از کم یہ ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان میں تھیٹر کا مسئلہ زندہ ہے۔

اس چوتھی جلد کی اشاعت پر انجمن ایک بار پھر ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا شکریہ ریکارڈ پر لاتی ہے۔ ان کا یہ کام اردو دنیا کے لیے ایک عظیم الشان کارنامہ تھا جسے بالآخر ہم پوری طرح شائع کرنے میں کامیاب رہے۔ اب ڈاکٹر نامی کا یہ مقالہ تاریخ اردو کے مفید ترین ابواب میں شامل ہو چکا ہے۔

لیکن جیسا کہ ابھی اشارہ کیا گیا، ہماری رائے میں اس موضوع پر کام ختم نہیں ہوا۔ ہندوستان میں اردو تھیٹر کی اب کیا کیفیت ہے اس کا ہمیں علم نہیں لیکن پاکستان کی حد تک اردو تھیٹر پر کم از کم ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۵ء تک جو کچھ گزری ہے اس کے لیے ایک سیر حاصل تحقیقی مقالہ نہایت ضروری ہے۔ ایسے مقالے یعنی "پانچویں جلد" کے بغیر ہم اس سلسلے کو نامکمل قرار دیں گے چند کرم فرماؤں سے رجوع کیا گیا تھا لیکن وہ مصروف نکلے۔ بہر حال ہماری کوشش ہے کہ کوئی اہلِ دل یہ بیڑا اٹھا لے۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

اور جب ایسا مقالہ ہاتھ آگیا تو انجمن اسے چھاپنے میں انتہائی مسرت محسوس کرے گی۔

(۱۹۷۵ء)

جنگ نامہ آصف الدولہ و نواب رام پوری

(۱۷۹۴ء)

خلیفہ محمد معظم عباسی

مرتبہ

محمد ایوب قادری

پہلا ایڈیشن

ہم نے اس سے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے نایاب و کمیاب اُردو مخطوطات کے حصول اور ان کی اشاعت کا ایک بڑا منصوبہ شروع کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ایسے تمام مخطوطات کو یکے بعد دیگرے طبع کر دیا جائے جن سے تاریخ اردو زبان کے مختلف ادوار ترتیب دینے میں مدد مل سکے۔ انھوں نے اس کام کی ابتداء ان مخطوطات سے کی تھی جو دکن میں لکھے گئے تھے۔ لیکن وہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہتے تھے۔ مرحوم نے جہاں دکنی مخطوطات کا کھوج لگایا وہاں شمالی ہند کی تصنیفات کی تلاش میں بھی مصروف رہے۔ اس وابستگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس دور میں شمالی ہندوستان کے اہلِ قلم کی تصنیفات سے میر اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی "وفات نامہ حضرت فاطمہؓ" اور غضنفر حسین کی مثنوی "جنگ نامہ عالم علی خاں" بھی شائع ہو کر اہلِ تحقیق کی دلچسپی کا سبب بنیں۔

انجمن ترقی اردو پاکستان نے بابائے اردو کے اس مشن کو فراموش نہیں کیا تھا لیکن مالی محدودات اور دوسری مصروفیات نے اسے اس طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہونے دیا۔ بہر حال گزشتہ سال سے شمالی ہند پاک ہند کے مخطوطات کو منظر عام پر لانے کی کوشش شروع کی جا چکی ہے اور اب کئی انمول ادب پاروں کو نذر شائقین کرنے کا موقع ملا ہے جن کی ابتدا "مثنوی نل دمن" سے کی گئی تھی۔ یہ مثنوی جس کے مصنف بابائے اردو مرحوم کے ایک ہم وطن احمد علی ہیں اور جس کو ہمارے قابلِ فخر بزرگ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ہے انجمن سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ مثنوی اگرچہ بہت قدیم نہیں ہے پھر بھی "جنگ نامہ عالم علی خاں" اور مثنوی "اسمٰعیل امروہوی" سے بعد کی تاریخ زبان مرتب کرنے کے سلسلے میں

ایک مفید کڑی ثابت ہو سکتی ہے۔ دوسری مثنوی "جنگ نامہ آصف الدولہ" ہے جو ۱۳۰۹ھ/۱۷۹۴ء سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی تدوین پروفیسر محمد ایوب قادری نے سیر حاصل مقدمے کے ساتھ کی ہے۔ تیسری مثنوی "نوسرہار" ہے جس کو انجمن کے محقق اور قدیم کارکن افسر صدیقی صاحب سہ ماہی اردو کے توسل سے منظر عام پر لا چکے ہیں۔ اس مثنوی کو املا کی بے شمار اغلاط کے باوجود پڑھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے اور انشاء اللہ عنقریب کتابی صورت میں پیش کی جائے گی۔ چوتھی مثنوی "عاقبت بخیر" ہے جو کتابت کی منزل سے گزر کر طباعت کے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ مثنوی "عاقبت بخیر" اس آویزش کی تصویر ہے جو ملتان کے ایک فرماں روا نواب مظفر خاں سدوزئی اور پنجاب کے راجہ رنجیت سنگھ کے درمیان ۱۸۳۲ء میں واقع ہوئی۔

ہماری منزل یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس کے بعد ایک اور قابل لحاظ تصنیف "ولایت علی نامہ" کی ترتیب و تدوین کا ارادہ ہے جو ہریانی زبان کے علاقے کے ایک مصنف کا شاہکار ہے۔

"جدیدیت" کی ناگزیر اہمیت اپنی جگہ۔ اس پر لوگ کچھ کام کر بھی رہے ہیں۔ کاش ہم جدید ادب کی طرف بھی آ سکیں لیکن جب تک یہ ممکن نہ ہو قدیم پر تحقیق اور اس کی اشاعت بھی ایک ضروری سائنسی عمل ہے۔ چونکہ اس سلسلے میں ہمیں کافی مواد کے ساتھ ساتھ فاضلین کا تعاون میسر ہے اس لیے انشاء اللہ یہ عمل جاری رہے گا۔

اُمید ہے کہ اردو کے محققین، جامعات اور متعلقہ ادارے اس منصوبے کی سرپرستی میں دلچسپی لیں گے۔

(۱۹۷۸ء)

ماخذات

احوالِ شعرا و مشاہیر

جلد اوّل

پہلا ایڈیشن

انجمن کا کتب خانہ اس درجے کا ہے کہ اس میں موجود کتابوں اور مخطوطات کی فہرستیں کئی عنوانوں سے مرتب ہونی ضروری ہیں۔ ہم فہرست مخطوطات شائع کر چکے ہیں۔ کتابوں کی فہرست بھی موجود ہے۔ اب یہ نادر کتاب ترتیب دی جارہی ہے جس کے مرتب خود مہتمم اعلیٰ کتب خانہ خاص محترمی سید سرفراز علی رضوی ہیں۔ سید صاحب موصوف انجمن کے لیے ایک اثاثہ ہیں۔ جن ناگفتہ بہ حالات میں جس مستقل مزاجی اور درویشی کے ساتھ انھوں نے کتب خانہ خاص کی نگرانی کی ہے وہ کہانی خاموش کارکنی کی اعلیٰ ترین مثالوں میں شامل ہوگی۔

اگلے صفحات پر سید صاحب کا پیش لفظ ہے۔ اس میں انھوں نے اس ترتیب کے بارے میں جو اصول اختیار کیے ہیں انھیں مجملاً بیان کر دیا ہے۔ قارئین کو اور کام کرنے والوں کو ان وضاحتوں سے جو فائدہ ہوگا وہ یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

ظاہر ہے کہ ماخذات کی یہ فہرست مکمل نہیں۔ اردو کا سرمایہ قدیم بھی ہے اور بہت بڑا بھی، اور ایک جلد میں اس کا احاطہ کرنے کی کوشش بھی کی جائے تو ممکن نہ ہوگا۔ کئی ہزار صفحات ایک جلد میں کیسے سما سکتے ہیں چنانچہ طے یہ کیا گیا ہے کہ جیسے جیسے کام ہوتا جائے ایک کے بعد دوسری جلد کی صورت میں اشاعت ہوتی رہے۔ اس فیصلے میں ہمارا یہ اصول کارفرما ہے کہ علم کو چھپا کر نہ رکھا جائے۔ جب، جس قدر عام ہو سکے، عام کر دیا جائے اور اس طرح کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی دسترس میں آجائے۔ چنانچہ یہ پہلی جلد پیش خدمت ہے جو ضخیم بھی نہیں اور سستی بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ محترم سید سرفراز علی صاحب کو عمر و صحت دے تاکہ وہ یہ کام کامیابی کے ساتھ جاری رکھیں اور ان کی محنت اور تجربے کے فوائد جلد اور زیادہ سے زیادہ عام ہوں۔

(۱۹۷۸ء)

ماخذات

احوالِ شعرا و مشاہیر

جلد سوم

مولفہ

سرفراز علی رضوی

پہلا ایڈیشن

سید سرفراز علی رضوی مرحوم انجمن کے ایک بڑے لائق، مُستعد، کارگزار اور مخلص کارکن تھے۔ عربی، فارسی اور اردو پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ یکم اگست ۱۹۵۲ء کو انجمن سے وابستہ ہوئے اور اپنی وفات ۲۲ دسمبر ۱۹۸۲ء تک انجمن سے وابستہ رہے۔ سید سرفراز علی رضوی نے بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی نگرانی میں انجمن کے دونوں کتب خانوں کا کام سنبھالا اور دونوں کو بڑی محنت اور عرق ریزی سے مرتب کیا۔ بابائے اردو مرحوم ان کی مستعدی اور کارگزاری سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ مولوی صاحب یہاں جن پریشانیوں میں گھیرے رہے۔ اُن کا ذکر خود ان کے کتابچے "انجمن کا المیہ" میں موجود ہے۔ تنظیم نو ہوتے ہوتے ان کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد ہماری درخواست پر سید صاحب نے "کتب نما" کے عنوان سے کُتب خانہ خاص کی کتابوں کی فہرست مرتب کرنی شروع کی۔ چھبیس ہزار (۲۶۰۰۰) اردو، فارسی اور عربی کتابوں کی موضوع وار یہ فہرست ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے اور آج محققین کی بڑی رہنمائی کرتی ہے۔ سید صاحب کو کتابوں اور کتب خانے سے بڑی گہری وابستگی تھی، چنانچہ انھوں نے کتب خانۂ خاص کے عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی فہرستیں بھی مرتب کیں، جو (انجمن کی جانب سے) شائع ہو چکی ہیں۔ سید صاحب نے رسالہ "اردو" کے مضامین کا اشاریہ بھی تیار کیا تھا۔ یہ بھی انجمن کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ ماخذات کے عنوان سے سید صاحب نے جو کتابیں مرتب کی تھیں ان کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور یہ تیسری جلد ہے جو اس وقت آپ کے پیش نظر ہے (چاروں جلدیں مزید اشاعت کے لیے تیار ہیں)۔

سید صاحب کو علمِ جفر، نجوم اور رمل سے بھی گہری دلچسپی تھی، چنانچہ

انھوں نے ایک کتاب "مستحصلات الجفر" کے عنوان سے مرتب کر کے خود ہی شائع کی تھی۔ اس کے علاوہ سید صاحب نے جامعہ عثمانیہ کی کتابوں کی فہرست، فہرستِ رسائل اور کتب خانۂ خاص کی کتابوں کے "مصنفین اور عنوانات کے کارڈ بھی تیار کیے تھے جو کتب خانہ میں موجود ہیں۔ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی یہ بھی افادۂ عام کے لیے شائع ہوں گے۔

سید صاحب اردو اور انجمن کے ایک بے لوث کارکن تھے۔ نام و نمود اور مالی فوائد سے بے پروا اپنے کام میں منہمک رہے اور ایسا علمی سرمایہ مرتب کر گئے جو ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ سید صاحب کے علمی کارناموں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کام تن تنہا کیا وہ اداروں اور اکیڈمیوں کے کاموں پر بھاری ہے۔ انجمن کی بڑی بد نصیبی ہے کہ وہ ایسے مخلص مستعد کارکن سے محروم ہو گئی۔ اللہ اُنھیں جنت نصیب کرے۔ وہ خاموش، مستقل مزاج اور بڑی محنت کرنے والے بزرگ تھے۔

پچھلی دو اشاعتوں میں نہ کتابت معیاری ہو سکی نہ کاغذ اچھا لگا مگر کتابت کی خامیاں کراچی میں عام ہیں۔ اب بھی اطمینان بخش نہیں لیکن اس مرتبہ کاغذ بہتر لگایا جا رہا ہے۔ ایسی کتابوں کی فروخت بہت کم رفتار اور بالکل بے منفعت ہوتی ہے۔ لیکن ان کی ضرورت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انجمن مالی نقصان اُٹھا کر بھی خوش ہے کہ اس نے یہ سلسلہ جاری رکھا ہے۔

اس پورے سلسلے میں فاضل مرتب مرحوم نے حوالوں میں نہایت اختصار سے کام لیا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ بصورت دیگر ان کا کام اور انجمن پر مالی بوجھ ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ جائے گا۔ راقم الحروف کہ ان کا ایک مخلص ممنون و مداح ہے چپ ہو کر رہ جاتا تھا۔ پھر دیکھا کہ پورا کام انھی خطوط پر ممکن ہو سکتا تھا جو انھوں نے وضع کیے تھے۔ یہی دیکھ لیجیے کہ (جیسے پہلے عرض کیا گیا) اب بھی چار مزید جلدیں اشاعت کے لیے تیار ہیں۔ واضح رہے کہ "ماخذات" جیسے حوالہ جاتی کام امیر مغربی اداروں میں بھی اس پیمانے پر کم ہوتے ہیں۔ اُمید ہے کہ اردو دنیا اس سلسلے سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتی رہے گی۔

(۱۹۸۷ء)

کاروانِ صحافت

(نظر ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن)

ڈاکٹر عبد السلام خورشید

دوسرا ایڈیشن

"کاروانِ صحافت" اردو صحافت کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کر لے گی۔ حیرت ہے کہ اردو صحافت اتنی قدیم ہو چکی ہے لیکن محققین نے اس کی تاریخ لکھنے پر بہت کم توجہ دی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ حوالوں کے لیے مواد اور ماخذ تلاش کرنا سخت محنت کا کام ہے اور

کجا عاشق کجا کالج کی بکواس

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے صحافت کی گود میں پرورش پائی خود صحافی ہیں اور صحافت کا مضمون پڑھاتے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے خلوص، تجسس، ان کی محنت اور انداز بیان کی داد سب دیتے ہیں۔ صحافت پر ہی ان کی کتاب "اردو صحافت ہندو پاکستان میں" کو داؤد ادبی انعام مل چکا ہے۔

اس کتاب میں اُنیس مقالے ہیں جن کے موضوعات رنگا رنگ ہیں۔ وہ اردو صحافت کے بارے میں ہی بہت سی تاریخی اور دلچسپ اطلاعات بہم نہیں پہنچاتے بلکہ ان میں برصغیر کی چند نمایاں سیاسی اور سماجی تحریکوں کے واضح عکس بھی ملتے ہیں۔ یہ اس کتاب کی ایک اہم اضافی خصوصیت ہے۔

ملکی صحافت میں پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ نئے صحافیوں کے لیے اپنی تاریخ جاننا بھی نہایت ضروری ہوتا جاتا ہے۔ اس مسئلے کے کئی پہلو ہیں۔ علمی، پیشہ ورانہ اور تاریخی۔ ہمارا خیال ہے کہ ان مقالوں میں ان سب پر کافی مواد ملے گا۔

(۱۹۸۹ء)

غالبِ آشفتہ نوا

ڈاکٹر آفتاب احمد

پہلا ایڈیشن

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں نے پی۔ ایچ۔ ڈی تو ایڈ منسٹریشن میں کیا ہے۔ وہ بھی غالباً بیس برس پہلے مگر وہ غالب شناسوں کی صف میں اپنی نو عمری ہی سے آ چکے تھے۔ ان کا مقدمہ ان مضامین کے سالہائے تصانیف خود بتاتا ہے۔

اب تک غالب پر جتنا لکھا گیا اس کا کوئی مکمل اشاریہ موجود نہیں۔ شاید کبھی بھی مکمل نہ ہوگا۔ غالب مرنے والے شاعر نہیں۔ اسی لیے لکھنے والوں کا مرغوب موضوع رہے اور رہیں گے۔ کب تک؟ اردو زبان کی زندگی تک! پھر غالباً لازماً یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دور میں صرف ترجموں کے ذریعے جانے اور زیادہ پہچانے جائیں۔

مصنّف نے عنوان کتاب "غالب آشفتہ نوا" رکھا ہے لیکن ان کے تمام مقالے ان کی آشفتہ نوائی سے مخصوص نہیں۔ اپنے مزاج اور مواد میں خاصے متنوع ہیں۔ خود ان کے مطابق تلاشِ غالب میں ان کے سرگرداں رہنے کی نشانیاں ہیں۔

اور یہ بڑی شگفتہ نشانیاں ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب کی تلاش ان نئی حسیات کے اظہاریے ہیں جو اس صدی کی چوتھی دہائی میں نوجوان ہونے والی نسل نے دریافت کیں اور ان کے ذریعے بعض "قدما" مثلاً میر، نظیر اور غالب کو پہچاننا چاہا۔ سچ یہ ہے کہ اس نسل کے بعد آنے والے اہلِ اظہار نے تاحال کوئی اور نئے پیمانے نہیں بنائے ہیں۔ ابھی تک نئی نسل اسی پرانی نئی نسل سے ہم احساس چلی آتی ہے۔

ڈاکٹر آفتاب کی گفتگو میں ان مقامات پر بھی ذرا اغلاق محسوس نہیں ہوتا جب وہ غالب کے بہت ہی مشکل معنیاتی مراحل سے گزر رہے ہوں۔ جن مقامات پر اچھے اچھے نقاد گھبرائے گھبرائے نظر آتے ہیں، ان سے ڈاکٹر آفتاب خاصے آسان گزر جاتے ہیں۔

بیشتر یا سب اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کی طرح ڈاکٹر آفتاب کو بھی دوران کار اتنا موقع نہ ملا کہ پورے ارتکاز کے ساتھ غالب پر کام کرتے۔ اس کے باوجود انھوں نے غالب کی تفہیم میں اپنا حصہ خاص محنت اور پوری سچائی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ اب وہ فارغ ہیں، اگر اس سرگردانی کو ہمہ وقتی بنالیں تو غالبیات میں ایک بڑا اضافہ کر جائیں گے......

کیوں کہ دراصل وہ غالب کے آدمی ہیں اور غالب ان سے ان سطور کے ذریعے اس مطالبے میں حق بجانب ہوں گے۔

انجمن اس اشاعت کو بڑی خوشی کے ساتھ پیش کر رہی ہے۔ واضح رہے کہ ۲۱ صدی کا پہلا مقالہ جس نے غالب کو ایک دھماکے کے ساتھ دوبارہ "روشناس خلق" کر تھا انجمن ہی کے سہ ماہی جریدے "اردو" میں چھپا تھا۔ پھر وہ مقالہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی کتاب بن گیا اور غالب شناسی پر اس صدی کے سلسلہ کتب کی پہلی کڑی۔ انجمن کے صدر جناب نور الحسن جعفری، راقم الحروف کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر آفتاب احمد کے ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ مقالے انجمن کو اشاعت کے لیے دیے۔

لیکن ہم ان کا دلی شکریہ اس وقت ادا کریں گے جب وہ غالب کو ان کا اور ہمیں ہمارا حق، غالب پر ایک پوری مسلسل کتاب عنایت کریں۔

امید ہے کہ یہ کتاب غالب شناسوں ہی میں نہیں عام قارئین ادب میں بھی ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

(۱۹۸۹ء)

مولانا احسن مارہروی

آثار و افکار

ڈاکٹر صابر حسین خان جلیسری

پہلا ایڈیشن

اب انجمن کے اشاعتی منصوبوں میں اشاعتِ سوانح کو اہمیت حاصل ہوتی جاتی ہے۔ یقیناً یہ مالیاتی لحاظ سے ایک مہنگا اور قطعی غیر منفعت بخش سودا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں عام تو کیا بہت سے خاص قارئین بھی غیر رومانوی شخصیات کے احوال و آثار سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ کتاب خریدے کون! لیکن تاریخ اردو اپنے ریکارڈ کی تحریر و ترتیب کیے جاتی ہے آج کا اور مستقبل کا محقق یہ جاننا چاہے گا کہ کن اکابر کے احوال کیا تھے، آثار کیا تھے۔ انھوں نے کن کن رجحانات کے تحت کام کیا اور کیا خود بھی کوئی رجحان قائم کیا۔ انھوں نے کتنے کارکنانِ اُردو کی تربیت کی...... یعنی ان کی پوری مستند کہانی......

ادھر وقت گزرتا جاتا ہے اور شواہد معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ جتنی زیادہ دیر کسی شخصیت پر گزر جائے۔ اس کے بارے میں احوال کی تلاش اور تصدیق مشکل سے مشکل تر ہو جاتی ہے۔

مقامِ شکر ہے کہ چند برس سے پاکستانی جامعات نے اکابرِ اُردو پر پی۔ ایچ۔ ڈی مقالوں کی اجازت دینی شروع کر دی ورنہ بعض غلط اصول اور دراصل بہت سے خفی و جلی تعصبات کے سبب پی۔ ایچ۔ ڈی مقالوں کے لیے شخصیات پر کام کرنا ایک بڑا مرحلہ رہا ہے...... اب کہ ہماری اطلاع کے مطابق بعض اہم شخصیات پر ایسے مقالے لکھے جا چکے اور لکھے جا رہے ہیں۔ صاحبانِ مقالہ اور جامعات کو دعوتِ عام ہے کہ اگر چاہیں تو انجمن سے رجوع کریں۔ ہماری مالی حالت اب بھی ایسی تو نہیں کہ ایک دم بہت سے مقالے (جو ضخیم ہوتے ہیں) شائع کرنے پر کمر باندھ لیں، لیکن بہر حال منتخب مقالوں کی مرحلہ وار اشاعت ممکن ضرور ہو گئی ہے۔

زیرِ نظر مقالہ اردو تاریخ وادب کی نامور شخصیت مولانا احسن مارہروی کے بارے میں ہے۔ مولانا نہ صرف تلامذۂ داغ میں ایک حیثیت رکھتے تھے۔ وہ جامعہ علی گڑھ کے ایک ایسے استاد بھی تھے جس نے اردو مشاہیر اور اردو کارکنوں کی ایک بڑی تعداد کو تربیت دی۔

مولانا احسن مارہروی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اہم نثری مصنف اور نگراں بھی تھے یعنی انھوں نے زبان و بیان، عروض و املا، صرف و نحو، تاریخ ادب اور ادبی تحقیق پر خود کام کیا اور اپنے زیرِ اثر، زیرِ نگرانی، لکھنے والوں کی عملی رہنمائی بھی کی۔ ان کا انتخابِ داغ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ استاد کے مکاتیب جمع کیے، ولی کا دیوان مرتب کیا، اردو نثر کی تاریخ لکھی۔ ایک لغت "فصیح اللغات" پر بھی کام کیا جس کی اسناد اُستاد داغ خود اپنے شعروں سے دے رہے تھے۔

انجمن سے مولانا کا تعلقِ خاص تھا۔ انجمن نے کلیاتِ ولی کا جو پہلا ایڈیشن شائع کیا (اورنگ آباد، دکن، جہاں انجمن کا صدر دفتر واقع تھا) وہ مولانا نے ہی مرتب کیا تھا۔

ڈاکٹر صابر جلیسری نے یہ مقالہ بڑی محنت سے لکھا ہے۔ متن ان کی محنت، تلاش اور نظر کی گواہی دے گا، لیکن اتنا عرض کر دیا جائے کہ یہ مقالہ ہمارے لیے بہت ضخیم اور اس لیے مالی طور پر بہت گراں ثابت ہو رہا تھا۔ (پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے لکھے جانے والے اکثر مقالے، غالباً بجا طور پر، ضخیم ہوتے ہیں) ہمیں ایسے ہی اور مقالے بھی چھاپنے ہیں، چنانچہ ہم نے طے کیا کہ آئندہ ایسے مقالے صاحبانِ مقالات خود اس طرح ایڈٹ کر دیا کریں کہ شائع ہونے والی کتاب کی ضخامت ساڑھے چار سو صفحات سے زیادہ نہ ہو جائے (یہ فیصلہ انشا مرحوم پر ہماری کتاب "ابنِ انشا۔ احوال و آثار" از ڈاکٹر ریاض احمد ریاض کی اشاعت کے بعد کیا گیا ہے۔ وہ کتاب ۹۶۶ صفحوں پر لکھی گئی تھی۔) ہم ممنون ہیں کہ ڈاکٹر صابر جلیسری نے ازراہ تعاون خود اس مقالے کو ایڈٹ کر دیا اور یہ کتاب سوا چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔

مولانا احسن مارہروی پر ہندوستان میں بھی خوب کام ہوا تھا، لیکن اس کا بیشتر حصہ پاکستان تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہاں ان پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے کوئی مقالہ اب تک طبع نہیں ہوا (اور اقرار کہ ہندوستانی جامعات و

اشاعتِ کتب پر ہماری معلومات بہت ناقص ہیں) اس لیے ہماری اس اشاعت سے ایک بڑی تاریخی ضرورت بھی پوری ہو جاتی ہے۔

امید ہے کہ اہلِ نظر اس نہایت اہم اشاعت کو خوش آمدید کہیں گے۔ یوں بھی یہ اردو کے ہر سنجیدہ طالب علم کے لیے ایک بڑی تاریخی شخصیت پر ایک دلچسپ اور مفید کتاب ہے جو بہت کچھ دکھائے گی..... اور سیکھنے والوں کو بہت کچھ سکھا بھی دے گی......

(۱۹۸۹ء)

مضامین اختر جوناگڑھی

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

پہلا ایڈیشن

یہ اشاعت ایک خاص تاریخی حیثیت رکھتی ہے.....

یہ سطریں نہ تو اس کتاب کے ساتھ انصاف کر سکیں گی، نہ صاحب کتاب کے ساتھ، لیکن پیش کرنی ضروری ہیں۔ بعض اہل علم و تحقیق قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے حوالے اب بھی دیتے ہیں، لیکن اکثر لوگ ان کے علمی کارناموں سے واقف ہی نہیں، بیشتر اشاعتیں نایاب اور حالات نئی نسلوں کے لیے تو بالکل نامعلوم۔ ہم نے سوچا قارئین کو کچھ نہ کچھ بتا دیا جائے۔

اس کتاب میں ۲۰ مقالے ہیں۔ کتابی شکل میں غیر مطبوعہ، مگر بیشتر شائع شدہ اور بعض ریڈیائی تقریریں، جن کی علمی اہمیت مسلم ہے۔

قاضی احمد میاں، اختر جونا گڑھی کے انتقال پر بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق جیسے محتاط اور غلو سے بری شخصیت کی تقریر سے اقتباس ملاحظہ ہو جو "قومی زبان" کے بابائے اُردو نمبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔ ان مرحوم کے بیان فضائل میں اسے سب سے اچھا خلاصہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

"ایسا صاحب فضل و کمال، ایسا محقق، اسلامی تاریخ کا ایسا ماہر، ایسا صاحب نظر اب ہم میں کوئی نظر نہیں آتا وہ سراسر علمی شخص تھے۔"

اس بیان میں بابائے اردو سے کسی قدر جذباتیت منسوب کی جا سکتی ہے کیوں کہ قاضی صاحب انجمن کے بُرے وقت میں انجمن اور بابائے اردو کے ساتھی بھی رہے۔ یہ بھی ہے کہ تحقیق ایک مستقل کاوش ہے جو مسلسل انکشافات کرتی رہتی ہے اور اس لیے بعض معاملات میں، مثلاً ولی دکنی سے متعلق یا اردو سانیٹ کی اوّلیت

کے بارے میں، قاضی صاحب کے بعض دعاوی پر مزید تحقیقات کچھ اضافے کر سکتی ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ بابائے اردو نے ان کی فضیلت اور محنت سے متعلق کوئی مبالغہ نہیں کیا ہے۔

قاضی صاحب مرحوم کا کام بھی بہت پھیلا ہوا ہے اور ان کی شخصیت بھی اتنی دلچسپ اور کئی لحاظ سے اہم ہے کہ وہ ایک پورے مقالے، پوری کتاب کے مستحق ہو چکے ہیں (انجمن دعوت دیتی ہے کہ کوئی صاحب ان پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھیں تو وہ انھیں ضرور امداد اور معاونت پیش کرے گی) آزادی کے حوالے سے ان کا نام تقسیم کے دو ڈھائی برس بعد تک پاکستان میں نہیں ہندوستان کے سرکاری حلقوں میں بھی ایک افسانوی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ انھیں ریاست جونا گڑھ سے فرار ہو کر پرتگال کے زیرِ انتظام بحرِ ہند کے ایک جزیرے "دیو" میں پناہ لینی پڑی تھی۔ مشہور یہ رہا کہ وہ وہاں سے ایک انقلابی ریڈیو اسٹیشن چلاتے ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں تھا۔ ان مخصوص حالات میں جو ریاست جونا گڑھ کے پاکستان میں رضا کارانہ انضمام کے نتیجے میں پیدا ہوئے، قاضی صاحب بہت سی غلط فہمیوں کی بنا پر اور اس بنا پر بھی کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ گجرات کے صدر رہ چکے تھے۔ حکومتِ ہند قاضی صاحب کو مواخذے یا وضاحت کے لیے طلب کر رہی تھی۔ وہ مفرور قرار دیے گئے تھے۔ "جزیرہ دیو" میں طرح طرح کی مشکلات سے گزر رہے تھے۔ بعد میں یہ سب کہانی انھوں نے انگریزی میں تحریر بھی کر دی تھی اور اسے کتابی صورت میں آنا تھا لیکن نہ معلوم کیوں وہ یہاں نہ چھپ سکی (چھپی ہو تو راقم الحروف کو دستیاب نہیں)

نہ جانے کن طریقوں سے، جن کی تفصیل معلوم نہیں، وہ ۱۹۴۹ء میں پاکستان پہنچے اور یہاں ہم نے، ہماری حکومت نے... پورے معاشرے نے..... ان کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا کسی قدر تذکرہ ابھی آگے آئے گا۔

راقم الحروف کو اس امر پر ہی فخر ہے کہ اس نے قاضی صاحب کو دیکھا۔ یہ ۵۱۔ ۱۹۵۰ء کی بات ہے جب میں کبھی کبھی انجمن میں کام کرنے والے مشاہیر کی

زیارت کرنے چلا جاتا تھا، لیکن تفاوت عمر و مزاج اور ابتدائے ہجرت میں اپنے پریشان کُن مسائل کے سبب نہ ان سے اتنا قریب ہو سکا نہ فیض اٹھا سکا کہ ذاتی معلومات یا تاثرات کی بنیاد پر ان کا اور ان کے فضائل کا ایک خاکہ مرتب ہو سکے۔ سوانح کے باب میں جو کچھ عرض کیا جائے گا وہ بزرگوں سے استفادے اور ان کے بارے میں مندرجہ ذیل شائع شدہ مواد کے مطالعے سے اخذ کردہ مواد پر مبنی ہے۔ اختصار و انتخاب راقم الحروف کی صوابدید سمجھیے۔

"راہی اور رہنما" از: مولانا سید الطاف علی بریلوی (مرحوم)

"مقالاتِ اختر" شائع کردہ ترقی اردو بورڈ، کراچی پر مقدمہ۔
از: ممتاز حسن (مرحوم)

"قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم کی یاد میں" از: ممتاز حسن (مرحوم)
(ماہنامہ "العلم" کراچی، جولائی، ستمبر ۱۹۵۹ء)

"پیر حسام الدین (مرحوم) کی یادداشتیں" (ماہنامہ "العلم" کراچی جولائی، ستمبر ۱۹۵۹ء)

"کیا قافلہ جاتا ہے" (خاکوں پر مبنی تصنیف) از: جناب نصر اللہ خاں

"قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی" از: جناب تحسین سروری (مرحوم)
(مطبوعہ سہ ماہی "اردو" شمارہ ۴)

"اردو کا پہلا سانیٹ" از: قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی (مرحوم)
(بعد وفات نومبر ۱۹۶۲ء کے ماہنامہ "طلوعِ افکار" میں شائع ہوا)

"اختر جوناگڑھی کے سانیٹ کی مزید تحقیق" از: جناب سید ایچ ترمذی
("العلم" کراچی۔ قائد اعظم نمبر، جولائی، ستمبر ۱۹۷۶ء)

قاضی صاحب ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۶ اگست ۱۹۵۵ء کو بہ عارضۂ قلب حیدرآباد سندھ میں انتقال کیا ان کے آباؤ اجداد کا وطن سندھ تھا، مگر عہدِ فرخ سیر میں سندھ سے جا کر جوناگڑھ میں مقیم ہو گئے تھے اس لیے چند پشت سے گجراتی کاٹھیاواڑی کہلاتے تھے۔ اس خاندان کی مادری زبان گجراتی ہو چکی تھی لیکن اس

زمانے کی اعلیٰ روایات کے مطابق وہ فارسی عربی میں بھی فضیلت سے متصف تھے۔ قاضی صاحب نے رواجی تعلیم انٹرمیڈیٹ تک حاصل کی۔ (جو اس وقت اس علاقے کے لیے بڑی بات تھی) اور فارسی، عربی کا ذوق..... اور اس میں مہارت...... فیضِ بزرگاں کے عطیے تھے۔ وہ جاگیر دار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ گاہے گاہے ملازمت بھی کی اور کئی علمی، سماجی اداروں کے فعال عہدہ دار بھی رہے (ان معلومات کا اشاریہ کتاب کے آخر میں دیا جا رہا ہے)

قاضی صاحب کثیر التصانیف تھے۔ مطبوعہ و غیر مطبوعہ کاموں کی تفصیل جو معلوم ہو سکی درج ذیل ہو گی۔ یہ ملاحظہ کرتے وقت دھیان رہے کہ وہ پاکستان آنے تک تصنیف و تالیف کے پیشے سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ملازمت پیشہ بھی تھے۔ اپنی زمینات کا انتظام بھی کرتے تھے۔ سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے اور اتنا لکھنے کے لیے کتنا پڑھنا پڑتا ہو گا...... یہ بھی کہ تصنیف و تالیف (اور اشاعت) کا سلسلہ ۱۹۱۴ء سے یعنی بہ عمر سترہ برس شروع ہو گیا تھا جو تقسیم ہند تک بڑے زور و شور سے جاری رہا......

مطبوعہ تصانیف

(۱) حیاتِ نظامی گنجوی، الناظر پریس، لکھنؤ (۱۹۱۴ء)

(۲) اسلام کا اثر یورپ پر، دائرہ ادبیہ، لکھنؤ (۱۹۲۰ء)

(۳) زر گل (ادبی مقالات) آگرہ اخبار پریس، آگرہ (۱۹۲۸ء)

(۴) مترجمات (عربی اور انگریزی سے علمی مضامین کے تراجم) آگرہ اخبار پریس، آگرہ (۱۹۲۸ء)

(۵) طبقات الامم (اردو ترجمہ) معارف پریس، اعظم گڑھ (۱۹۲۸ء)

(۶) علم اور اسلام (فرنچ پروفیسر ارنسٹ رینے کا ترجمہ) معارف پریس اعظم گڑھ (اس مقالے میں اسلام پر جو اعتراضات کیے گئے تھے۔ ان کا جواب بھی دیا گیا ہے) (۱۹۳۰ء)

(۷) لمعاتِ اختر (انگریزی شعرا کی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ) (۱۹۲۸ء)

(۸) اسلامی کتب خانے (اطالوی مصنفہ مس اولگا پنٹو کے مضمون کا ترجمہ مع حواشی)
(۹) سی پارۂ دل (تیس اردو غزلوں کا مجموعہ) (۱۹۳۵ء)
۱۰) اسٹڈی ان اسلامک اینڈ اورینٹل (اسلامک کلچر میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ) اشرف پریس، لاہور (۱۹۳۵ء)
(۱۱) اقبالیات کا جائزہ، اقبال اکیڈمی، کراچی ((۱۹۵۵ء)
(۱۲) تذکرۂ اہل دہلی (آثار الصنادید کا چوتھا باب مع حواشی) انجمن ترقی اردو، کراچی (۱۹۵۵ء)

غیر مطبوعہ تصانیف/مجموعے

(۱) مقالاتِ اختر (اردو مضامین، تین جلدیں)
(۴) مقالاتِ اختر، فارسی،
(۵) مقالاتِ اختر، گجراتی
(۶) مقالاتِ اختر (اسلامیات پر مضامین) غزلیات نظامی گنجوی (مختلف نسخوں سے ایڈٹ کیا ہوا مجموعہ، جسے انھوں نے ایران کے محقق وحید دستگیری مرحوم کو دے دیا اور انھوں نے اسے گنجینۂ گنجوی میں قاضی صاحب کے حوالے سے شامل کیا)
(۷) گجراتی تاریخ پر کام (یہ تین جلدوں میں مکمل ہونا تھا)
(۸) صنعت دراقہ، صحرا نشین اور ولی گجراتی پر مقالات۔
(۹) گجرات کے کتب خانہ پیر محمد شاہ کی مفصل فہرست

یہ ذخیرہ بھی کچھ کم نہیں، لیکن راقم الحروف نے ممتاز حسن مرحوم اور پیر حسام الدین راشدی مرحوم سے بار بار سنا کہ قاضی صاحب نے اس سے بھی کہیں زیادہ لکھا تھا۔ کچھ حصہ مہاجرت میں ضائع ہوا اور کچھ حصہ جو یہاں آ کر لکھا گیا وہ بھی ان کی وفات کے بعد حالات کی نذر ہو گیا۔

جب قاضی صاحب بصد پریشانی و خرابی پاکستان پہنچے (۱۹۴۹ء) تو غالباً ان کی خودداری کے سبب ان کے لیے کوئی مناسب بندوبست نہ ہو سکا۔ راقم الحروف عینی گواہ ہے اور آج لاکھوں نہیں تو ہزاروں دوسرے بھی عینی گواہ زندہ ہوں گے جو یہ

شہادت دے سکتے ہیں کہ ہندوستان سے آنے والے بہت سے بے حیثیت لوگوں نے کس بری طرح ہجرت فروشی کر کے اپنے استحقاق سے کہیں زیادہ جائداد اور مفادات پر قبضہ کیا اور بہت سے بڑے بڑے باحیثیت لوگ اس زرگری کی دوڑ سے گریزاں رہے۔

قاضی صاحب دوسرے طبقے میں آتے ہیں۔ انھیں بہ مشکل ایک تنگ محلے میں ایک عمارت کی پانچویں منزل پر (جب کہ عمارت میں لفٹ نہیں تھا) ایک مختصر سا فلیٹ ملا (بعد میں جب ان کی چند سو کتابیں کسی نہ کسی طرح جوناگڑھ سے آ گئیں تو ان کے لیے ایک الگ اور خراب تر..... جگہ لینی پڑی تھی) ایک کاروباری ادارے میں مبینہ طور پر ایک ہزار روپے کی ملازمت بہ صیغہ حساب داری بھی ملی، مگر وہ اس مزاج کے نہ تھے (راقم الحروف کو اس روایت میں شک ہے کہ اس وقت کوئی اکاؤنٹنٹ کو ایک ہزار روپے ماہوار پیش کرے گا) بہر حال وہ بے کار رہے۔ کچھ مدت بعد بابائے اردو، جو اُن کی فضیلت اور علمی کارناموں سے واقف تھے خود جا کر انھیں انجمن میں کام کرنے کے لیے لے آئے لیکن انجمن کی مالی حالت بہت سقیم تھی۔ گزارہ مشکل رہا۔ خاندان سات بچوں پر مشتمل تھا۔ دوسرے متوسلین بھی تھے۔ بہر حال اس زمانے میں انھوں نے انجمن کے علمی منصوبوں کو خوب سنبھالا۔ ان سب کا اعتراف بابائے اردو اور دوسرے محترم متعلقین انجمن و اردو نے بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔

۱۹۵۲ء میں غالباً پیر حسام الدین راشدی مرحوم، ممتاز حسن مرحوم اور ڈاکٹر آئی۔ آئی قاضی مرحوم کی کوششوں سے وہ جامعہ سندھ میں بطور استاد مقرر ہو گئے۔ یافت وہاں بھی کم تھی۔ حیدر آباد سے کراچی آنا جانا بھی رہتا تھا۔ مالی طور پر دن اب بھی اچھے نہیں گزرے۔ صدر شعبہ ہوئے تو کسی طور اطمینان کا زمانہ آیا۔ مگر وہ دور زیادہ دن تک نہ چلا اور وہ اس کے بعد بہت جلد (۱۹۵۵ء میں) انتقال کر گئے۔

"ہم" نے اردو، فارسی، عربی، اسلامیات کے ایک مستند عالم اور کثیر التصانیف بزرگ اور تحریک پاکستان کے ایک نہایت فعال کارکن (صدر گجرات مسلم لیگ) کے

ساتھ یہ سلوک کیا.... اب بھی موقع ملے تو ایسا ہی کرتے ہیں تاوقتیکہ کوئی خود بڑھ کر مینا نہ اُٹھا لے (اور خوددار لوگ اب بھی ایسا کم کرتے ہیں) .... قاضی صاحب کی فضیلت ممتاز حسن مرحوم کے مضمون میں ان کے ایک قول سے عجیب طرح ظاہر ہوتی ہے۔

"میں نے مولانا میمن (علامہ عبدالعزیز میمن راج کوئی مرحوم) کو یہ کہتے سنا ہے کہ جو میری کمزوریاں ہیں وہ قاضی صاحب کے کمالات ہیں۔"

اسی مضمون سے ممتاز صاحب کا ایک اور قول ملاحظہ ہو:

"ایک بات جو مولانا اور قاضی صاحب میں مشترک دیکھی وہ یہ تھی کہ دونوں میں کسی کے ہاں سرسری اور سطحی کام کی گنجائش نہیں تھی۔"

سید الطاف علی بریلوی مرحوم نے اپنے مضمون میں کہا ہے:

"مملکت پاکستان میں علامہ سید سلیمان ندوی کے بعد صحیح معنیٰ میں علمی شخصیت اگر کوئی تھی تو وہ قاضی صاحب کی تھی ایسا مستحضر علم ہم نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔ قریب قریب ہر علم و فن پر قیمتی سے قیمتی معلومات ان کی نوکِ زبان تھیں۔"

جناب نصر اللہ خاں، ڈاکٹر وفا راشدی اور جناب تحسین سروری (مرحوم) کے مضامین قاضی صاحب کے تبحرِ علم اور ان کی گفتگو سے ہی بے شمار موضوعات پر بڑے بڑے ذخائرِ علمی و ادبی کا پتہ مل جانے کا تذکرہ سناتے ہیں۔ ایک یہ بات بھی تاحال ناقابلِ تردید لگتی ہے کہ اردو کا پہلا باقاعدہ سانیٹ قاضی احمد میاں اختر نے لکھا تھا (بہاء الدین کالج میگزین، جوناگڑھ ۱۹۱۵ء اور رسالہ زبان مانگرول (کاٹھیاواڑ) اگست ۱۹۲۱ء کے حوالے دیے گئے ہیں۔ ن۔ م راشد صاحب کی خود نوشت سوانح سے بھی یہ نقل کیا گیا ہے کہ اردو میں پہلا سانیٹ قاضی صاحب نے لکھا تھا۔ (ملاحظہ ہو سید وی ایم ترمذی صاحب کا محولہ بالا مضمون) ...... یہ الگ بات ہے کہ اپنے استاد کی فہمائش

پر، جو روایت سے انحراف پسند نہیں کرتے تھے، قاضی صاحب نے مزید سانیٹ نہیں لکھے۔ روایتی اصناف میں شعر کہتے رہے۔

اس فضیلت اور متنوع طبیعت کی شخصیت ہمارے مطالعے کے لیے بہت اہم ہو جاتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں بیس مقالات ہیں۔ ولی دکنی (گجراتی) سے متعلق ہی سات مضامین اور اس موضوع پر قاضی صاحب کا اختصاص سب اہلِ علم کو معلوم ہے۔ ان مقالات کی علمی ادبی حیثیت پر راقم الحروف کچھ بھی عرض کرنے کا اہل نہیں۔ سوائے اس کے کہ اپنی بساط کے مطابق خوشہ چینی کرے۔ ہاں قاضی صاحب کا مختصر احوال، اور ان کے خصائص پر چند مستند و محترم بزرگوں سے جو ملا، اس کا خلاصہ اس لیے کر دیا ہے کہ قاضی صاحب کے شخصی اور علمی پس منظر کا کسی قدر ریکارڈ تو محفوظ ہو جائے۔ اسی بہانے سہی ..... افسوس کہ ہم بعض مقالوں کے متعلق ایسی مستند معلومات جمع نہیں کر سکے جو نشان دہی کرتیں کہ وہ کب اور کہاں چھپے تھے۔ جہاں ممکن تھا مقالے کے آخر میں بتا دیا گیا ہے۔ ریڈیائی تقریریں مختصر ہی ہوتی ہیں۔ ایک آدھ مقالے میں کتابیات موجود نہیں (مثلاً "گزشتہ سو سال کا اردو ادب") اور قاضی صاحب مرحوم کی اپنی پسند ناپسند بیان و انتخاب واقعات میں آمیز بھی ہو جاتی ہے جو ان کا حق ہے (اور موجودہ روشِ وقائع نگاری کو دیکھتے ہوئے تو وہ بڑے محتاط نظر آتے ہیں) لیکن یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ایسے مقالے قاضی صاحب کو فرمائش پر اور مختصر مدت میں لکھنے پڑے۔ حالی و شبلی پر بعد میں بہت کام ہوا اور بڑے فاضلانہ موازنے آج جاری ہیں۔ (اور رہیں گے) غالب سے متعلق تقریباً ہر موضوع اور ہر فرد پر نئے نئے تحقیقی خزانوں کا اضافہ ہوتا جاتا ہے.....

مختصراً، ان مقالوں کے بہت سے موضوعات آج بھی نئی تحقیق اور نئی (مختلف) آرا کا مضمون بنے ہوئے ہیں اور ان کی اہمیت اور ضرورت میں کلام نہیں، لیکن قاضی صاحب کا کام تنقیدی نظر سے دیکھتے ہوئے اگر ہم ان کا دور اور وسائل سامنے رکھیں تو ہمیں ان کی جستجو اور گفتگو کو صدقِ دل سے خراجِ تحسین پیش کرنا پڑے گا

اس خراجِ تحسین سے ہماری مالی حیثیت کے مطابق یہ کتاب ایک نذرانہ ہے جو انجمن بڑی خوشی کے ساتھ احمد میاں اختر جونا گڑھی مرحوم کے عظیم الشان ذخیرے سے لے کر اردو قارئین کے سامنے پیش کر رہی ہے۔

امید ہے کہ اس کی اہمیت اور خصوصیات کے سبب اس کتاب کو علمی ادبی حلقوں میں قرار واقعی پذیرائی حاصل ہوگی۔

انجمن کوشش کرے گی کہ قاضی صاحب کے بعض دوسرے کارنامے بھی منظرِ عام پر آئیں...... انشاء اللہ......

(۱۹۸۹ء)

تنقید اور جدید اردو تنقید

ڈاکٹر وزیر آغا

پہلا ایڈیشن

۱۹۸۰ء سے انجمن نے ایک سلسلہ خطبات شروع کر رکھا ہے۔ یہ "بابائے اردو یادگاری یا توسیعی خطبات" ہیں۔

مولوی عبدالحق مرحوم نے سولہ اگست ۱۹۶۱ء کو انتقال کیا تھا۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ خطبے کا جلسہ اسی تاریخ کو یا اس کے آس پاس منعقد ہو سکے۔ احاطۂ عنوانات بہت پھیلا ہوا ہے ہر عنوان انجمن اور صاحبِ خطبہ کی باہمی مشاورت سے طے ہوتا ہے، لیکن دیکھا گیا کہ اکثر اوقات ہمارے مہمان اس تاریخ یا مہینے کے پابند نہیں ہو سکے، چنانچہ ترجیح تو ہم اب بھی ماہِ اگست کو دیتے ہیں لیکن جلسے کا انعقاد صاحبِ خطبہ اور شہری حالات کی سہولت کے مطابق ہی کرنا پڑتا ہے۔ کراچی بلکہ ملک میں گاہ بہ گاہ سانحات بھی مقررہ تاریخوں کو ملتوی کراتے رہتے ہیں۔

"بابائے اردو یادگاری خطبہ" انجمن سے شائع بھی کیا جاتا ہے اور اس طرح انجمن شائقینِ علم و ادب کے لیے ایک قیمتی دستاویز مہیا کر دیتی ہے۔

ان خطبوں کے سلسلے میں کوئی وطنی امتیاز نہیں رکھا گیا ہے۔ اردو کے فاضل خواہ کوئی وطنیت رکھتے ہوں مدعو کیے جا سکتے ہیں۔ اب تک ہم نے اخراجات کی وجہ سے ہندوستان کے علاوہ دوسرے بیرونی فضلاء کو دعوت نہیں دی لیکن آئندہ اس کے لیے کوئی نظام وضع کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اس ضمن میں ہم بیرونی اردو دوست اداروں سے رجوع کر رہے ہیں۔

افسوس کہ بہت سی وجوہ سے ہر سال ایک خطبہ ممکن نہیں ہوا۔ ہمارے بعض مہمان دعوت قبول کرنے کے باوجود نہ آ سکے نہ بروقت معذرت کر سکے۔ ایسے خطبات کے لیے کئی مہینے پہلے عنوان اور وقت طے کرنا پڑتا ہے۔ کسی مختصر مہلت میں نہ تو مطلوبہ معیار کا متبادل مہمان منتخب ہو سکتا ہے نہ خطبہ۔ چنانچہ بعض مرتبہ ہمیں اپنے اجلاس منسوخ بھی کرنے پڑے۔ اس ضمن میں ہم اس امر پر اصرار کرتے ہیں (جیسا

کہ دنیا میں تمام موقر علمی اداروں کا دستور ہے) کہ خطبہ نہ پہلے کہیں پڑھا گیا ہو نہ چھپا ہو اور بہت زیادہ ممنون ہوتے ہیں اگر صرف اسی تقریب کے لیے لکھا گیا ہو۔ (بعض مرتبہ ہمارے فاضل مہمان اپنی کسی زیر تدوین کتاب کا کوئی حصہ پڑھنے کی پیش کش بھی کرتے ہیں جو ایک مرتبہ سے زیادہ قبول نہیں کی گئی (کیوں کہ اس وقت ہمیں ابتدا کرنی تھی) مہمان کے اخراجات آمد و رفت کے علاوہ اسے مطبوعہ کتاب کی مقررہ رائلٹی بھی پیش کی جاتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ نہ وہ اتنی دلکش ہوتی ہے نہ اہم کہ ایک بلیغ خطبہ صرف اسی کے لیے لکھا جائے۔ دراصل مہمانانِ گرامی ہماری دعوت علمی مقاصد کی راہ میں ہی قبول کرتے ہیں۔

پہلا خطبہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۱۹۸۰ء میں دیا (محمد تقی میر) یہ انجمن سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (اسلوبیات میر)، ڈاکٹر ریاض الحسن مرحوم (جمالیات اور اردو ادب)، ڈاکٹر سید عبداللہ (بابائے اردو کی یاد میں) علمی و فکریاتی ادب کے خطبے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر ریاض الحسن اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے خطبات انجمن سے شائع ہو چکے ہیں۔ انشاء اللہ ڈاکٹر وحید قریشی سے مسودہ موصول ہوتے ہی ان کا خطبہ بھی شائع کر دیا جائے گا..... جناب عزیز حامد مدنی نے خطبہ ماہ مارچ ۱۹۸۸ء میں پیش کیا تھا اور کتابت کی منزل میں ہے۔ انشاء اللہ وہ بھی جلد شائع ہوگا، چوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے زیرِ نظر خطبے (جدید اردو تنقید) کا ایک مسودہ ازراہ عنایت پیشگی بھیج دیا تھا اس لیے انعقادِ اجلاس کے ساتھ ہی اس کی اشاعت بھی ممکن ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا ایک مدت سے اردو تنقید میں ایک مکتب کہلانے لگے ہیں۔ ان کا منفرد اندازِ فکر و نظر ...... اور مؤقف ..... اس خطبے میں بھی جھلکتا ہے جو بنیادی طور پر ایک تحقیقی جائزہ ہے۔ اس سے پہلے اس موضوع اور متعلقہ موضوعات پر چند کاوشیں اردو دانوں کے سامنے آ چکی ہیں اب کہ ڈاکٹر وزیر آغا کا زیرِ نظر خطبہ شائع ہوتا ہے اردو تنقید پر کام کرنے والے اس سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں، لیکن جدت، جدیدیت .... اور خود تنقید ..... کیا ہے۔ اب یہ عنوان بجائے خود بڑے مباحث بن چکے ہیں۔ انجمن کی خواہش ہے کہ جس حد تک ممکن ہو ان موضوعات پر اہم

مباحث کو سمیٹ کر ایک وقیع تدوین شائع کر دی جائے تاکہ اردو دانوں کے لیے کافی یا دو جلدوں میں جمع ہو سکے۔ اس سلسلے میں چند فاضل حضرات سے رجوع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ منصوبہ بھی کسی بڑی تاخیر کے بغیر پورا کر لیا جائے گا۔ مباحث میں اس رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے کہ بعض ...... ں کے اندر اندر فرسودہ ہو جاتے ہیں اب ضروری ہو چکا ہے کہ ہم یا کوئی اور ادارہ ایسے اہم موضوعات پر پہلے جائزوں کے ساتھ تازہ ترین مباحث کا احاطہ کرنا ایک مستقل سلسلے کے طور پر اپنے ذمے لے۔ انگریزی کے حوالے سے آکسفرڈ اشاعت گھر کے ایسے سلسلے عمدہ نمونے فراہم کرتے ہیں۔ یہاں اتنے مالی وسائل نظر نہیں آتے، لیکن کام کرنے والوں کی استعداد..... اور محنت ..... اکثر اوقات مالی وسائل بھی پیدا کر دیتی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے فاضل اہل ادب ایسے منصوبوں پر خصوصی توجہ دینے لگیں۔ انھیں یقین رکھنا چاہیے کہ وسائل خود سامنے آنے لگیں گے..... ہماری ہی مثال سامنے ہے۔ مولوی صاحب کے زمانے میں اور ایک مدت ان کے بعد بھی ہم کمی وسائل کا شکار رہے۔ اردو دوستوں کے تعاون اور انجمن کے سربراہوں جناب اختر حسین (مرحوم) موجودہ صدر انجمن جناب نورالحسن جعفری اور بعض نئے ہمدردانِ انجمن کی مساعی نے وسائل میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر ہی دیا ہے۔ اگر اہلِ علم کا عملی تعاون جاری رہا تو انشاءاللہ اور اضافہ ہوگا.....

زیرِ نظر خطبے پر اس رسمی "حرفے چند" میں نہ تو کوئی تبصرہ ضروری ہے: ممکن ...... اس ضمن میں انجمن صرف انتہائی تشکر اور امتنان کا اظہار ہی کر سکتی ہے۔ ایک اہم موضوع پر ایک ضخیم مقالہ لکھنا، انجمن کو بروقت اس کی نقل (برائے اشاعت) فراہم کرنا اور مقررہ وقت پر (مئی کی شدید گرمی میں) کراچی آکر خطبہ پیش کرنا ڈاکٹر وزیر آغا کی مولوی عبدالحق مرحوم سے عقیدت اور انجمن کے ساتھ تعاون کی نہایت قیمتی نشانیاں ہیں جو ہماری تاریخ کے ریکارڈ پر محفوظ ہو رہی ہیں۔ امید ہے کہ یہ ہمارے دوسرے مہمانوں کے لیے قابلِ تقلید مثالیں بھی ثابت ہوں گی۔

یقین ہے کہ یہ کتاب ایک اہم موضوعِ مطالعہ سمجھی جائے گی۔

(۱۹۸۹ء)


maablib.org

غالب کے خطوط

(جلد اوّل)

مرتبہ
خلیق انجم

پہلا ایڈیشن

بلا تکلف، اردو خطوطِ غالب کی یہ اشاعت نوادرِ حاضرہ میں شامل ہو گئی ہے۔ فاضل مرتب ڈاکٹر خلیق انجم، معتمد انجمن ترقی اردو (ہند)، نے جس توجہ، محنت اور احتیاط کے ساتھ یہ منصوبہ پورا کیا اس کا صلہ انھیں نسل بعد نسل آنے والے قارئین سے ملتا رہے گا۔ انجمن شکر گزار ہے کہ انھوں نے پاکستان میں اس کے اشاعتی حقوق انجمن کو عنایت کیے۔

ترتیب، خطوط اور تنقید سے متعلق صرف چند گزارشات جو تبصرہ نہیں کہ وہ حق مبصرین کا ہے۔ یہ سلسلہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۸۴ء سے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ چوتھا ایڈیشن آنے والا ہے... پاکستانی ایڈیشن ہم اس سال ۱۹۸۹ء سے شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ نے چاہا تو پورا سلسلہ ۱۹۹۰ء کے اواخر تک چھپ جائے گا۔

یہ خطوط جرمن طریق ترتیب کے مطابق کیے گئے ہیں اس کارنامے پر ہندوستان پاکستان کے مستند محققین اور ماہرین غالبیات نے ڈاکٹر خلیق انجم کو جن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے ان پر ہماری طرف سے اضافے کی گنجائش نہیں۔ بعض کے اقتباسات اسی ایڈیشن کے فلیپ پر شائع کیے جا رہے ہیں۔

فاضل مرتب نے خطوط غالب کی پہلی اشاعتوں پر صفحہ ۲۳ سے صفحہ ۵۹ تک اپنی تحریر میں ان پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس میں بیان کردہ حقائق سے تو اختلاف کی گنجائش نہیں، البتہ اندازہ ہے کہ بعض اختلافی آراء پر مبصرین ضرور گفتگو کریں گے۔ بہر حال اس لحاظ سے کہ ہماری معلومات کے مطابق بھی پہلی تمام اشاعتوں کا ذکر ان صفحات پر آ چکا ہے ضروری نہیں رہا کہ ہم ان سطور میں وہ فہرست دُہرائیں۔

گمان غالب ہے کہ ۱۹۸۴ء تک غالب کے جتنے خطوط جمع اور دریافت ہوئے وہ سب ان جلدوں میں آ گئے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس فیضانِ غالب میں اضافے ہونے ہیں۔ جعلی خطوط بنانے کا شوق .... اور زمانہ ...... تو گزر گیا، تلاش اور اتفاق کے سبب جو انکشافات ہو جاتے ہیں ان کا امکان ہمیشہ رہتا ہے۔ ابھی اس سال ماہنامہ "دائرے" کراچی شمارہ ۸-۹ ماہ فروری، مارچ ۸۹ء صفحہ ۲۳۶ پر محترم قدرت نقوی صاحب کا ارسال کردہ ایک غیر مطبوعہ خط شائع ہوا ہے۔ ممکن ہے چند نئے خطوط آئندہ بھی سامنے آئیں (وہ خط اس اشاعت کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے)

یقیناً غالب کے چھپے ہوئے خطوط اتنے ہو چکے ہیں کہ اب دو چار دس بارہ نئے خطوط سے بھی اُن کے ماحول، فکر، حیات و معلومات کے ضمن میں کسی قابلِ ذکر اضافے کا امکان بہت کم رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ اہم ترین بات یہ کہ خطوط غالب کی اوّل اور سب سے بڑی خوبی ان کی ادبی حیثیت تھی اور ہے۔ مزید خطوط اس لحاظ سے کوئی نئی روشنی نہیں دکھا سکیں گے۔ جو سرمایہ ابتدائے اشاعت سے میسر ہے وہ بھی بہت تھا۔ خود پہلی اشاعت کی وجہ، اس کی اہمیت اور ضرورت بھی، بنیادی طور پر تاریخ، حالات، ذاتی واقعات سے متعلق نہیں بلکہ اس کی ادبی حیثیت تھی.... یہ الگ بات ہے کہ بعد میں جوں جوں غالب شناسی میں اضافہ ہوا غالب کی ایک ایک سطر ایک ضرورت اور ناگزیر مطالعہ بنتی گئی .... یہ الگ بات کہ دربارِ رام پور کی خدمت میں صرف رسیداتِ وظیفہ کا انبار کسی مطالعاتی استفادے کا سبب نہیں بن سکا۔ مگر خیر وہ بھی نوشتہ غالب ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا اب ایسے نئے خطوط کی امید نہیں جو اردو نثر غالب کی ادبی حیثیت میں کوئی اضافہ کر سکیں۔ تعداد خطوط کے بارے میں البتہ راقم الحروف اپنی ایک تحریر کو یہاں نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن کی تالیف "غالب کا علمی سرمایہ (دوسرا ایڈیشن بعد نظرِ ثانی ۱۹۸۸ء ...... ناشرین یونیورسل بکس، ۴۰، اے اردو بازار، لاہور) ہے جس کا پیش لفظ لکھنے کا اعزاز راقم الحروف کو حاصل ہوا۔ اس پیش لفظ کے ابواب دوم و سوم ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں؛

"اس موقع پر راقم الحروف ایک بات ریکارڈ پر لانا ضروری سمجھتا ہے۔ اگر یہ ایک ناقابل یقین امر لگے تو راقم بے بس ہے کہ اس کے پاس صرف اپنی آنکھوں اور یادداشت کی شہادتیں ہیں۔

نہ اس نسبت پر فخر ہے، نہ افسوس مگر، راقم کا تعلق خانوادہ لوہارو سے ہے۔ اس خاندان سے غالب کی سببی اور علمی اور محبتانہ نسبت معروف ہے۔ ۱۹۴۲ء میں عمر تقریباً سترہ برس تھی (سیکنڈ ایئر ختم کر رہا تھا) گرمیوں کی تعطیلات گزارنے شملے جاتا تھا۔ کچھ رقم کی ضرورت پڑی، مدد لینے نواب صاحب لوہارو (نواب امین الدین احمد خاں ثانی) کے پاس گیا۔ چند روز وہاں گزارے۔ بچپن سے غالب، غالب سنتا تھا، خاندان کے حوالے سے بھی۔ اب ایک دن لوہارو کے کتب خانے میں بیٹھا کہ کچھ نظر آئے۔ (دوسرے نوادر اور مسودات وغیرہ کا ذکر غیر ضروری ہے)۔ راقم نے غالب کے کوئی ایک سو بیس، بہرحال ایک سو سے زیادہ خطوط فارسی و اردو، دو چھوٹی چھوٹی بوریوں میں بند پائے۔ بوریاں ٹاٹ کی نہ تھیں، موٹے سفید کپڑے کی تھیں۔ تھیلے سمجھ لیجیے۔ وہ یقیناً ایک طرف محفوظ سی رکھی تھیں۔ کتب خانہ بہت چھوٹا تھا، اس کی صفائی ہو رہی تھی۔ میں سب خط نہ پڑھ سکا۔ فارسی تو اس وقت بالکل سمجھ میں نہ آئی، اردو بھی پوری طرح نہ پڑھی گئی کہ اسوقت وہ رسم الخط پڑھنے کی عادت نہ ہوئی تھی، ہاں اکثر مطالب صاف سمجھ لیے۔ غزلیں شاید تھی ہی نہیں کہیں کہیں کوئی شعر فارسی اور اردو کا ضرور آجاتا تھا۔

اردو کے بیشتر خط غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم کے چچازاد بھائی اور والیٔ لوہارو، میرے پر دادا، نواب امین الدین خاں کے نام تھے اور ان میں سے تقریباً سبھی کافی مختصر تھے۔ ان میں اکثر خطوط جوئے والے معاملے سے متعلق تھے۔ مقدمہ لڑنے کے لیے مالی امداد طلب کی گئی تھی۔ جیل کے خطوط بھی تھے۔ جیل کے بعد سخت برہمی کا اظہار بھی تھا ایک دو میں صاف صاف یہ تھا کہ تم نے میری خبر خود آکر نہ لی۔ لوگوں کو بھیجا۔ معلوم ہوتا ہے یہاں سے یہ لکھا جاتا تھا کہ تم نے خاندان کو بدنام کیا وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ ایک میں واضح طور پہ یہ تھا کہ اگر تم بھی مقدمے کی کارروائی کو بیچ سمجھتے ہو اور میری سزا کو حق جانتے ہو اور خاندان کے لیے میری رشتے داری کو بدنامی کا

باعث تو اپنی بہن کو بلالو۔ معلوم ہوتا ہے یہاں سے لکھا گیا کہ اچھا انہیں بھیج دو۔ ایک فرستادہ کا بھی ذکر تھا۔ غالب کا خط کہتا تھا کہ تمھارے آدمی خط لے کر آئے، تمھاری بہن جانے سے انکاری ہیں۔

اردو، فارسی کے کئی خطوط علاء الدین خاں علائی میرے دادا کے نام بھی تھے اور کسی اور بزرگ (غیر خاندانی) کے نام جو اس وقت لوہارو میں رہتے تھے۔ علائی کے نام اکثر خط تعلیمی لگتے تھے مگر ان میں کچھ اذکار خاندانی ضرور تھے۔ اردو کے کئی خطوط میں محض طلبِ زر یعنی صرف طلبِ زر اور عذر گاہ گاہ پر سرزنش، رامپور کی تعریف، مرزا تفتہ اور شیفتہ کی حالیہ اور سابقہ خدمتوں، بطورِ خاص "فتوح" کی تعریف، کچھ احباب کی شکایت، بس مجملاً یاد ہے۔

میں نے ادباً نواب صاحب مرحوم کی توجہ اس طرف دلائی۔ انہیں استحضار نہ تھا۔ اس وقت وہ ایک نوجوان والیٔ ریاست تھے۔ صاحبِ تصنیف ہو چکے تھے۔ (ایک ناول) شعر بھی رسماً یا شوق گاہ گاہ کے طور پر کہہ لیتے تھے۔ (بعد میں آزادی کے بعد بہت لکھا) مگر اُس وقت اُن کا مزاج ادب دوست تو کسی حد تک تھا، اتنا غالب پرست نہ تھا، نہ وہ اتنے روشن خیال تھے۔ انھوں نے سرسری طور پر فرمایا۔ جی ہاں مجھے علم ہے کہ ان خطوط میں کیا ہے۔ ان کی اشاعت ہمارے خاندانی وقار کے خلاف ہے۔ پچھلے زمانے میں بھی جو خطوط آپ کے (میرے) والد اور دادا نے دے دیے دیکھ بھال کر دینے چاہیئے تھے۔ مرزا مرحوم سے ہمارے قبیلے کی ایک خاتون کیا بیاہی، اُن کی تمام فضولیات میں ہمارا خاندان ضرور ملوث ہوتا ہے آپ رہنے دیجیے میں سوچوں گا۔ (نواب امین الدین خاں اول اور اُن کے چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین خاں نیّر درخشاں کی اولاد کے مابین آمدنی کی تقسیم پر تنازعہ رہ چکا تھا۔ اس کے آوازے باہمی شادی بیاہ کے باوجود اُس زمانے تک گشت کرتے تھے نواب ضیاء الدین خاں کی صاحبزادی بگّا بیگم کو غالب اپنی منہ بولی بہو بنا کر لائے تھے)۔

سچ کہ میں بھی نہ تو کوئی حیثیت رکھتا تھا، نہ اس وقت اس موضوع کا اتنا دیوانہ تھا۔ بعد میں ہمارے تعلقات میرے نظریات اور رویّوں کی وجہ سے کسی حد تک ناخوشگوار ہوگئے۔ میرے خیالات بھی بدلتے رہے۔ میں نے اُن سے مزید گفتگو

کی نہ ضرورت سمجھی، نہ جرأت کی۔ پھر ریاست (۱۹۴۷ء میں) ختم ہو گئی۔ وہ جے پور چلے گئے۔ بھاگ کر جانا پڑا، قلعے پر کئی حملے ہو چکے تھے۔ ریاست میں اس وقت (۱۹۴۷ء) کوئی مسلمان نہ رہا تھا، سب بے سر و سامان بھاگ گئے تھے۔

۱۹۵۷ء میں (پہلی بار) ہندوستان گیا۔ اجمیر شریف کی زیارت کرنے اور اُن سے ملنے جے پور پہنچا تو اُن کا مزاج بھی بدل چکا تھا اور میں بھی بڑا ہو گیا تھا۔ ان خطوط کی یاد دلائی۔ فرمایا سارا کتب خانہ رامپور کتب خانہ میں چلا گیا ہے، وہاں زیادہ محفوظ رہے گا۔ لوہارو نہ کوئی آتا ہے نہ جاتا ہے۔ قلعہ بند، محلات تباہ، کتب خانہ تھا ہی کیا، تباہ بھی ہوا اور قلعہ وغیرہ حکومتِ ہند کی تحویل میں آ گیا۔ وہ اُسے دفتر کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ اب آپ ان خطوط کو یاد دلا رہے ہیں تو میں خود رامپور لکھ کر دیکھوں گا، کیا بنا، کیا ہوا۔ اس وقت تک اُن کی صاحبزادی نور بانو نواب رضا علی خاں مرحوم والیٔ رامپور کے چھوٹے صاحبزادے نوابزادہ ذوالفقار علی خاں ممبر پارلیمنٹ کو بیاہی جا چکی تھیں۔ رامپور سے تعلق گہرا ہو گیا تھا۔

پھر اُن سے اس موضوع پر گفتگو تو کیا، کوئی خاص خط و کتابت بھی نہ ہوئی۔ میں ۱۹۸۲ء تک ہندوستان بھی نہ گیا۔ اس دوران میں ہندوستانی فضلا آتے تھے اور ملاقات ہو جاتی تھی تو میں ذکر کرتا تھا۔ مخدومی عرشی صاحب سے خاص طور پر کہا۔ یہ کوئی بیس برس کی بات ہے۔ انہوں نے واپس جا کر مجھے خط لکھا (وہ محفوظ نہیں) کہ انہیں کچھ نہیں ملا۔

۱۹۸۲ء میں مخدومی مالک رام صاحب سے کہا۔ انہوں نے بڑی دلچسپی لی فرمایا کہ اب میں جستجو کروں گا۔ خود نواب صاحب کو یاد دلایا۔ وہ اس وقت پنجاب (ہند) کے گورنر تھے۔ انہیں یاد ہی نہیں رہا تھا۔ فرمایا آپ خود رامپور چلے جائیے اور تلاش کیجیے۔ لیکن یہ گفتگو انہوں نے سرسری سی کی گو دلچسپی بہت دکھائی۔ اب وہ اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ غالب کے وہ خطوط بھی ادب کا ایک عجیب و غریب سرمایہ ہوں گے، اور خاندانی وقار وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر میں نے عرشی زادہ صاحب کو لکھا۔ اُن کا جواب بھی وہی آیا کہ وہ دستیاب نہیں۔ میں رامپور کبھی گیا نہیں۔ اب جاتا بھی تو کیا مل جاتا۔ اب تو وہ کتب خانہ زیرِ تنقیح بھی ہے۔

گویا وہ خط ضائع ہوگئے، ضائع نہ ہوگئے ہوتے تو اب تک کسی نہ کسی کو مل جاتے۔ لیکن یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ غالب کے وہ خط راقم الحروف نے دیکھے ہیں۔ کیوں ضائع ہوئے، اب یہ بحث لاحاصل ہے۔

اپنے چچا سے سُنتا تھا کہ غالب کے سب سے زیادہ عاشق میرے دادا علاء الدین خاں علائی تھے جو اُن کے درس و سخن کے شاگرد بھی رہے، اُن کے بعد میرے والد نواب امیر الدین فرخ مرزا۔ لیکن اُن کے زمانے میں یہ خطوط کیوں عام اشاعت کے لیے نہ گئے۔ اس کی وجہ بھی وہی خاندانی وقار ہوگا جو اُن کے پوتے (اور میرے بھتیجے) نواب امین الدین خان ثانی آخری والیٔ لوہارو کو ملحوظ تھا) واللہ اعلم بالصواب۔ اس ضمن میں اس وقار کی نسبت سے ایک اور واقعہ یہیں ریکارڈ کر دوں کہ بہر حال یہ تمام اشاعت غالب سے متعلق ہے۔

غالب شناس جانتے ہیں کہ غالب نے اپنی سالی کے بیٹے زین العابدین خاں کے دو لڑکے پالے تھے۔ ان میں سے ایک باقر علی خاں کامل تھے۔ ان کی شادی نواب ضیاء الدین خان نیر درخشاں کی صاحب زادی معظم زمانی عرف بگا بیگم سے ہوئی۔ خطوطِ غالب میں ان کا ذکر آتا ہے اور اُن کی بڑی صاحب زادی جندو بیگم کا بھی، جنھیں غالب مرزا جیون بیگ کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ نیر درخشاں کے پوتے نواب شجاع الدین خاں تاباں برادرِ بزرگ نواب سراج الدین خاں سائل سے بیاہی ہیں۔ (بگا بیگم کے نواسے، اُن کی چھوٹی صاحبزادی کے بیٹے، فخر الدین علی احمد مرحوم ایک وقت میں صدرِ ہندوستان ہوئے) آزادی سے پہلے ان بگا بیگم سے پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے ایک تفصیلی انٹرویو لے کر شائع کیا تھا۔ وہ رشتے میں میرے والد کی پھوپھی ہوتی تھیں۔

ہم عید بقر عید پر اُن کے سلام کو جاتے تھے۔ بالکل پھونس ہوگئی تھیں۔ میری شادی کے بعد، غالباً ۱۹۴۵ء میں وفات پائی۔ بصارت تقریباً جاچکی تھی۔ سماعت جارہی تھی، ایک بار میں نے ان سے خوب کھود کھود کر مرزا غالب کی شراب نوشی پر پوچھا۔ (وہ اُن کے آخری زمانے میں بہت چھوٹی عمر میں بیاہ کر آئی تھیں) بہت برافروختہ ہوئیں۔ فرمایا کم بخت میرے سسر کو شرابی کہتا ہے۔ شراب سے کیا

تعلق اُن کا۔

میں نے جوئے اور جیل کا ذکر کیا تو اور بھی جزرو توبیخ کی۔ یقیناً یہ واقعہ، ان کی پیدائش سے بہت پہلے کا تھا اور مرد بزرگوں نے ممکن ہے انہیں نہ بتایا ہو لیکن یہ تو ناممکن ہے کہ دادی اُمراؤ بیگم نے (جو نہایت وفادار بیوی ہونے کے باوجود اپنے ہی خاندان کے ایک فرد، اپنی بہو کے سامنے جو آخر اسی خاندان سے تھیں) کبھی مرزا صاحب کے یہ واقعات بیان نہ کیے ہوں۔

بہر حال میں نے ایک بار سے زیادہ یہ بات چھیڑی (اس وقت، ہیرنگ ایڈز، نہ تھیں مگر ہم ان کے کانوں پر ایک نلکی یا کپی اُلٹی رکھ کر اپنی بات اُن تک خوب پہنچا دیتے تھے) اُنھوں نے کبھی اس امر کی تصدیق نہ کی بلکہ اُلٹا ڈانٹا۔ یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب میں اُنیس برس کا ہو چکا تھا، سب خوب یاد ہے۔

اس ماحول اور ان اقدار میں اگر وہ خطوط، نواب صاحب لوہارو مرحوم نے خود نہیں تو کسی اور خاندانی نے ضائع کر دیے ہوں کچھ عجب نہیں۔

دُہرادوں کہ ان باتوں کا ذکر کئی ہندوستانی (اور پاکستانی) احباب و محققین سے کر چکا ہوں۔ مندرجہ بالا بیان مختلف ادوار میں ہندوستان سے آنے والے کئی محققین و اہلِ علم کے سامنے دیا ہے۔ جناب امتیاز علی عرشی اور جناب عرشی زادہ کو لکھا بھی ہے۔ جن سے ذکر ہوا اُن میں ڈاکٹر نثار فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور ڈاکٹر مختار الدین احمد اور خصوصاً جناب مالک رام صاحب شامل ہیں۔ اپنی سوانح نہ معلوم کب لکھوں، یہ تحریر اسی مقدمے میں سہی۔

کاش مرزا غالب کے وہ خط موجود ہوتے اور ان کا حوالہ، اُن کے علمی سرمائے کے پیشِ نظر جائزے میں جگہ پاتا۔" (اقتباس ختم)

راقم تحقیق کا آدمی نہیں۔ مطالعۂ غالبیات بھی مکمل نہیں ہے۔ جب اس نے یہ مقدمہ لکھا اس کو یاد نہیں تھا کہ چند ایسے فارسی خطوطِ غالب کی اشاعت بھی نہیں ہوئی جو دربار رام پور کو لکھے گئے تھے۔ ابھی جناب کالی داس گپتا صاحب (بمبئی ۱۹۸۸ء) کا مرتبہ اردو دیوان غالب کامل (تاریخی ترتیب سے) دستیاب ہوا تو اس کے

صفحہ ۹۱ سے توثیق ہوئی کہ سیاسی مصالح کی بنا پر بعض فارسی خطوط اشاعت سے روک لیے گئے بلکہ تلف کر دیے گئے۔ آج کے تناظر میں یہ "سیاسی" مصالح کیا ہوں گے۔ کچھ بھی نہیں۔ ریاست رام پور اُس وقت بھی انگریز کے تحت تھی۔ راقم کا قیاس ہے کہ یہ وہ خطوط ہوں گے جن میں غالب نے والیٔ رام پور کو توسیع ریاست یا اضافۂ مناصب کے سلسلے میں کچھ "ماہرانہ" مشورے دیئے ہوں گے (نواب کلب علی خاں سے خط و کتابت کا ایک حصہ اس قیاس کی تائید کرتا ہے)

جن خطوط بنام والیان لوہارو کا ذکر میں نے کیا ہے یقیناً انہیں خود نواب علاء الدین خاں علائی نے روکا ہو گا۔ خود اپریل ۱۸۶۳ء میں غالب کے خط بنام علائی۔۔۔۔ صفحہ ۲۰۲ کی یہ سطریں ملاحظہ ہوں۔

"سنو بھائی! اگر ان خطوط کا تمھیں اخفا منظور ہو اور شہرت تمھارے منافیٔ طبع ہے تو ہرگز نہ بھیجو، قصّہ تمام ہوا۔۔۔۔"

ان سطروں میں گریز کی دو وجوہ نظر آتی ہیں۔ "اخفا اور شہرت کا منافیٔ طبع ہونا۔" گو اس اخفا کی کوئی توضیح و تشریح نہیں ملتی لیکن ظاہر ہے کہ "سیاسی" نہ ہوگی مزاجی اور خاندانی ہوگی اور بہر حال اس ڈانٹ ڈپٹ کے بعد شاگرد نے استاد کو ۳۴ خطوط بھیج ہی دیے تھے۔ جب کہ اس مجموعے میں ۵۸ خطوط شامل ہیں۔ بر سبیلِ تذکرہ، خطوط بنام امین الدین خاں و علاء الدین خاں علائی میں ایک خط بھی ایسا نظر نہیں آتا جس میں کسی نقد "فتوح" یا امداد کی رسید یا ذکر ہو۔ بہت سے خطوط میں مہر و محبت، خوش تعلقی اور کسی قدر معاملات موجود ہیں۔ اندازہ کہ ان بزرگوں نے اپنی بساط بھر موصوف کی خدمت کی ہوگی جس کی رسید بھی گئی ہوگی مگر ایسی خط کتابت کو برائے اشاعت دینا مناسب نہیں سمجھا گیا ہوگا۔ اگر ہوں گے تو نہ جانے وہ اردو فارسی کے کیسے کیسے خوبصورت خزینے ہوں گے۔ آخر مکتوب الیہ کوئی مقتدر فیض رساں "حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت" ہی نہیں بلکہ قرابت دار تھے، ۔۔۔ وہ خطوط یقیناً دلچسپ ہوں گے۔ اسی طرح وہ خاندانی جھگڑوں اور شکایتوں والے خط جن کا ذکر میری دھندلی دھندلی یادوں میں موجود ہیں اشاعت کے لیے نہیں دیے گئے۔ محفوظ پڑے رہے کہ تبرک تھے (اب وہ بھی ادب ہوتے) بعد میں عدم توجہی، اقدار

سے غفلت اور پھر مختلف پریشانیوں نے انھیں محروم اشاعت رکھا۔ شاید اب وہ ہمیشہ کے لیے ضائع ہو چکے ہیں۔ شاید کبھی بازیاب ہو جائیں۔ یہ تعداد کے حوالے سے عرض کرنا تھا۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اس ایڈیشن کے ابتدائی دو سو چودہ صفحات (۱۳ تا ۲۲۸) میں اردو خطوطِ غالب کے بہت سے گوشوں پر جس تفصیل سے روشنی ڈالی ہے وہ بجائے خود ایک کارنامے جیسا مقالہ ہے۔ (۱) متن کی تصحیح (۲) بنیادی نسخہ (۳) تاریخ وار ترتیب (۴) املائے متون (۵) اوقاف کی علامتیں (۶) خطوط غالب کے مختلف ایڈیشنز اور ری پرنٹس (۷) تقابلی مطالعے (۸) املائے غالب کی خصوصیات (۹) تقابلی مطالعے .... تقریباً ستر چھوٹے بڑے اور ذیلی موضوعات کے تحت ایک بڑی دلچسپ گفتگو کی گئی ہے۔ غالب سے پہلے اردو کے نثری سرمائے پر فاضل مرتب کا بیان وسعت موضوع کے لحاظ سے کسی قدر تشنہ ہو کر بھی ایک مفید خلاصۂ تاریخ ہے، یہ قاری کو اسی کتاب (اسی جلد) کے ذریعے وہ بہت سی اہم معلومات فراہم کر دیتا ہے جو دوسری کتابوں اور مقالوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ (اردو نثر کا ارتقا بجائے خود ایک بڑا موضوع تحقیق بن چکا ہے)

فاضل مرتب نے اس ایڈیشن کو تنقیدی قرار دیا ہے اور یقیناً یہ ایک تنقیدی حیثیت بھی رکھتا ہے جس کی گواہی اگلے صفحات دیں گے۔

لیکن یہاں فاضل مرتب کے لیے تمام تر احترام کے ساتھ ہم ایک اور عنصر متعارف کرانا چاہیں گے: وہ یہ کہ غالب جیسے کثیر التحریر تخلیق کار (یا خلاق) پر اس کے صرف ایک شعبۂ فن کسی ایک صنفِ تحریر کے حوالے سے نہ تو اس کا کوئی تجزیہ مکمل ہو سکتا ہے، نہ تنقید، نہ اس کے بارے میں کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے۔ صرف اردو خطوطِ غالب پر ہی تنقیدی نظر ایک بہت ہی اہم .... اور ضروری .... کام سہی ان کی تمام تخلیقات ایک دوسرے سے اتنی گتھی ہوئی ہیں کہ ایک کے ساتھ جستہ جستہ نہیں خاصی تفصیل و تسلسل کے ساتھ دوسری کا حوالہ ناگزیر ہے۔ اگر صرف خطوط ہی کو لینا پڑے تو فارسی خطوط اردو سے اور اردو فارسی سے الگ کر کے دیکھنا کوئی تنہا ضرورت

پوری کرے تو کرے غالب کی شخصیت فہمی میں کمی ضرور رہ جائے گی۔

اس میں شک نہیں کہ انیسویں صدی تک کے اردو ادیبوں میں اب تک سب سے زیادہ کام غالب پر ہوا ہے اور بعض بزرگوں اور معاصرین کی ذہانت، لیاقت اور محنت نے آسمانوں کو چھولیا ہے مگر ....

مؤدبانہ عرض ہے کہ غالب کی طرح مطالعۂ غالب بھی ایک بہت پھیلا ہوا موضوع ہے شاید کبھی نہ سمیٹا جا سکے لیکن اب تک کسی ایک سلسلہ کتب میں بیک وقت غالب کی شخصیت اور فکر کو، وہ بھی ان کے مختلف ادوار کے حوالے سے سمجھنے کے لیے ان کی تمام اردو فارسی تخلیقات (بشمول خطوط و عرائض) مہروں، یہاں تک کہ قول دیگراں، مثلاً مولانا حالی کے بیان کردہ بعض واقعات و لطائف اور قابل ذکر معاملات کا تجزیاتی مطالعہ نظر نہیں آتا۔ ان میں سے تقریباً ہر موضوع پر الگ الگ اور بعض ملے جلے موضوعات پر بڑی بڑی کتابیں آچکی ہیں۔ کوئی ایک کتاب تو ممکن نہیں تھی، لیکن ایک ایسے سلسلہ کتب کا انتظار رہتا ہے جو غالب کی پوری اناٹومی پر مشتمل ہو۔ غالب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت امید دلاتی ہے کہ ہندوستان یا پاکستان میں ایک نہ ایک دن کوئی اہلِ دل فرد یا ادارہ یہ معرکہ بھی سر کر دکھائے گا کہ ہزار بارہ ناخوردہ در رگ تا کست۔

جب تک یہ ممکن نہ ہو ہم چاہیں گے کہ غالب پر اب تک جو لکھا گیا (گو فارسی خطوط، دستنبو، اور مہر نیم روز پر نسبتاً کم لکھا گیا ہے) اس کا انتخاب اس طرح کیا جائے کہ جس حد تک ممکن ہو غالب کے تمام پہلوؤں پر بہت سے فضلائے کرام کی محنتیں جمع ہو جائیں۔ شاید انجمن یہ منصوبہ خود اپنے ہاتھ میں لے۔ ہمت کی نہیں وسائل کی کمی سدِ راہ ہے....

اردو خطوط پر فاضل مرتب کے تنقیدی زاویے نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھے جائیں گے، گو اُن سے پیشتر بعض بزرگوں نے ان پر خاصا روشن کام کر رکھا ہے۔ فاضل مرتب کے کئی پیش رو جن کا ذکر خود انھوں نے کیا ہے۔ عاشقانِ غالب ہو کر بھی ناقدانِ غالب تھے۔ بعض نے غالب کے چند کرداری تضادات کی طرف اشارے کیے ہیں مگر اب تک کسی نے صرف خطوط کی روشنی میں ہی ان کا بھرپور ذہنی تجزیہ

نہیں کیا۔ فاضل مرتب ہمارے زمانے کے آدمی ہیں لب کہ وہ اتنی بڑی اور طویل محنت..... ترتیبِ نو..... سے فارغ ہوئے اور چاروں طرف سے داد بھی سمیٹی شاید اگلے ایڈیشن تک انہی خطوط پر اپنا تجزیاتی مطالعہ مکمل کر کے نئے ایڈیشن میں شامل کر دیں۔ اگر یہ ممکن ہوا (اور یہ اُن کے تنقیدی مطالعے کی توسیع بھی ہوگی) تو ایک علیحدہ کارنامہ ہوگا۔ امید کہ دوسرے اہلِ قلم بھی اسے صلائے عام جان کر نکتہ سرا ہوں گے۔ انجمن تمام وقیع مطالعاتِ غالب کی اشاعت کے لیے تیار ہے۔

برسبیلِ تذکرہ، تمام دنیا میں عظیم شعرا، ادبا، مصوروں، معماروں، فن کاروں کے فن و کردار میں تضادات کا مطالعہ ایک نہایت دلچسپ موضوع بن چکا ہے مگر اردو ادب کے حوالے سے اس موضوع پر کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس ذخیرے میں محض مداحی، محض کردار کشی، پیشگی فیصلے کے مطابق "متوازن" تصویر کشی..... کے نمونے زیادہ ملتے ہیں۔ راقم نے یہ مطالبہ پاک و ہند کی بعض ادبی صحبتوں میں کئی بار پیش کیا ہے۔ اس تحریر کے ذریعے ہر اہلِ نظر کی توجہ اس طرف دلائی چاہے گا، اردو ادب کے حوالے سے اوّلین دو شخصیات غالب اور اقبال ہی سامنے آتی ہیں جن پر اس موضوع کے تحت کام یعنی فن (بشمول فکر) اور کردار (یعنی تمام معلومہ حقائقِ حیات) میں ربط و تضاد کا تجزیاتی مطالعہ ایک جدید اور بہت اہم ضرورت بھی پوری کرے گا اور دوسرے مشاہیر پر ایسی ہی کوششوں کی ہمت افزائی ثابت ہوگا۔ یقین ہے کہ وہ اہلِ قلم جو اس طرف آئیں علم النفس میں درک ضرور رکھتے ہوں گے۔

فاضل مصنف نے "حرفِ آغاز" میں (صفحہ ۱۲) سرسری طور پر ماخذاتِ متن کا حوالہ دیا ہے جب کہ یہ حصہ اور حواشی بجائے خود ایک نہایت قابلِ قدر تحقیقی مقالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ماخذات مجملاً سبھی مرتبین بتاتے ہیں، ڈاکٹر خلیق انجم نے تصریح کے ساتھ بتائے اور حواشی میں تو بعض پورے کے پورے تقابلی مطالعے پیش کر دیے۔ قاری کے لیے یہ حصے بطورِ خاص دلچسپی کا باعث ہوں گے..... ابھی چوتھی جلد ہمارے سامنے نہیں ہے۔ لیکن اس زیرِ نظر جلد کے اس حصے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ چوتھی جلد میں مکتوب الیہ کے حالات، جہانِ غالب، کتابیات اور اشعار کا اشاریہ (اور متن کا اشاریہ بھی) کس شان کے ہوں گے اگر اتنا بڑا کام پاکستان میں ہوتا

توڈاکٹر خلیق انجم کو ڈی۔ لٹ کا اعزاز ضرور پیش کر دیا جاتا۔ امید ہے کہ چوتھی جلد آنے کے بعد ہندوستان کی کوئی نہ کوئی جامعہ انہیں اس اعزاز سے ضرور نوازے گی۔

مگر سچ یہ کہ بڑا کام بجائے خود ایک انعام ہے۔

انجمن خوشی کے ساتھ یہ سلسلہ اردو قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ نہ صرف غالب شناس بلکہ اردو اور ادب عالیہ کے تمام سنجیدہ قارئین اس کی پذیرائی کریں گے۔ ایک بار پھر ہم ڈاکٹر خلیق انجم کا شکریہ ریکارڈ پر لاتے ہیں کہ انھوں نے اس دستاویز کو جو ایک تاریخ بن گئی ہے شائع کرنے کی اجازت بخشی۔ اس صدی میں جدید خطوط پر غالب شناسی کا دور ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے مقالے سے شروع ہوا تھا جو انجمن کے جریدے "اردو" (جنوری ۱۹۲۱ء) میں شائع ہوا۔ یہ اشاعت غالب شناسی کے سلسلے میں جو اہمیت رکھتی ہے وہ ان چار جلدوں سے ثابت ہوگا۔ پاکستان میں انجمن سے ڈاکٹر خلیق انجم کا تعاون ڈاکٹر بجنوری کی یاد بھی تازہ کرتا ہے اور امید بھی دلاتا ہے کہ پاک و ہند کے اردو اہلِ قلم، انجمن ترقی اردو پاکستان کو بطورِ خاص غالب کے سلسلے میں اوّل توجہ کا حقدار جانیں گے۔

(۱۹۸۹ء)

اردو اور ہندی کے

جدید مشترک اوزان

(ایک تقابلی جائزہ)

ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی

پہلا ایڈیشن

یقیناً یہ کتاب اس موضوع پر اردو میں اب تک سب سے زیادہ جامع مجموعہ معلومات و مباحث ہے، انجمن ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی کی نہایت ممنون ہے کہ انھوں نے اسے پاکستان میں اس کی اشاعتی حقوق عنایت کیے۔ اس کے بالاستیعاب مطالعے سے نہ صرف اردو اوزان کے بعض مسائل پر گہری روشنی پڑتی ہے، بلکہ ہماری دوسری زبانوں، پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی اور گجراتی میں استعمال ہونے والی بہت سی بحروں اور لوک گیتوں کے خوبصورت زیر و بم کی بہتر تفہیم بھی آسان ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر گیان چند جین صاحبان کے فاضلانہ مقدمے (جو اس کتاب میں شامل ہیں) تجزیہ و فکر کے لیے بڑا قیمتی مواد فراہم کرتے ہیں۔

کتابیات اور اشاریے خاصے کی چیزیں ہیں۔ کتابیات صفحہ ۳۴۵ تا ۳۵۶ اور اشاریے (اشخاص، بحور، چھند) ایسے انتخاب اور ریاضت کی گواہی دیتے ہیں جو آج کل پی۔ ایچ۔ ڈی مقالوں میں بھی کم یاب ہیں.... اشخاص، بحور اور چھند کے اشاریوں میں تو اکثر معلومات ایسی ملیں گی جو اردو میں غالباً پہلی مرتبہ اس مربوط طریقے پر آئی ہیں۔

یہاں مبحث کے متعلق کوئی بحث ممکن نہیں۔ تحقیق و تنقید اکثر متنازعہ فیہ موضوعات رہتے ہیں۔ تحقیق پر تو ڈاکٹر گیان چند جین کی سند کافی ہے۔ تنقید پر تنقید کا میدان البتہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی کی آرا پر بحث وہ کرے جو کم از کم تین زبانوں، فارسی، اردو اور ہندی میں کافی دست گاہ رکھتا ہو.... ہمیں ان کی تنقیدی کاوش نہایت معیاری لگی۔ وہ کسی سے شدید اختلاف کرتے ہوئے، آج کی روایت کے خلاف، کوئی تکلیف دہ رویہ اختیار نہیں کرتے۔

شعرا اور قارئین کو اس کتاب میں "سبق در سبق" ایسا قیمتی مواد بھی ملے گا جو بڑی بازیافتوں کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس "حرفے چند" کو ایک ہی صفحے پر ختم کرنا ہے کیوں کہ کتاب چھپ چکی ہے اور شرکائے کار نے حرفے چند کے لیے صرف ایک ہی صفحہ مخصوص کر دیا۔ ایک گزارش بہرحال کرنی ہے، اوزان اپنی اصل میں سلیبس ہیں۔ توازنِ اصوات کے مختلف نظام یا آواز کے ارتعاشات کی تہ در تہ مقداری تقسیمیں..... آخری تجزیے میں وزن اور موسیقی ایک ہی کمیت کے دو نام ہیں۔ بس اس کیفیت کو مختلف ثقافتوں نے کمیت کے فارمولوں میں بدل دیا ہے (گویہ فارمولے غیر مختتم ثابت ہو رہے ہیں اور یہ بھی ہے کہ صرف "موزونیِ طبع" کی وہبی نعمت ان میں مستثنیات کی گنجائش بھی پیدا کر دیتی ہے) مقداری پیمانوں کی ہمہ جہت ناگزیر افادیت اپنی جگہ اس "چیزے دگر" کا مقام کم نہیں بلکہ میری ناچیز رائے میں بلند تر ہے۔

ارسطو نے موسیقی کی تعریف کرتے ہوئے شکوہ کیا تھا کہ "موسیقی" کا اصول طبیعی NATURE متعین کرنا آسان کام نہیں۔ ساتھ میں ایک ٹالنے والی بات بھی کہہ دی (اسی فقرے میں) "نہ یہ طے کرنا آسان ہے کہ کوئی علم موسیقی کیوں حاصل کرے" شکر ہے کہ آج تک یہ دونوں مشکلات برقرار رہیں۔ کنفیوشس اور افلاطون موسیقی کو (ہم موسیقی کی جگہ شاعر بھی رکھ سکتے ہیں) اخلاقیات کا ایک تقریباً لازمی شعبہ قرار دیتے تھے شاید وہ شرائط، وہ تلقین، وہ موقف آج بھی بڑی حد تک زندہ ہیں ورنہ انسان جانور بن جائے یا دیوانہ ہو جائے۔ امید ہے کہ یہ کتاب شعرا ناقدین اور متعلقہ قارئین کے لیے ایک ضروری اور دلچسپ دستاویز ثابت ہوگی۔

(۱۹۸۹ء)

مولانا صلاح الدّین احمد

(شخصیت اور فن)

مرتبین
ڈاکٹر وزیر آغا
ڈاکٹر انور سدید

پہلا ایڈیشن

مغرب میں تو روایت خاصی پرانی ہے کہ علم و ادب کے شعبے میں مستند شخصیات اور کارکنوں کو ان کی زندگی میں ہی یادگاری گلدستے پیش کیے جائیں..... ہمارے ہاں مردہ پرستی کی روایت بھی بڑی مشکل سے قائم ہوئی......

ایسے گلدستوں کو انگریزی میں PRESENTATION VOLUME کہا جاتا ہے۔ ان میں نہ صرف ممدوح پر مضامین شامل ہوتے ہیں، بلکہ ان موضوعات پر بھی جن سے ممدوح کو خصوصی دلچسپی ہو۔

زیرِ نظر اشاعت کے مندرجات صرف مولانا صلاح الدّین احمد مرحوم سے متعلق ہیں اور آخر میں خود ان کے چند نوادرات....

انجمن مولانا مرحوم پر ڈاکٹر وزیر آغا کے بابائے اردو توسیعی خطبے کا ایک اجلاس بھی منعقد کر چکی ہے۔

تکلف بر طرف، مولانا صلاح الدّین احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر حمید احمد خاں اردو کے تین ایسے مجاہد تھے جن سے زیادہ جدوجہد، اردو کے لیے، پاکستان کی حد تک صرف بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ہی کی ہے۔ مولانا مرحوم نے تو فروغِ ادبِ اردو کے لیے خود بھی ایک ادارے کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور "ادبی دنیا" جیسا ادارہ بھی قائم کر دیا تھا جس کی تاریخ خود ایک بڑی تاریخ ہے۔

ان کے متعلق زیرِ نظر کتاب میں کسی قدر تشنگی کے باوجود اتنا مواد ہے کہ راقم الحروف کوئی اضافہ نہیں کر سکتا..... تشنگی یہ کہ ان کے پسندیدہ موضوعات سے متعلق خصوصی مضامین موجود نہیں۔ اس طرح اسے روایتی معانی میں ایک یادگاری گلدستہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے اس کا نام بھی مولانا صلاح الدّین احمد۔ شخصیت اور فن رکھا گیا ہے۔

ہمیں علم نہیں کہ اب تک مولانا پر کسی جامعہ کے زیر اہتمام کوئی مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی منظور ہو کر شائع ہوا یا نہیں۔ (شائع ہوا ہوتا تو ہمارے علم میں بھی آجاتا۔) اگر منظور ہوا ہے تو کسی گشتی فہرست کی عدم موجودگی میں اس کا پتہ ہونا مشکل ہے۔ چند برس قبل، غالباً ۱۹۸۳ء میں، وفاقی وزارتِ تعلیم کے ایک اجلاس میں طے ہوا تھا کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن مقررہ وقفوں سے تمام پاکستانی جامعات کے منظور شدہ مقالات برائے پی۔ ایچ۔ ڈی کی فہرست شائع کیا کرے گا۔ اس فیصلے پر تاحال عمل نہیں ہوا۔ ہمیں یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ مولانا پر کسی جامعہ میں اس سطح کا کام ہوا ہے یا نہیں (گو کہ آج کل ایسے مقالات میں بیشتر کی شہرت موضوعی ہوتی جاتی ہے کہ کام کرنے والے پُرانوں کی طرح محنت نہیں کرتے) بہر حال اس کتاب کو پیش کرتے ہوئے بھی کہ ایک بہت خوب صورت اور مستند انتخاب بن چکی ہے انجمن اس پر مطمئن نہیں کہ اہلِ ادب اردو نے مولانا کو ان کی شان کے مطابق خراجِ عقیدت پیش کر دیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا ایک ایسے بڑے، بسیط اور مستند محقق اور مسلسل مقالے یعنی ایک مربوط کتاب تحقیق کے مستحق ہیں جو ابھی لکھی نہیں گئی۔ مولانا نے اردو اور ادبِ اردو کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی..... ان کے ان کارناموں کا پس منظر کیا تھا..... انھیں کیسے کیسے مسائل و مشکلات سے گزرنا پڑا۔ معاشرے اور حکومتوں کے ہاتھوں کیا کیا مصائب پیش آئے، اپنا مسلسل مالی نقصان کس طرح برداشت کرتے رہے..... ان کے کام کی افادیت کتنی پھیلی ہوئی ہے۔ بہت کچھ..... یہ سب ایک سوانحی مطالعے اور پھر ادبی نقد و تجزیہ طلب کرتا ہے وہ آج نہیں تو کل ضرور ہوگا.....

انجمن ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کی ممنون ہے کہ انھوں نے اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر ہمارے لیے یہ انتخاب کر دیا۔ انجمن اس اشاعت کو مولانا کی خدمت میں ایک معمولی ہدیۂ عقیدت کی حیثیت سے پیش کر رہی ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ ایک دن اسی کو مولانا پر ایک بھرپور کتاب شائع کرنے کی سعادت حاصل ہوگی۔ انشاء اللہ.....

(۱۹۸۹ء)

سیف الملوک

مصنف

میاں محمد بخش

ترجمہ اور مقدمہ

شفیع عقیل

پہلا ایڈیشن

انجمن نے اردو کے خزانوں میں مغربی، روسی اور چینی ترجموں کی روایت قائم کی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں قدیم یونانی مورّخ پلوٹارک سے منتخب سوانح کا ترجمہ ایک عظیم الشان سنگ میل تھا۔ پھر یہ سلسلہ پھیلتا ہی رہا۔ اسے پاکستان میں انجمن کی تنظیم نو کے بعد ہم نے نہ صرف دوبارہ چھاپا ہے بلکہ جن سوانح کا ترجمہ نہیں ہوا تھا انہیں بھی شامل کر دیا ہے۔ اس سلسلے کا نام ہے "مشاہیر یونان و روما"۔

ہمارے تراجم کا یہ سلسلہ خاصا طویل ہے۔ ہماری فہرست مطبوعات تفصیلات بتاتی ہے۔ یہاں وہ سب دُہرانے کی ضرورت نہیں۔

پاکستان آکر انجمن حکومتوں اور خود اپنے بعض نظماء کے ہاتھوں جن مسائل و مصائب میں مبتلا رہی ان کے سبب یہ کام بھی آگے نہیں بڑھنے پایا۔ ان مسائل و مصائب کا کسی قدر ذکر خود بابائے اردو کے کتابچے "انجمن کا المیہ" میں موجود ہے۔

بابائے اردو کے انتقال (۱۹۶۱ء) اور تنظیم نو کے بعد، جو ۱۹۶۲ء میں ہوئی، بابائے اردو کے مرتب کردہ خطوط کی رہنمائی میں دیگر اہم منصوبوں کے علاوہ اس منصوبے پر بھی دوبارہ کام شروع ہوا۔ اس مرتبہ ہم نے زیادہ توجہ پاکستانی زبانوں کے ادب پر دی، جنھیں قومی زبان کے ذریعے تمام پاکستانیوں کے سامنے پیش کر دینا قومی یکجہتی کی سمت میں ایک اہم اقدام بھی ہے اور پاکستانی زبانوں کی تحقیقات کو دوسرے مقامات کے اردو دانوں سے متعارف کرنے کی ایک کوشش بھی۔ اس سلسلے میں اب تک ہم نے مندرجہ ذیل تراجم شائع کیے ہیں۔

(۱) پشتو شاعری (پشتو سے)

(۲) موج موج مہران (سندھی سے)

(۳) پنجابی کے پانچ قدیم شاعر (پنجابی سے)

اور اب میاں محمد بخش کی شہرہ آفاق مثنوی "سیف الملوک" کا ایک نیا ترجمہ پیش کر رہے ہیں، جسے جناب شفیع عقیل نے بڑی محنت اور احتیاط کے ساتھ کیا ہے۔

جناب شفیع عقیل کی کتابیں بڑی تعداد میں ہیں مثلاً:

(۱) چینی لوک کہانیاں (۲) جاپانی لوک کہانیاں (۳) پنجابی کے پانچ قدیم شاعر۔ واضح رہے کہ یہ کتاب "سیف الملوک" از میاں محمد بخش کا حرف بہ حرف ترجمہ نہیں۔ مکمل مثنوی بقول مترجم نو ہزار دو سو ستر اشعار پر مشتمل ہے۔ فاضل مترجم نے بعض مقامات کی تلخیص کی ہے لیکن اس طرح کہ واقعات کم نہ ہوں، مثنوی کا تسلسل نہ ٹوٹے اور مضامین کا احاطہ بخوبی ہو جائے۔ اس موضوع پر خود مترجم نے اپنے مقدمے میں گفتگو کی ہے۔

ہماری فرمائش پر فاضل مترجم نے ہر مصرعہ کا ترجمہ الگ کرنے کی بجائے پورے شعر کا ترجمہ کیا ہے۔ اس طریقے کی خوبیاں بدیہی ہیں۔ ادبی ترجموں کا مقصد قاری کو لغت اور صرف و نحو کی تعلیم دینا نہیں ہوتا، بلکہ ترجمے کے ذریعے اصل کا مطلب اور لطف واضح کرنا ہوتا ہے۔

مصنف میاں محمد بخش اور مثنوی کے متعلق فاضل مترجم جناب شفیع عقیل کا مقدمہ جو بجائے خود ایک تحقیقی مقالے کی حیثیت رکھتا ہے، خاصے کی چیز ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب اس عظیم تصنیف سے جو پاکستانی ادب میں کلاسیک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اردو دانوں کو پورے پورے استفادے کا موقع دے گی۔

(۱۹۸۹ء)

جدید اردو شاعری

(بابائے اردو یادگاری لیکچر مارچ ۱۹۸۸ء)

عزیز حامد مدنی

پہلا ایڈیشن

انجمن ایک منصوبے کے تحت ہر سال جنوبی ایشیا کے مشاہیر اردو سے بابائے اردو یادگاری خطبات کا انتظام کرتی ہے۔ ارادہ ہے اس سلسلے میں جنوبی ایشیا سے باہر کام کرنے والے اہلِ اردو کو بھی شامل کر لیا جائے گا۔ وہاں مستند اہل الرائے کی اتنی کمی نہیں کہ چند خطبوں کی دعوت بھی نہ جا سکے۔ افسوس ہمارے وسائل سدِّ راہ ہیں۔

اب تک مندرجہ ذیل موضوعات پر مندرجہ ذیل حضرات نے خطبے پیش کیے جو انجمن شائع بھی کر چکی ہے:

سال	موضوع	صاحبِ خطبہ
اگست ۱۹۸۰ء	محمد تقی میر	ڈاکٹر جمیل جالبی
فروری ۱۹۸۲ء	جمالیات او. اردو ادب	ڈاکٹر ریاض الحسن
اگست ۱۹۸۲ء	اردو کا علمی و فکریاتی ادب	ڈاکٹر سید عبداللہ
اپریل ۱۹۸۴ء	اسلوبیاتِ میر	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
مئی ۱۹۸۸ء	تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا

بابائے اردو مرحوم کا ایک مرغوب موضوع جدید اردو ادب بھی تھا۔ اس سلسلے میں خود انھوں نے کئی کتابیں لکھوائیں اور ایک جامع منصوبہ بھی بنایا جو پوری طرح شرمندہ تکمیل نہ ہو سکا کیوں کہ دوسری اور ہنگامی ترجیحات سامنے آ جاتی تھیں۔

جدید اردو شاعری جدید اردو ادب ہی کا ایک حصّہ ہے۔ اس موضوع پر جنوبی ایشیا اور خود پاکستان میں بہت سی کتابیں اور مقالے آتے رہتے ہیں مگر موضوع اتنا ...... وسیع ہے کہ اس پر ہر اچھا تاریخی مطالعہ اور اچھا تجزیہ اپنی جگہ علیحدہ بنا لیتا ہے۔ جناب عزیز حامد مدنی اردو شاعری (جدید اردو شاعری) کا ایک بہت معتبر حوالہ ہیں، اور وہ نہ صرف شاعر ہیں بلکہ ایک نہایت گہرا مطالعہ کرنے والے نقاد بھی .....

جو، کا علم مشرق و مغرب دونوں کی روایات اور نئی سے نئی تخلیقات کا احاطہ کرتا ہے۔ ہم نے سال ۱۹۸۸ء کے لیے جدید اردو شاعری پر جناب عزیز حامد مدنی سے خطبہ دینے کی درخواست کی تھی۔ وہ انھوں نے قبول کر لی اور ایک بلیغ خطبہ پیش کیا۔ انجمن یہ خطبہ شائع بھی کرتی ہے۔ اسے بھی اشاعت کے لیے مانگا لیکن ان کا خیال تھا کہ تعین وقت کے سبب ان کے افکار ظاہر نہیں ہو سکے اور بہتر ہوگا اگر اس خطبے کو مناسب توسیع کے بعد چھاپا جائے۔ توسیع میں کافی وقت لگا۔ جب مسودہ ہم نے دیکھا تو پایا کہ اس کی ضخامت ہماری محدودات سے بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ ہماری گزارش پر، گو کسی قدر زحمت کے ساتھ، مدنی صاحب نے ضخامت کو خاصا کم کر دیا ہے۔ پھر بھی اسے دو جلدوں میں چھاپنا پڑ رہا ہے۔ زیر نظر اس کتاب کی پہلی جلد ہے۔ گو اپنی جگہ یہ بھی ایک بڑا قابل قدر مطالعہ و تجزیہ ہے۔

عنوان "جدید اردو شاعری" قدم قدم پر اختلافی نقطہ ہائے نظر سے دو چار ہوتا ہے۔ یہ مسائل بھی بار بار ہمارے سامنے آتے ہیں کہ خود شاعری کیا ہے اور اس میں جدید کیا کیا معنی رکھتا ہے۔ (بحمد اللہ لفظ اردو اس تناظر میں کسی قابل ذکر اختلاف کا شکار نہیں ہوتا)۔ بہت سے مکاتب فکر ہیں جو ایک دوسرے سے ٹکراتے اور ایک دوسرے سے آمیز ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ایک زندہ و تازہ موضوع ہے جو ہماری فکر و ثقافت پر تو اثر انداز ہوتا ہی رہتا ہے، انشاءاللہ ایک دن عالمی ثقافت کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور اس سے شیر و شکر ہونا لازمی ہوگا ...... اردو شاعری بہر حال دنیا کی تیسری سب سے بڑی زبان کی شاعری ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی مگر بہ حیثیت ناشرین ہم نے واضح کر دینا مناسب جانا کہ مدنی صاحب موضوع کی تاریخ و تفاصیل سے متعلق ایک اپنا نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ جس سے اختلاف ممکن بھی ہے اور ہر ایک کا حق بھی۔ لیکن اس سے تعرض ہمارا حق نہیں۔ ہمارا کام تو تھے اہم موضوع پر ایک نہایت اہم تصنیف پیش کر دینا ہے۔ اب

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

انشاءاللہ دوسری جلد بھی مستقبل قریب میں شائع ہوگی ..... انجمن جناب عزیز حامد مدنی کی محنت ..... اور ضخامت کے معاملے میں خصوصی تعاون ...... پر ان کی شکر گزار ہے ......

(۱۹۹۰ء)

مرزا اسد اللہ خاں غالب

دیوانِ غالب (کامل)

تاریخی ترتیب کے ساتھ

مرتبہ

کالی داس گپتا رضا

پہلا ایڈیشن

غالب کا دیوان کامل۔ اردو کسے کہا جائے گا.... اُسے جس میں تاہم اشاعت غالب کی تمام دستیاب اردو شاعری آجائے۔

اور نسخۂ حمیدیہ کے بعد اب تک جو اردو کلام دریافت ہوتا رہا اس زیر نظر کتاب میں پوری تحقیق کے بعد شامل کر لیا گیا ہے۔

نسخۂ امروہہ سخت متنازعہ فیہ بن چکا ہے۔ مستند محققین نے اسے اس کی ترتیب کے ساتھ باطل بھی قرار دے دیا ہے اور وہ یوں بھی مکمل نہیں تھا۔ کیوں کہ اس متن کے بعد غالب کی بہت سی غزلیں اس میں شامل نہیں....

ہر لحاظ سے زیر نظر اشاعت غالب کا پہلا مکمل اردو دیوان ہے۔

جناب کالی داس گپتا رضا نے غالبیات میں جو اختصاص حاصل کر لیا ہے وہ سب غالب پسندوں اور اہل تنقید و تحقیق پر روشن ہے۔ زیر نظر کتاب میں چند نہایت معتبر محققین کی آرا شامل کر دی گئی ہیں جو انھوں نے جناب رضا اور اس اشاعت کے بارے میں دے رکھی ہیں۔ ان کی موجودگی میں جناب رضا کے لیے راقم الحروف جیسے کم مایہ کے تعریفی کلمات کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ ہاں راقم الحروف اپنی اور انجمن کی طرف سے اس کا بے حد شکریہ ریکارڈ پر لانا ضروری سمجھتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے پاکستان میں اس کتاب کے اشاعتی حقوق انجمن کو راقم کی ذاتی درخواست پر عنایت فرمائے۔ یہ اُن کا ایک ذاتی احسان بھی ہے اور انجمن سے اردو کے ناتے مخلصانہ علمی تعاون کی ایک درخشاں مثال بھی۔ ہم ان کی ایک نئی تصنیف "غالب، اندرون خانہ" کے حقوق بھی حاصل کر چکے ہیں جو انشاءاللہ عنقریب شائع ہوگی۔

غالب ہمارا ایک بہت بڑا فکری، ثقافتی اور تہذیبی اثاثہ بن چکے ہیں جس کی بڑھتی ہوئی شناخت اور تفہیم نئے سے نئے فکری خزانوں کی جھلکیاں دکھاتی ہیں۔

ساتھ ہی وہ عالمی ادب کے حوالے سے بھی ایک تقابلی مطالعہ طلب کرتے جاتے ہیں ......ایک تخلیقی فرد کی حیثیت سے بھی، جس نے عالمِ جوانی بلکہ بالکل نوجوانی میں ہی فکر و فن کی بعض نظر نہ آنے والی بلندیوں تک کو بار بار چھو رکھا ہے...... اس کتاب کے اولین ابواب کا مطالعہ آج کے اچھے اور عالمی ادب سے خوب واقف قاری کو ایک عالمِ حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے...... ایک نوجوان شاعر جس نے باقاعدہ تعلیم بھی نہیں پائی، جس نے بیرونِ دہلی اور آگرہ صرف ایک ہی بار سفر کیا، وہ بھی کلکتے تک جسے کشائشِ روزگار نے خستہ کر رکھا تھا، دربار کی سرپرستی بھی میسر نہ تھی، جو بظاہر فکرِ مغرب سے بھی واقف نہیں۔ وہ اردو جیسی زیرِ تشکیل زبان میں مسلسل کتنی بڑی اور خوبصورت شاعری کر گیا.... جی ٹی اُس کی جو بھی تعریف ہو غالب اس پر ضرور پورے اُترتے ہیں..... اور، جیسا کہ عرض کیا گیا، دنیا بھر کے شعرا و ادبا سے گہرے اور تفصیلی مطالعوں کے مستحق!

نسخۂ حمیدیہ دستیاب نہیں۔ کوئی اور مکمل۔ "دیوانِ غالب" (اردو) موجود نہیں۔ زیرِ نظر کتاب کی ترتیبِ متن جناب کالی داس گپتا رضا جیسے مُستند ماہرِ غالبیات کے ہاتھوں ہوئی ہے (اُن کا مقدمہ بطور خاص ایک ضمانت کی حیثیت رکھتا ہے) اس تناظر میں یہ کتاب ہماری..... اور اردو کی..... اہم ترین تازہ اشاعتوں میں شامل ہو جاتی ہے۔

اُمید ہے کہ شائقین اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

(۱۹۹۰ء)

البیرونی

سیّد حسن برنی (مرحوم)

تیسرا ایڈیشن


MAAB 1431
maablib.org

یہ حرفے چند، روایت کے خلاف، کسی قدر طویل ہو گا۔ شاید ناگزیر طور پر۔ "ساختیات" کا ایک مکتب کہتا ہے کہ لکھنے والا نہیں لکھتا، تحریر اپنے آپ کو خود لکھواتی ہے.... کتاب ایک ایسے نابغۂ روزگار کے بارے میں ہے، جس سے مشرق و مغرب گیارہویں صدی عیسوی کو منسوب کرتے ہیں۔ صاحبِ کتاب ایک نہایت فاضل، جامع کمالات اور محنتی شخصیت........ اولین اشاعت کے بعد کئی دیگر مساعیِ تحقیق کا منظرِ عام پر آنا........ اس تحریر کو کئی وجوہ سے "حروفِ بسیار" میں بدل رہی ہیں........

ہماری قاموس الکتب کی جلد اول اُن اردو کتابوں کی فہرست ہے جو موضوع تاریخ پر لکھی گئیں۔ یہ خود مولوی صاحب کی نگرانی میں تیار ہوئی تھی، مگر مکمل آزادی کے بعد ہوئی........ تقسیم و آزادی سے پہلے بھی ہندوستان میں کوئی سرکاری یا مستند غیر سرکاری انتظام ایسا نہیں تھا جس کے تحت اردو میں چھپنے والی تمام کتابوں کی فہرست شائع ہوا کرتی .... یہاں پاکستان میں کاپی رائٹ قانون مجریہ ۱۹۶۲ء کے تحت قانونی پابندی تو ہے کہ ہر ناشر اپنی کتاب کی ایک ایک جلد تین قومی کتب خانوں میں مفت داخل کرے (تاکہ ایک جامع فہرستِ کتب مرتب ہو کر چھپتی رہے) مگر تا حال متعلقہ دفعہ عملاً نافذ نہیں۔ (وجوہ کئی ہیں۔ بنیادی وجہ حکومت کی نااہلی........) اس پس منظر میں قطعیت کے ساتھ تو دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ "البیرونی" پر سید حسن برنی مرحوم کی یہ کتاب اردو کی قدیم ترین........ اور تاحال واحد........ مبسوط تصنیف ہے لیکن دستیاب معلومات کی بنا پر یہی اندازہ ہوتا ہے........

اور یہ بڑی حیرت........ اور افسوس........ کی بات ہے۔ البیرونی جیسا مستند و مسلم، نابغۂ روزگار، اس صدی کے دوسرے نصف سے اردو میں دوسرے

بڑے بڑے علمی، ادبی، تاریخی کاموں کا انجذاب، بطورِ خاص پاکستان میں قدیم و متوسط ادوار کے مسلمان سائنس دانوں، مفکروں، فلسفیوں اور سیاحوں پر بڑی اہم اور ضخیم کتابوں کا تصنیف و مرتب ہونا، "البیرونی" کی اہمیت مسلسل بڑھتے جانا .... اور پھر بھی اردو میں اس پر کسی دوسری مبسوط کتاب کا شائع نہ ہونا .... یہ ایک عجیب صورت حال ہی کہلا سکتی ہے ....

اس طرح زیرِ نظر کتاب اور صاحبِ کتاب سید حسن برنی مرحوم کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، لیکن! یہ صرف قدامت اور کتاب کی "واحدیت" کا مسئلہ نہیں، خود کتاب کے مندرجات بتائیں گے کہ اس صدی کی دوسری دہائی میں جب فاضل مصنّف کو ماخذات اور وسائل صرف مقامی طور پر میسر تھے کس لیاقت، ذہانت اور محنت سے یہ تحقیقی .... اور تنقیدی کارنامہ سرانجام دیا گیا .... بعد کے چند تحقیقی اضافوں اور مباحث کی بات الگ ہے (اور ان کا ذکر آگے آتا ہے) اس کتاب کی تنقیدی شان آج تک برقرار ہے۔ نہ صرف برقرار ہے بلکہ راقم الحروف کی ذاتی رائے میں بے مثال ہے۔ برسبیل تذکرہ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی دور بینی اور ہمت دیکھیے کہ یہ اشاعت انجمن کی اولین اشاعتوں میں شامل ہے (پہلا ایڈیشن ۱۹۱۵ء سلسلۂ مطبوعات انجمن میں دوسرے ایڈیشن ۱۹۲۷ء کا شمار دسواں) ....

۱۹۷۳ء میں کراچی نے "البیرونی" پر ایک بین الاقوامی کانگریس دیکھی (اس کا ذکر آگے ہے) اس کانگریس نے متفقہ طور پر یہ تجویز منظور کی کہ برنی صاحب کی (زیرِ نظر) کتاب کو انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع کیا جائے۔ (اتفاق سے تادم تحریر کوئی انگریزی ترجمہ شائع نہیں ہو سکا ہے) اس کانگریس نے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ "البیرونی" پر اردو میں کوئی ایسی مبسوط کتاب موجود نہیں ہے۔ ۱۹۷۳ء کے بعد بھی (یعنی آج ۱۹۸۹ء تک) یہی صورتِ حال برقرار ہے۔

سید حسن برنی مرحوم ضلع بلند شہر (یوپی) کے ایک نامور وکیل اور علی گڑھ سے ایک بڑے مشہور فارغ التحصیل تھے۔ زیرِ نظر کتاب کے علاوہ ان کے بہت سے مقالات بھی موجود ہیں۔ کچھ جرائد وقت میں شائع شدہ اور خاصی تعداد میں غیر مطبوعہ ہیں، ان میں سے ۲۵ مقالات پر مشتمل ایک پوری کتاب ہم نے بعنوان "مقالاتِ

برنی" ۱۹۸۶ء میں شائع کی تھی۔ دوسری جلد کی اشاعت ہمارے منصوبوں میں شامل ہے۔ "مقالاتِ برنی" کی یہ جلد ہندوستان میں ابتدائی مسلم دور سے متعلق ہے۔ برنی صاحب "دورِ سلطنت" میں اختصاص رکھتے تھے۔ ان کے موضوعات کی فہرست درج ذیل ہے جس سے ان کی وسعتِ مطالعہ کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ برنی صاحب کے مختصر حالات اور کارناموں کی ایک مختصر فہرست اس (زیرِ نظر) اشاعت کے فلیپ پر موجود ہے۔

جب سید صاحب نے یہ کتاب پہلی بار مکمل کی ان کی عمر سترہ سال تھی۔ وہ ماخذات اور رہنمائی کے لیے ہندوستان سے باہر نہیں جا سکے۔ نظرثانی کے بعد کتاب ۱۹۲۷ء میں چھپی (زیرِ نظر اشاعت ۱۹۲۷ء کے ایڈیشن پر ہی مبنی ہے) اس وقت کا ہندوستان قیاس کیجیے۔ پہلے ایڈیشن کے وقت تک یونیورسٹی بنی نہیں تھی (۱۹۱۵ء) اور دوسرا ایڈیشن مرتب ہونے کے زمانے میں (۱۹۲۰ء) یونیورسٹی مکمل نہیں تھی اس کا کتب خانہ وہ نہیں تھا جو بعد میں بنا........ پڑھے لکھے مسلمان نوجوانوں کی بیشتر تعداد اس وقت بھی شعر و شاعری اور زیادہ سے زیادہ افسانہ نویسی کی طرف جا رہی تھی۔ ایسے عالم میں ان کا اتنا بڑا کام کر جانا آج کے محققین اور مصنفین کے لیے بڑے بڑے ہمت افزا سبق رکھتا ہے۔ البیرونی عالمی کانگریس کراچی (۱۹۷۳ء) نے برنی مرحوم کو جو خراجِ تحسین پیش کیا وہ ان کی محنت اور نظر پر ایک تاریخی سرٹیفکیٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

راقم تحقیق کا آدمی نہیں، اور یہ حرفے چند تحقیقی نوعیت کا ہے بھی نہیں، ایک کسی قدر تفصیلی تعارف ہے۔ البیرونی کی عظمت اور سید حسن برنی مرحوم کی فضیلت کا جس کے لیے جو مواد بآسانی جمع کیا جا سکتا تھا، جمع کر لیا گیا........

اندازہ ہے کہ اب البیرونی کا تعارف ہماری آٹھویں جماعت کے نصاب سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ صوبہ سندھ کی نصابی کتاب "معاشرتی علوم" درجہ ہشتم میں اس کا ذکر پونے دو صفحات پر باب سات میں مسلم سیاحوں کے ساتھ آتا ہے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم کی ایک کتاب ہے "فلسفیانِ اسلام" ناشر ہیں شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔ اس میں بھی اس کا حوالہ موجود ہے .... اور اب ایک

خراجِ تحسین بہ حدِ ادب ....

سب سے زیادہ اہم مقالہ جامعہ پنجاب کے زیرِ اہتمام ہمارے عظیم علمی کارنامے "اردو معارف اسلامیہ" (جلد ۵)، سالِ اشاعت ۱۹۷۱ء، صفحہ (۳۶۱ تا ۳۶۹) پر شائع ہوا ہے۔ یہ جناب محمد فضل اللہ بن قریشی (و ادارہ) کی کاوش ہے جو اس بڑے سائز کی کتاب میں پورے نو صفحوں پر گئی ہے۔ صفحات ۳۶۹ تا ۳۷۱ پر وہ سینکڑوں (بیشتر مغربی) ماخذات و کتب حوالہ درج ہیں جن سے اس نہایت قیمتی مقالے میں استفادہ کیا گیا ہے۔ مقالہ تحقیقی اور بیانیہ تو ہے ہی لیکن اس میں بحث و تنقید کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ اس لیے حیرت ہے کہ اس میں سید حسن برنی مرحوم کی اس عظیم الشان کاوش کا کوئی کریڈٹ مطلوبہ انداز سے نہیں آیا۔ اگر یہ ایک دانستہ علمی فیصلہ تھا تب بھی محلِ نظر ہے اگر فروگذاشت ہوئی تو باعثِ حیرت .... برنی صاحب کی کتاب نایاب سی پاکستان، کراچی کے ایک مشہور کتب خانے (کتب خانہ خاص، انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ، کراچی) میں ۱۹۳۹ء سے موجود ہے اور وہاں اندرون و بیرونِ پاکستان سے ہر سال سینکڑوں اہلِ تحقیق حوالے تلاش کرنے آتے ہیں۔

بہر حال ہم اس مقالے کی فہرستِ ماخذات چھوڑ کر اس کا متن درج ذیل کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں جو اپنی جگہ ایک بڑی حیثیت رکھتا ہے اور اہلِ نظر اُس کا سالِ اشاعت اور اس کتاب کا سالِ اشاعت، دونوں ادوار میں حصولِ ماخذات کی سہولتیں اور مؤلفین کے وسائل (سید حسن برنی تنہا تھے) سامنے رکھتے ہوئے چند موازنے کر سکتے ہیں اور البیرونی کے متعلق اور اس سے منسوب بہت سے افکار اور بعض انکشافات پر ایک نوجوان کم وسائل مصنف سے تقابلی مطالعہ بھی۔ سید حسن برنی کی فضیلت، محنت .... اور اولیت .... کے کریڈٹ کم نہیں نکلتے۔

(اقتباس شروع ....)

البیرونی

"البیرونی کے حالاتِ زندگی کے ماخذ بہت محدود ہیں۔ اس ضمن میں اس کی اپنی تحریریں مسامیر خوارزم (جس کا نام یاقوت نے معجم الادبا میں کتاب المسامرہ فی اخبار خوارزم لکھا ہے) اور تاریخ سلطان محمود وا بیہ لب ناپید ہیں۔ اول الذکر کا کچھ حصّہ ابوالفضل بیہقی کے قلم سے ہم تک پہنچ سکا ہے۔ (البیرونی کے ایک مکتوب سے بھی، جو اس نے ۴۲۷ھ میں اپنے ایک دوست کو اپنی اور ابوبکر الرازی کی تصانیف کے بارے میں لکھا تھا) اس کے سوانح حیات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ مکتوب مع اس کی شرح کے، جو ابراہیم التبریزی (م ۶۹۲ھ / ۱۲۹۳ء) نے قلم بند کی تھی، لائڈن کی کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ اصل رسالہ M۔ KRAUSE کے زیرِ اہتمام ۱۹۳۶ء پیرس میں چھپ بھی چکا ہے۔ اسی طرح ایک قصیدے میں، جو اس نے ابوالفتح البستی کی تعریف میں لکھا ہے۔ اس کے حالات کے متعلق بعض لطیف اشارے ملتے ہیں) البیرونی کا اپنا طرزِ بیان استادق، مختصر، پُر مغز اور مسلہ دریپش پر حاوی ہے کہ اس کا سمجھنا ایک مبتدی کے بس کی بات نہیں، اس لیے ہر کس و ناکس کی دسترس اس تک نہیں ہو سکتی۔ ابن خلکان نے البیرونی کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ البیرونی کی وفات کے دو ڈھائی سو سال بعد کی تحریریں غلو سے لبریز ہیں۔

زمانۂ حال میں جس مغربی مصنّف نے اس کے حالاتِ زندگی پر سب سے پہلے قلم اٹھایا ہے وہ المانوی فاضل ایڈورڈ زخاؤ E۔C۔ SACHAU ہے، جس نے البیرونی کی دو کتابوں، تحقیق ماللہند ALBERUNI S INDIA لندن ۱۹۱۰ء اور الاثار الباقیہ

THE CHRONOLOGY (VESTIGES OF THE PAST) OF ANCIENT PEOPLE

کی تدوین اور انگریزی میں ان کے تراجم کی اشاعت کی ہے (لیکن جب تحقیق ماللہند کا زخاؤ نے ترجمہ کیا تو البیرونی کی اس کتاب کا پورا مخطوط اس کے پیش نظر نہ تھا، اس لیے یہ دراصل اس کے محض ایک حصے کا ترجمہ ہے۔ اس کے نزدیک البیرونی فکری اعتبار سے دنیا کا بلند ترین انسان تھا۔) البیرونی کے حالاتِ زندگی جو کچھ بھی ہمیں

ب تک معلوم ہوئے ہیں وہ اس کی اپنی تصانیف میں یا توضمناً اس نے خود بیان کیے ہیں یا اس کی تحریرات و مشاہداتِ فلکی کے سنین پر مبنی ہیں۔ جیسے جیسے اس کی کتابیں معرضِ ظہور میں آ رہی ہیں، اس جلیل القدر مصنّف کے تبحر، جدتِ طبع، حق جوئی اور حق گوئی کا پتا دیتی ہیں۔

اس کا پورا نام برہان الحق ابو الریحان محمد ابن احمد البیرونی ہے۔ السمعانی نے اپنی کتاب الانساب میں اس کے نام البیرونی کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس کی سکونت شہر کے بیرونی حصے میں تھی، اس لیے عام طور پر البیرونی مشہور ہو گیا۔ (نیز دیکھیے یاقوت، جو یہی وجہ تسمیہ بیان کرتا ہے، لیکن صاحب عیون الانباء نے لکھا ہے کہ یہ نسبت سندھ کے ایک قصبے بیرون کی طرف ہے) جو خوارزم کے پائے تخت کاث میں ۳ ذوالحجہ ۳۶۲ھ / ۴ ستمبر ۹۷۳ء کو ایک گمنام گھرانے میں پیدا ہوا۔ (کاث اب دریا برد ہو چکا ہے اور اس کی جائے وقوع روسی (سوویت) ترکستان کے شہر خیوا پر تھی اور اب یہ البیرونی کا شہر کہلاتا ہے) (منجم ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد التبریزی الغضنفر (المولود ۶۳۰ھ / ۱۲۳۱ء) نے البیرونی کے حالاتِ زندگی سے اس کی پیدائش کے گھنٹے اور منٹ متعین کیے ہیں) البیرونی نے اپنے اساتذہ میں سے صرف ابو نصر منصور ابن علی بن عراق کا ذکر کیا ہے، جو پرانے خوارزم شاہی خاندان کا ایک فرد تھا۔

البیرونی نے اپنی زندگی کے پہلے پچیس سال خوارزم شاہی خاندان کی خدمت میں گزارے۔ جب ۳۸۵ھ / ۹۵۵ء میں وہ تیئیس برس کا تھا تو ابو عبداللہ محمد خوارزم شاہ اور محمد بن ماموں کے مابین، جس کا پائے تخت گرگنج (یا ہند ارگنج۔ جرجانیہ) دریائے جیحون کے اُس پار تھا، لڑائی چھڑ گئی۔ اس میں محمد بن ماموں کامیاب ہوا اور البیرونی کو نقل مکانی کر کے جرجانیہ آنا پڑا، لیکن اسے وہاں بھی ٹھہرنا نصیب نہ ہوا اور وہ کچھ عرصہ قید و بند کی سختیاں جھیلتا اور حوادثِ زمانہ کے تھپیڑے کھاتا ہوا آبائی وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ۳۸۷ھ / ۹۹۷ء میں اس نے ماژندران یا طبرستان کے اسپہبذ مرزبان رستم بن شروین کے دربار میں رسائی حاصل کر لی اسی اسپہبذ کے نام پر اس نے اپنی سب سے پہلی تصنیف مقالید علم الہیئۃ مایحدث فی

بسیط الکرۃ معنون کی ہے۔ لیکن اسی سال اسپہبذ مذکور اور فخرالدولہ بویہی کے انتقال پر حالات کچھ ایسے ناسازگار ہو گئے کہ البیرونی اپنے نئے وطن کو بھی خیر باد کہنے پر مجبور ہو گیا اور نہایت خستہ حالت میں شہرری میں رہنے لگا۔ ۳۸۸ھ میں جب زیاری سلطان قابوس بن وشمگیر سترہ سالہ جلاوطنی کے بعد طبرستان میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت پر قابض ہوا تو البیرونی کو پھر اپنے نئے وطن میں لوٹ کر آنے کا موقع مل گیا۔ جہاں اس نے اپنی دوسری تصنیف الآثار الباقیۃ عن القرون الخالیۃ، اس علم پرور اور عالم فرماں روا کے لیے (۳۹۰-۳۹۱ھ/۱۰۰۰-۱۰۰۱ء میں) لکھی۔ وشمگیر کی خواہش اور اصرار کے باوجود البیرونی کا قیام جرجان میں زیادہ عرصہ نہ رہ سکا اور ۳۹۲ھ/۱۰۰۲-۱۰۰۳ء میں سات سال کی جلاوطنی کے بعد اپنے آبائی وطن میں علی بن مامون کے دربار میں پہنچا اور ۳۹۷ھ/۱۰۰۶-۱۰۰۷ء میں اس شہزادے کے انتقال کے بعد اس کے بھائی مامون کے سایۂ عاطفت میں رہنے لگا، لیکن ۴۰۷ھ/۱۰۱۷-۱۰۱۸ء میں جب یہ شہزادہ اپنی ہی فوج کے سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا تو یہ ملک سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ/۱۰۳۱ء) کے قبضے میں آ گیا، جس کی بہن مقتول شہزادے کے عقد میں تھی۔ محمود نے مامون کے لشکر کو شکست دے کر اپنے سردار التونتاش کو وہاں کا گورنر بنا دیا اور خود غزنہ واپس چلا گیا۔ البیرونی بھی دوسرے ارکانِ شاہی کے ساتھ اپنے تین ہمراہیوں یعنی ابو نصر منصور بن علی ابن عراق، ابوالخیر خمار اور عبدالصمد اوّل سمیت غزنہ پہنچ گیا (اس وقت اس کی عمر پینتالیس سال تھی۔ اس سے پہلے بھی البیرونی غزنہ دیکھ چکا تھا، جب اسے سلطان خوارزم کی طرف سے بطور سفیر یہاں بھیجا گیا تھا)

غزنہ پہنچنے کے بعد البیرونی کی علمی زندگی کا زریں دور شروع ہوتا ہے۔ یہاں اس نے اپنی کتاب تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن مرتب کی۔ اس کتاب کا واحد نسخہ غالباً اس کے اپنے قلم کا ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء کا لکھا ہوا دستیاب ہو چکا ہے۔ البیرونی نے اپنی زندگی کے غالباً بارہ تیرہ سال شاہی نگرانی میں ہندوستان میں گزارے۔ اس اثنا میں اس نے یہاں سنسکرت بھی سیکھی اور ہندو مذہب، تہذیب و تمدن، رسم و رواج، عادات و توہمات کا مطالعہ کیا۔ یہ معلومات اس نے ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں اپنی شہرہ آفاق کتاب تحقیق ماللہند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل او مرذولۃ میں

درج کی ہیں۔

اس نے ایک سال قبل یعنی ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں اپنی تصنیف کتاب التفہیم لاوائل صناعتہ التنجیم ریحانہ بنت حسن خوارزمی کے لیے لکھی۔ اس کی کتاب مالاہند اس وقت پایہ تکمیل کو پہنچی جب سلطان محمود کا ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں انتقال ہو چکا تھا، لیکن جب اس کا بیٹا مسعود اپنے بھائی محمد سے کچھ عرصہ نبرد آزمارہ کر تخت سلطنت کا وارث ہوا تو البیرونی اپنی شاہکار تصنیف القانون المسعودی فی الہیئتہ والنجوم، جو ریاضی وہیئت، علم احکام النجوم اور جغرافیے پر ہے، مرتب کر چکا تھا، چنانچہ اس نے اپنی یہ تصنیف سلطان مسعود کے نام پر معنون کی۔

البیرونی ہندوؤں کے علوم کا اس قدر دلدادہ اور شوقین تھا کہ وہ اپنی بیشتر تصانیف میں نہ صرف ان علوم کا بالتفصیل ذکر کرتا ہے بلکہ اس نے وراہا میرا VERAHA MAHIRA کی دو تصانیف برہت سہتا اور لاگھو جاتکم اور برہم گپتا کی برہم اسپھٹ سدھانت اور کتاب پاتنجلی (سنسکرت) کا پاتنجلی فی الخلاص من الارتباک کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بھگوت گیتا کا بڑا مداح تھا اسی کی تتبع میں اس نے کپلا کی سانکھیا کا ترجمہ عربی میں اور بطلمیوس کی کتاب المجسطی، تحریر اقلیدس اور اپنی کتاب صنعت اسطرلاب کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ (بجیانند بنارسی کی) جیوتش پر ایک کتاب کرن تلک کا، جس کا حال ہی میں انکشاف ہوا ہے، اس نے غرۃ الزیجات (یا غرۃ الازیاج) کے نام سے نہ صرف تحت اللفظ ترجمہ کیا ہے بلکہ اس کے نفس مضمون کی اپنی طرف سے مثالیں دے کر وضاحت بھی کی ہے (غرۃ کا مخطوطہ کتاب خانہ شاہ پیر محمد، احمد آباد میں موجود ہے) بالآخر البیرونی نے (جو، اپنے ہاتھ کو قلم سے، آنکھ کو دیکھنے سے اور دل کو فکر سے کبھی خالی نہیں رکھتا تھا" (یاقوت) غالباً غزنہ ہی میں (بروز جمعہ ۲ رجب ۴۴۰ھ/(۱۱ ستمبر) ۱۰۴۸ء کو (بعمر ۷۷ سال، ۷ ماہ) داعی اجل کو لبیک کہا، لیکن اپنی کتاب الصیدلتہ (۔ الصیدنتہ) کے مقدمے میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے: میری عمر اسی سال قمری سے متجاوز ہے (اس لحاظ سے اس کا سال وفات ۴۴۲ھ ہوگا) اس کے شاگرد ابو الفضل سرخسی کا بیان ہے کہ میں نے شیخ کی ایک کتاب کے حاشیے پر یہ عبارت دیکھی ہے کہ وہ جمعے کی شب بوقت عشاء ۲

رجب ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء راہیِ ملکِ عدم ہوگیا۔ وفات کے وقت کا ایک حیرت انگیز واقعہ فقیہ ابوالحسن علی بن عیسیٰ الولوالجی نے بیان کیا ہے: "میں ابوریحان کے پاس گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دم توڑ رہا ہے۔ اسی حال میں اس نے مجھ سے کہا کہ تم نے ایک روز جداتِ فاسدہ (نانیوں کی وراثت) کا مسئلہ مجھے کس طرح بتایا تھا میں نے ازراہِ شفقت کہا کہ کیا میں تمھاری اس حالت میں بتاؤں؟ اس نے جواب دیا: "میں اس مسئلے کو جاننے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے اس مسئلے کو دہرایا اور اس نے یاد کر لیا۔ اس کے بعد میں اس سے رخصت ہوا اور ابھی میں راستے ہی میں تھا کہ میں نے اس کی وفات پر رونے پیٹنے کی آواز سنی۔"

البیرونی کی فضیلت اور اس کا علمی مرتبہ: البیرونی اسلام کے عظیم عالموں اور محققوں میں سے ہے۔ وہ اپنی آزاد خیالی، ادبی جرأت، تحقیق، بیباک تنقید اور اصابت رائے میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی ہمہ گیری، اس کے مذاق کا تنوع اور پھر اس پر اس کے علم کی گہرائی بے نظیر ہے۔ اس کی تنقیدی روح اور طرزِ بیان سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی زمانۂ حال کا مصنف ہے۔ اس کی یہ خوبی بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ بہت سی زبانوں کا ماہر تھا۔ اس کی مادری زبان سعدی یا خوارزمی ہے، جو ایرانی کی ایک شاخ بتائی جاتی ہے، جسے وہ کسی علم کے اظہار کے ناقابل پاتا ہے۔ وہ صرف عربی زبان کو اہل سمجھتا ہے۔ وہ اپنی کتاب الصیدلۃ (الصیدنۃ) میں یوں رقمطراز ہے: "دنیا کے جملہ ممالک کے علوم عربی میں منتقل اور ہمارے دلوں میں راسخ و جاگزیں ہو گئے ہیں اور اس زبان کی خوبیاں ہمارے رگ و ریشے میں پیوست ہو چکی ہیں، اگرچہ سب قوموں کی نظر میں ان کی اپنی زبانیں جو ان کے ہاں رائج ہیں اور جن کے وہ عادی بن چکے ہیں اور جن میں وہ اپنے ہم عصروں اور ہجولیوں سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں، خوب صورت اور بھلی نظر آتی ہیں، اس کا اندازہ میں اپنی ذات سے کرتا ہوں۔ میں اپنی زبان کا خوگر ہو چکا ہوں، جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی علم اس زبان میں مستقل طور پر محفوظ کر لیا جائے تو یہ ویسا ہی عجیب و غریب نظر آئے گا جیسا کہ کسی نالی میں گرا ہوا اونٹ، یا یوں کہیے کہ ایک زرافہ جو شریف النسل عرب گھوڑوں میں مل جل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں فارسی و عربی

کی طرف مائل ہوا ہوں اور ان دونوں میں میری حیثیت ایک اجنبی اور دخیل کی سی ہے اور مجھے ان کے استعمال میں اچھی خاصی دشواری پیش آتی ہے۔" اس نے اپنی کتاب التفہیم عربی اور فارسی میں لکھی ہے۔ ان زبانوں کے علاوہ وہ سنسکرت اور یونانی بھی جانتا تھا اور سریانی اور عبرانی زبانوں میں قدرے مہارت رکھتا تھا۔

البیرونی بیک وقت سیاح، ریاضی داں، ماہر فلکیات، جغرافیہ داں اور مورخ، معدنیات، طبقات الارض اور خواص الادویہ کا ماہر اور آثار قدیمہ کا عالم تھا۔ وہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں نظر آتا ہے، حتیٰ کہ اس کے استاد ابو نصر منصور اور رفیق کار ابو سہل المسیحی نے، جس سے اس کی ملاقات غالباً جرجان میں ہوئی، فرداً فرداً اس کے نام پر اپنی کئی مختلف نظریات پر مرتبہ بارہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مشہور طبیب و فلسفی ابو علی ابن سینا سے کئی مرتبہ مختلف اوقات پر اس کے مناظرے ہوئے۔ ان سے متعلق متعدد رسائل ہم تک پہنچے ہیں۔ البیرونی نے ارسطو کے فلسفے پر مبنی "سما اور طبیعیات" پر کوئی اٹھارہ سوال ابن سینا پر کیے ہیں اور اس کے جواب خاطر خواہ نہ پا کر خود ان کے جواب الجواب لکھے ہیں۔ ابو سہل ویجن بن رستم الکوہی، ابو الحسن کوشیار الجیلی، محمد بن اللیث ابوالجود، ابو محمود الخجندی، ابو سعید احمد بن محمد عبدالجلیل السجزی اور ابوالوفاء محمد بن محمد البوزجانی سے مختلف علمی مسائل پر اس کی خط و کتابت رہی ہے۔ ایک مرتبہ کشمیر کے ہندو فضلا نے اس سے دس سوالات کیے، جن کا اس نے خاطر خواہ جواب دیا۔ ان سب باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے "مقدمہ تاریخ علوم"

INTRODUCATION TO THE HISTORY OF SCIENCE

کا مصنف جارج سارٹن حق بجانب تھا کہ وہ چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر اور پانچویں صدی کے نصف اول کو ابن سینا کے بجائے البیرونی کے نام پر نامزد کرے۔

ابن سینا کے ارتفاع قمر سے طول البلد دریافت کرنے کے طریق پر بحث کرتے ہوئے البیرونی لکھتا ہے کہ یہ مقصد تک پہنچنے کا ایک اجتہادی طریقہ ہے، جو سہل ہے اور جو حد امکان سے باہر نہیں، مگر یہ کہ ابو علی باوجود اپنی تیزی فہم و فراست اور جدت طبع کے اس مسئلے میں ناقابل اعتبار ہے، اس کی تحقیق تنقید پر مبنی ہے اور خاص کر امر زیر بحث کی تلاش کے لیے۔ البیرونی اسی مسئلے کے متعلق ایک دوسری جگہ

لکھتا ہے کہ جرجان کا طول اس کے قریب ہے جو ابو علی سینوی نے اپنے ایک خط میں زرین کیس بنت شمس المعالی کو لکھا ہے اور یہ کہ ابو علی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

علم المثلثات میں اس کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے: ایک دائرے میں منتظم نو اور دس اضلاع کی شکل کھینچنا اور اسی طرح دس اضلاع کی شکل کھینچ کر ۳۰ اور ۳۶ درجے کے زاویے بالمقابل وتر دریافت کرنا ہے اور اسے دو مرتبہ نصف کر کے ایک درجے کا وتر اور نصف اور چوتھائی درجے کی جیب دریافت کرنا اور اس پر جدول الجیوب کی بنیاد رکھنا، دائرے کے محیط و قطر کی نسبت .. کا تعین درجے اعشاریہ تک صحیح اندازہ کر لینا، جیوب و اظلال کے شمار کا قاعدہ اور دوسرے درجے کے فرقوں سے واقفیت اور خانہ پُری ضابطہ (INTERPOLATION FORMULA) جو آگے چل کر جیب کی قدر میں تفاعل (FUNCTION) کی ایجاد کا باعث ہوا اور اس سلسلے میں ایک عام قاعدے کی پیہم تلاش و جستجو اور سب سے بڑھ کر کروی مثلثات کے دریافت شدہ ضوابط کی مدد سے کروی ہیئت کے مسائل کا حل کر لینا جو اعلیٰ درجے کی جدت پسندی و اختراع و ابداع کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس طرح زاویوں کی جیب و ظل کے جداول میں دائرے کے نصف قطر کو اکائی قرار دینا اور دوسرے درجے کے فرقوں کا استعمال خاص طور پر قابلِ ذکر مسائل ہیں۔ سمت قبلہ کی دریافت کا ایک صحیح و سہل طریقہ اور اس کے لیے کروی سطح کی سطح مستوی پر تسطیح بھی اس کی ایجاد ہے۔

حساب میں ہندوؤں کے طریقۂ شمار و اعداد کی وضاحت یعنی اکائی، دہائی، سیکڑہ، ہزار وغیرہ کا تخیل اور ان کا استعمال قابلِ قدر ہے۔ شطرنج میں ہندسی سلسلۂ اعداد (GEOMETRICAL PROGRESSION) کی مدد سے ۱۸۴۴۶۷۴۴۰۷۳۷۰۹۵۵۱۶۱۹ -۱ (۲۱) کلیے کی دریافت، صرف پرکار کی مدد سے ایک زاویے کو تین برابر حصوں میں تقسیم کرنا اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کا حل (جو مغرب میں "مسائلِ بیرونی" کہلاتے ہیں) قابلِ تعریف ہے۔ عرض البلد اور طول البلد سے سطح ارضی پر فاصلوں کی پیمائش اور اس کے برعکس عرض البلد اور طول البلد کی دریافت کا عمل سب اسی کے طفیل ہم تک پہنچا ہے۔

اپنی کتاب استیعاب الوجوہ الممکنۃ الخ میں وہ ابو سعید السجزی کی اصطرلاب زورقی کے ذکر میں لکھتا ہے: "مہندسین اور علما نے ہیئت میری تحریر پر طعنہ زن نہ ہوں کیوں کہ حرکت شبانہ روز کو خواہ وہ حرکتِ ارض کے باعث ہو خواہ حرکتِ سماء کی وجہ سے، دونوں صورتوں میں ان کے حساب میں کوئی فرق نہیں آسکتا اور یہ مسئلہ ایسا ہے جو بالآخر طبیعیین ہی حل کر سکتے ہیں۔" یہ ایک ایسی محیر العقول پیش گوئی ہے جس کی تصدیق صدیوں کے بعد فوکے کے رقاص (FOUCAULT PENDULUM) کی حرکت سے ہوئی۔

بعض حالیہ تذکرہ نگاروں نے قلعۂ نندنہ (تلہ بالا ناتھ، ضلع جہلم، پاکستان) پر البیرونی کی پیمائش قطرِ ارض کو اس طرح بطور موجد منسوب کیا ہے جو صحیح نہیں، چنانچہ اپنی کتاب التحدید الخ میں، جو ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء میں اس نے تصنیف کی، وہ لکھتا ہے: "بعینہ اسی طریقے سے مامون نے زمین کا قطر دریافت کیا تھا (ورق ۲۴۱، مخطوطۂ فاتح) علاوہ بریں یہ طریقہ عملی طور پر زیادہ صحیح نہیں۔ بحوالہ کتاب اصطرلاب وہ خود کہتا ہے۔ "زمین کا قطر دریافت کرنے کا یہ طریقہ قابلِ تصور اور مبنی بر دلائل ہونے کے باوجود بمشکل قابلِ عمل ہے۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ جس مقدار کے ناپ پر یہ مبنی ہے وہ بے حد چھوٹی ہے اور اس کے لیے جو آلات استعمال کیے گئے ہیں وہ بھی اپنی قامت میں چھوٹے ہیں اس لیے اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خود کہتا ہے: میں نے یہ طریقہ محض مامون کے زمانے کی ایک درجہ عرض البلد کی پیمائش کے متعلق دو مختلف روایتوں کے آزمانے کے لیے اختیار کیا تھا۔" ان میں سے اس نے حبش بن الحاسب کی بیان کردہ قدر (۵۶ میل) سے اتفاق کیا ہے۔ (ISLAMIC CULTURE اپریل ۱۹۲۹ء)۔ علامہ اقبال ریاضی کی اصطلاح "تفاعل" (FUNCTION) کے تصور پر البیرونی کی ایجاد کا حال ڈاکٹر ضیاء الدین کی زبانی یوں بیان کرتے ہیں: "البیرونی نے اپنی کتاب "قانون مسعودی" میں نیوٹن کے ضابطۂ خانہ پری (INTERPOLATION FORMULA) کو مثلثاتی تفاعل کی قدروں کے ناپنے میں استعمال کیا ہے، جیسے اس نے اپنے جدول جیوب میں ان زاویوں کے لیے دیا ہے جو ۱۵ دقیقے کے وقفے پر ہیں۔ اس نے اس خانہ پری ضابطے کا

ہندسی ثبوت بھی دیا ہے۔ آخر میں وہ لکھتا ہے کہ یہ برہان ہر تفاعل کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، جو اصل کے گھٹنے بڑھنے پر گھٹتا اور بڑھتا ہے۔ اس نے تفاعل کی اصطلاح کا ذکر نہیں کیا، لیکن اس تصور کا عمومی اطلاق بتایا ہے جو مثلثاتی تفاعل ہی تک محدود نہیں۔

اٹھارہ جواہر اور دھاتوں کی کثافتِ اضافی کی صحیح صحیح قدروں کی دریافت بھی البیرونی نے کی ہے۔ آواز کی رفتار کے مقابلے میں روشنی کی رفتار حد درجے تیز ہے اس حقیقت کی نقاب کشائی بھی اسی نے کی ہے۔ اسی طرح قدرتی چشموں اور مصنوعی زیرِ زمین چشموں (ARTESIAN WELLS) سے پانی کے اپنے آپ اوپر اُبھر آنے کی توجیہ آج کل کے مائی سکونیات (HYDROSTATIS) اصولوں پر کرنا اسی کا نام ہے۔ خرقِ عادت تولید کا مسئلہ، جس میں سیامی توام (SIAMI TWINS) کا مسئلہ بھی شامل ہے، اسی کا بیان کردہ ہے۔ پھول کی پنکھڑیوں کا شمار ۳، ۴، ۵، ۶ یا ۱۸ ہونا اور کبھی ۷ یا ۹ نہ ہونا اسی کا مشاہدہ ہے۔ دریائے سندھ کے طاس کا کسی زمانے میں زیرِ آب ہونا اور زمانۂ مابعد میں اس کا مٹی اور ریگ سے پُر ہو کر زرخیز میدانوں میں تبدیل ہو جانا اسی کی دریافت ہے۔ سمندر کے پانی کے نمکین ہونے کی توجیہ اسی کے ذہنِ رسا کا حصہ ہے۔

ہندوؤں کے علوم و فنون، ان کے رسم و رواج، تمدن و تہذیب اور مذہب و فلسفہ میں اس کی نظر ایسی گہری ہے جس کے مقابلے میں ہیون سانگ، میگس تھینز اور ابن بطوطہ کے سفر نامے بچوں کے لیے لکھی ہوئی کہانیوں کے مترادف ہیں۔ مغربی مستشرقین اسے ہندوستان کے دروازے پر افلاطون (PLATO) مسلمانوں کا بطلیموس (PTOLEMY) یا اپنے زمانے کا پلینی (PLINY) اور لیو نارڈو ونسی (LEONARD DE VINCI) اور لائب نتز (LEIBNITZ) شمار کرتے ہیں۔

زخاؤ آثار الباقیہ اور کتاب الہند کے دیباچوں میں لکھتا ہے کہ البیرونی کی تصانیف میں اس کی تحقیق کی وسعت اس قدر ہے کہ اس کے بیان کے لیے کئی نسلیں درکار ہوں گی۔ ۱۸۷۸ء سے اب تک اس کی کئی تصانیف معروضِ ظہور میں آچکی ہیں، لیکن اس کام کے پورا ہونے کے لیے نہ معلوم کتنا عرصہ اور درکار ہوگا۔

البیرونی کی قومیت اور اس کا مذہب

مغرب و مشرق کے سب مستشرقین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ ایرانی النسل تھا۔ بعض حلقوں میں اس بات کے ثابت کرنے کی بیکار کوشش کی گئی ہے کہ وہ ترک نسل سے تھا، کیوں کہ قرائن و شواہد اس کے برعکس ہیں۔ وہ ایک فراخ دل، قومی عصبیت سے ماورا، سچا راسخ العقیدہ مسلمان تھا، جو تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور تھا۔

البیرونی کی تصنیفات

پروفیسر زخاؤ نے وہ خط جو البیرونی نے طبیب محمد بن زکریا الرازی کی کتابوں کے متعلق اپنے کسی دوست کو (۴۲۷ھ/۱۰۳۵-۱۰۳۶ء) لکھا ہے، شائع کیا ہے۔ اس میں اس نے اپنی ان تصانیف کی فہرست دی ہے جو وہ اس سنہ (پینسٹھ قمری سال کی عمر) تک لکھ چکا تھا، ان کی تعداد ایک سو تیرہ ہے۔ ان کے علاوہ وہ کتابیں ہیں جو ابونصر منصور بن علی بن عراق نے اس کی طرف منسوب کی ہیں ان کی تعداد بارہ ہے۔ اسی طرح وہ کتب جو ابو سہل عیسیٰ بن یحییٰ المسیحی نے اس کے لیے لکھیں ان کی تعداد بھی بارہ ہے۔ ایک کتاب ابو علی الحسن ابن علی الجیلی نے اس کی طرف منسوب کی۔ یہ کل ملا کر ایک سو اڑتیس کتب ہوئیں: (لیکن اس تعداد میں اس کتاب القرعتہ المشتہ لاستنباط الطالع الحسنتہ کی تشریح جو خود البیرونی نے شرح مزامیر (مصامیر) القرعتہ المشتہ کے نام سے لکھی تھی، شامل نہیں۔ اس طرح اس کی مصنفہ کتب کی تعداد ایک سو اننتالیس ہو جاتی ہے۔ اسی طرح فہرست میں مندرجہ ذیل کتب کا بھی ذکر نہیں:۔

۱۔ الآثار الباقیتہ میں برسبیل تذکرہ جن کا بیان ہے۔ ۵

۲۔ کتاب الہند میں برسبیل تذکرہ جن کا بیان ہے۔ ۲

۳۔ جن کا ذکر حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں کیا ہے۔ ۸

(کشف الظنون میں دراصل کل پندرہ کتب کا ذکر ہے، لیکن جیسا کہ زخاؤ نے لکھا ہے ان میں سے بعض کتب بعینہ یا معمولی سی تبدیلی کے ساتھ وہی ہیں جو اوپر

کی تعداد میں شامل ہیں اور بعض کتب اس کی طرف غلط طور پر منسوب ہو گئی ہیں اس طرح حاجی خلیفہ کی بیان کردہ کتب کی تعداد صرف آٹھ رہ جاتی ہے۔)

۴۔ غلام حسین بجنوری نے جامع بہادر خانی میں البیرونی کی ایک کتاب لمعات کا ذکر کیا ہے جو علم المناظر وانعکاس پر لکھی گئی تھی۔ ۱

۵۔ تاریخ خوارزم، جس کا ذکر ابوالفضل نے تاریخ بیہقی میں کیا ہے ۱

۶۔ وہ کتب جن کا ذکر یاقوت نے معجم الادباء میں کیا ہے۔ ۷

۷۔ وہ کتب جن کا ذکر کسی قدیم کتاب میں نہیں، لیکن جو اس وقت دنیا کے کتب خانوں میں موجود ہیں، یعنی (۱) کتاب الدروفی سطح الاکر، (۲) نزہتہ النفوس والافکار فی خواص الموالید الثلاثہ المعادن النبات والاحجار، یہ دونوں کتب بوڈلین لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ۲

۸۔ وہ تصانیف جن کے مسودے البیرونی کے پاس محفوظ نہ رہے تھے۔ ۵

۳۶

اس طرح البیرونی کی تالیفات کی کل تعداد ۱۷۵ ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ کتب ہیں جن کا ذکر BOILOT۔ J D نے L'XUVRE DE 1 DERUNI (کتب البرونی) میں کیا ہے۔ اسی طرح کتاب کرن تلک (= غرۃ الزیجات) ہے، جس کا اب تک کسی شائع شدہ فہرست میں ذکر نہیں۔ یوں البیرونی کی کل مصنفہ اور مترجمہ کتب کی تعداد ایک سو اکیاسی تک پہنچ جاتی ہے۔ (یاقوت نے لکھا ہے کہ میں نے البیرونی کی تصانیف کی ایک فہرست جامع مرو کے کتاب خانے میں حاشیہ ورق پر گنجان خط میں لکھی ہوئی دیکھی تھی)

البیرونی کی مصنفات کے مخطوطے دنیا میں کہاں کہاں پائے جاتے ہیں اس کے لیے دیکھیے براکلمان: تکملہ DIE MATHEMATIKER HSUTER UND ASTRONOMEN DER ARABER UND THRE WERKE (عرب علمائے ریاضی وہیئت اور ان کی تصنیفات) ابو ریحان البیرونی، مطبع ادارہ تصنیف وتالیف ص ۸۰ بعد)

البیرونی کی جو کتب چھپ چکی ہیں یا زیرِ طبع ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں۔

(۱) القانون المسعودی، ۳ جلد، ۱۹۵۴ء بمعد (۲) الاثار الباقیتہ، طبع زخاؤ، متن، لائپزگ ۱۸۷۶ء، و انگریزی ترجمہ (۳) کتاب الہند، طبع زخاؤ، لندن ۱۸۸۷ء، و انگریزی ترجمہ (۴) پاتنجلی، طبع رٹر RITTER تہران، (۵) مقالہ فی استخراج الاوتار فی الدائرۃ بخواص الخط المنحنی فیہا، (۶) تمہید المستقر لتحقیق معنی العمر (انگریزی ترجمہ از E.S.KENEDY)، (۷) افراد المقال فی امر الظلال، (۸) فی راشیکات الہند، (۹) رسائل ابی نصر منصور بن علی بن عراق، جو اس نے البیرونی کے لیے لکھے (مندرجہ بالا کتابیں حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہیں)، (۱۰) کتاب الجماہر فی معرفتہ الجواہر، طبع کرینکو ۱۹۳۶ء، تقی الدین الہلالی نے اس کا مقدمہ اور حواشی شائع کیے، لائپزگ ۱۹۴۱ء، (۱۱) کتاب التفہیم لاوائل صناعتہ التنجیم، عربی متن، طبع رامزے رائٹ و فارسی متن، طبع آقا جلال ہمائی، تہران، ۱۹۴۰ء، (۱۲) تحدید نہایات الاماکن، طبع محمد بن تاویت الطنجی، انقرہ ۱۹۶۲ء و طبع بولجاکوف، قاہرہ ۱۹۶۴ء و عربی متن مع انگریزی ترجمہ از محمد فضل الدین قریشی، جو ابھی شائع نہیں ہوا، (۱۳) کرن تلک (۔ غرۃ الزیجات)، مع انگریزی ترجمہ و حواشی از محمد فضل الدین قریشی، لاہور ۱۹۷۰ء، (۱۵۔ ۱۶) نہایات الاماکن اور الصیدنتہ فی الطب، انگریزی و اردو ترجمہ از فضل الدین قریشی، زیر سرپرستی پنجاب یونیورسٹی لاہور، پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے، (۱۷) صفتہ المعمورۃ کے نام سے زکی ولیدی طوغان نے مطبوعات آثارِ قدیمہ ہند، شمارہ ۵۳، نئی دہلی ۱۹۴۱ء میں اس کی چار کتابوں: قانون مسعودی، نہایات الاماکن، الجماہر اور الصیدنتہ کے کچھ اقتباسات شائع کیے تھے۔ (۱۸) مقالید علم الہیئتہ کے عکس حاصل کرنے کے بعد اس کی تہذیب کا کام، از محمد فضل الدین قریشی، ایک حد تک مکمل ہو چکا ہے، (۱۹) ان کے علاوہ یورپ کے مستشرقین مثلاً ویدمن، سی۔ شائے، ڈلس، میکس مایرہاف، میکس کراؤزے اور ان کے رفقائے کار نے البیرونی کے بعض رسائل کے اقتباس مغربی زبانوں میں شائع کیے ہیں، (اقتباس ختم)

دیگر پاکستانی کتابوں میں جو انگریزی میں ہیں، مندرجہ ذیل دو قابل ذکر ہیں۔

AL BAIRUNIS INDICA A REVALUATION(1)

از ڈاکٹر احمد حسن دانی (راقم نے اس کتاب کا ذکر پڑھا ہے۔ افسوس کہ تادم تحریر دستیاب نہیں ہوئی۔ مگر راقم کی یہ تحریر کوئی تحقیقی حیثیت بھی نہیں رکھتی)

AL BIRUNI HIS TIMES LIFE AND WORKS (۲)

از حکیم محمد سعید اور ڈاکٹر انصار زاہد خاں (پہلی اشاعت ۱۹۸۱ء) ناشر ہیں ہمدرد اکادمی کراچی، جس میں سات ابواب اور چودہ نقشے، دو سو سات صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اور چھتیس صفحے کا ایک قیمتی مجموعہ ماخذات و اشاریہ بھی موجود ہے۔ اس کے ابواب اور موضوعات ملاحظہ ہوں (ترجمہ راقم الحروف کا ہے)

باب اوّل.......البیرونی کا عہد

کثرت میں وحدت...... نیا عمرانی و معاشی نظام....... مذہبی پس منظر .... علم و ادب کا ارتقاء.......

باب دوم.......البیرونی خوارزم میں

غزلوں سے پہلے کا دور....... جائے پیدائش....... خاندان....... تعلیم .... سنسکرت کی تحصیل.......

باب سوم.......البیرونی اور خاندان یمینی

دورِ غزنوی....... محمود سے تعلق....... غزنی میں سائنسی و تحقیقاتی کام .... ہندوستان سے رابطہ (CONTACT)....... مسعود سے تعلق....... قانون مسعودی....... مودود سے تعلق....... البیرونی کی وفات.......

باب چہارم.......البیرونی کے پیش رو اور معاصرین

اس میں ابو عبداللہ محمود بن موسیٰ الخوارزمی وغیرہ پندرہ افراد کے نام درج ہیں۔

باب پنجم.......البیرونی ایک ہیئت داں

نظریہ کائنات....... کونیات....... وہ نظریہ جس میں زمین بحیثیت مرکز تصور کی جاتی تھی یعنی GEOCENTRIC THEORY....... کیلنڈر اور تقویم .... سورج....... چاند (ہم نے ترجمہ شمس و قمر جان بوجھ کر نہیں کیا ہے) ستارے .... علم نجوم کا نظریہ اور اس پر عمل

باب ششم .... البیرونی ایک سائنس داں
کروی مثلث .... ہندوستانی علم حساب .... روشنی اور آواز .... کشش ثقل .... کثافت .... علم سکون و حرکت (میکانیات) اوزان اور پیمانے جغرافیہ .... علم پیمائش ارض .... نظام طبقات وغیرہ
باب ہفتم .... علم الانسان کی سائنس اور معاشرہ
عہدِ البیرونی کا معاشرہ .... تاریخی معلومات

اس کتاب میں بے شک سید حسن برنی مرحوم کی زیرِ نظر کتاب سے خاصا استفادہ کیا گیا ہے۔ (کچھ ماخذات مشترکہ ہیں) گو ان کا حوالہ مطلوبہ انداز میں نہیں دیا گیا .... لیکن اس سے کتاب کی شان اور افادیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سید صاحب کے مقابلے میں اس کتاب کا اندازِ تحریر جدید طریق پر ہے۔ .... لیکن سید صاحب کے تنقیدی انداز و نظر نے جو مقام بنا رکھا ہے اس کی بلندی میں کوئی کمی نہیں آتی .... وہ کسی طرح "پرانا" نہیں لگتا ....

کاش ہمدرد اکادمی اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع کر کے عام کر دے۔ وہ ایک بہت مفید معلوماتی اضافہ ہو گا ....

البیرونی کانگریس ۱۹۷۳ء (کراچی) میں جو مقالے پڑھے گئے انھیں وفاقی وزارتِ تعلیم اور یونیسکو کی تحریک و تعاون سے ہمدرد فاؤنڈیشن، پاکستان نے ۱۹۷۹ء میں شائع کر دیا۔ اس میں کارروائی کے علاوہ اردو کے دو، فارسی کے دو اور عربی کے تین مقالات بجنسہ شامل ہیں اور فرنچ، عربی اور انگریزی میں مختلف ممالک کے عمائد کے پیغامات کے علاوہ بہت سے عنوانات کے تحت ایسے بیش قیمت تحقیقی اور تنقیدی مطالعے ہیں جن سے البیرونی کی انتہائی حیرت انگیز شخصیت، علم، فن اور زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں عنواناتِ مقالات، صاحبانِ مقالات کے اسمائے گرامی (ترجمہ ہمارا) دیے جاتے ہیں جن سے اس امر کا البیرونی پر کس طرح مسلسل کام ہوتے جاتا ہے کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ یہ کتاب کمیاب ہو چکی ہے، لیکن مؤقر کتب خانوں میں محفوظ ہونی چاہیے۔ راقم نے نیشنل بینک آف پاکستان کے شعبۂ تحقیق معاشیات میں محفوظ کرا دی تھی۔ وہیں سے لے کر استفادہ کیا جا رہا ہے۔ اس کتاب کا

انگریزی نام ہے........

AL-BIRUNI COMMEMORATIVE VOLUME

اور یہ بڑے سائز کے آٹھ سو تینتالیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مقالہ نگاروں میں کئی پاکستانی حضرات کے علاوہ جن میں بعض خصوصی ماہرین شامل ہیں۔ مغرب اور روس کے بعض مستند اساتذہ کی شرکت خاصے کی چیز ہے۔

شعبۂ تاریخ

۱۔ پروفیسر نفیس احمد، اسلام آباد

البیرونی کی چند جھلکیاں، بحیثیت جغرافیہ داں

۲۔ جی الانہ

ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی

۳۔ غلام ربانی عزیز

البیرونی اور اس کی علمی فتوحات

۴۔ ڈاکٹر اے۔ ڈی۔ ایچ۔ بیوار

غزنی سے پشاور کے سفر میں البیرونی کی جائے قیام

۵۔ ڈاکٹر جے۔ چودھری برگل

کتاب نزہت النزہت والافکار

۶۔ ڈاکٹر پروفیسر احمد حسن دانی

البیرونی کی کتاب الہند۔ ایک تجدیدی جائزہ

۷۔ پروفیسر اے۔ ایم۔ آر فاطمی

البیرونی کا ہندوستان

۸۔ یو۔ وی۔ گنکووسکی

روس میں البیرونی کی زندگی اور تصانیف کا مطالعہ

۹۔ ڈاکٹر لوئی گارڈٹ

دو فضلا اور فطرتِ انسانی کے تقاضوں کے خاکے۔ البیرونی اور

البرٹ اعظم

۱۰۔ پروفیسر چاطر غزنوی

البیرونی اور ہندو تمدن۔ ایک زاویہ نظر

۱۱۔ ڈاکٹر محمد اسرار اللہ خان

جغرافیہ میں البیرونی کا حصہ

۱۲۔ ڈاکٹر علی۔ اے۔ جعفری

پاکستان سے متعلق ایران کی ابتدائی معلومات، بالخصوص۔ البیرونی کی تصانیف کے حوالے سے

۱۳۔ حسین خان

کابل کی ہندو شاہیہ کے ضمن میں البیرونی کی توجیہ کی ایک ترجمانی

۱۴۔ محمد ولی اللہ خان

لاہور اور البیرونی

۱۵۔ محمد وارث میر

البیرونی کی تحقیقی منہاجیات

۱۶۔ ڈاکٹر ایم۔ مہاجیگ

البیرونی کی فہرست پر نوٹ

۱۷۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

البیرونی بحیثیت ایک مورخ تمدن

۱۸۔ پروفیسر ایف۔ ای۔ پیٹرل

سائنس، تاریخ اور مذہب۔ ابوریحان البیرونی کے ہندوستان کی کچھ جھلکیاں

۱۹۔ ڈاکٹر اسلم قریشی

جدید البیرونی

۲۰۔ پروفیسر ڈاکٹر ہانس رابرٹ روئمر

البیرونی، جرمنی میں

۲۱- جارج۔ اے۔ سلیبا

البیرونی اور برشنایا (ایک نسطوری عیسائی پادری)

۲۲- پروفیسر ایف۔ اے شمس

ابوالریحان ابن احمد البیرونی

۲۳- پروفیسر برتوڈ اسپولر

عہد البیرونی میں ایران کے سیاسی حالات

۲۴- محمد طفیل

البیرونی کے عہد میں ہندو معاشرہ

۲۵- پروفیسر محمد عثمان

البیرونی اور ہندو ذہن

۲۶- نکولا۔ اے۔ زیادہ

البیرونی، بحیثیت مسلم مؤرخ

۲۷- پروفیسر لارنس زیرنگ

البیرونی، ایک ہزار سال بعد

شعبۂ فلسفہ

۱- پروفیسر جوسی آرو

البیرونی کی تصنیف میں تہذیبوں کا تقابل

۲- محمد اسلم

ہندوستان میں البیرونی کی منہاجیات

۳- بشیر احمد ڈار

ہندو مذہبی افکار اور البیرونی

۴- پروفیسر ماجد فخری

البیرونی اور یونانی فلسفہ۔ فلسفیانہ تبصرہ پر ایک مقالہ

۵۔ آغا ہمدانی

البیرونی اور تصوّف

۶۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

البیرونی کا سیاسی کام اور فلسفہ

۷۔ پروفیسر بروس۔ بی۔ لارنس

البیرونی اور اسلامی تصوّف

۸۔ ڈاکٹر آئی۔ مدکور

البیرونی، ہندی فلسفہ کا ماخذ

۹۔ ایم۔ ایس۔ ایچ۔ معصومی

البیرونی کے عقائد، جیسا کہ اس کی تصانیف سے مترشح ہیں۔

۱۰۔ ڈاکٹر ہشام ناشابی

تعلیم اور علم کی طرف البیرونی کا رویہ

۱۱۔ ڈاکٹر حسین نصیر

البیرونی، بحیثیت فلسفی

۱۲۔ پروفیسر ابراہیم المدکور

البیرونی نظریۂ انسان اور معاشرہ

۱۳۔ جی۔ آر۔ صابری تبریزی

البیرونی اور مشرقی نشاۃالثانیہ کی انسانی اقدار

۱۴۔ مانٹ گمری واٹ

البیرونی اور غیر اسلامی مذاہب کا مطالعہ

شعبۂ سائنس

۱۔ ایرج افشار

صیدنہ اور اس کے مخطوطات کا متن اور ترجمہ

۲۔ ڈاکٹر روجرار نالڈز

علم کا نظریہ اور معمول بلحاظ ابن سینا اور البیرونی

۳۔ جی۔ سی۔ اناوتی

البیرونی کی "کتاب الجماہر فی معرفتہ الجواہر"

۴۔ ڈاکٹر ابوالحسن ذہقان

البیرونی کے دیکھے ہوئے جغرافیائی مقامات

۵۔ کمال محمد حبیب

"کتاب الصیدنہ" ساخت اور رسائی

۶۔ صالح۔ کے۔ ہمارنہ

الرازی کی تصانیف پر البیرونی کے نظریات۔ ایک نوٹ

۷۔ ڈاکٹر سمیع۔ کے۔ ہمارنہ

البیرونی۔ بابائے ..... ادویہ سازی اور بحری حیاتیات .... الصیدنہ میں رونمائی کے حوالے سے۔

۸۔ انتون ہیتن، ہارڈورڈ یونیورسٹی

البیرونی اور الہیثم...... سائنسی طریقہ کار کا تقابلی جائزہ

۹۔ ڈاکٹر رانا۔ ایم۔ این احسان الٰہی

البیرونی کی "کتاب الصیدنہ" کی ماخذ کتب

۱۰۔ انعام اللہ جان

تجدید نہایات الاماکن تصحیح مسافات المساکن" کی تفسیر

۱۱۔ ڈاکٹر سید مہدی حسن

ہندی کیمیا پر البیرونی کے مشاہدات کی تشریح

۱۲۔ ڈاکٹر سید ایچ۔ ایچ ندوی

البیرونی اور اس کی کتاب "الجماہر فی معرفتہ الجواہر"

۱۳۔ ایم۔ ایس۔ ناموس

البیرونی تمام زمانوں کا عظیم ترین ہئیت داں

۱۴۔ سید سبط نبی نقوی

البیرونی کے دور تک مسلمانوں کی فکری مساعی کے تحت علم

کائنات کا ارتقا

۱۵۔ ڈاکٹر کے۔ بی نسیم

البیرونی۔ بحیثیت ایک ہئیت داں

۱۶۔ پروفیسر عبدالرؤف نوشہروی

طبعی علوم میں البیرونی کا حصّہ

۱۷۔ محمد افضال حسن قادری

"کتاب الجماہر فی معرفتہ الجواہر" .... حیاتی مطالعہ میں البیرونی کا حصّہ

۱۸۔ عبیداللہ قدسی

البیرونی کی منہاجیات اور اس کے ماخذ

۱۹۔ سید صمد حسین رضوی

البیرونی کی نئی دریافت شدہ کتاب "غرۃ الزیجات اور البیرونی کی زمین کے حجم کی مساحت"

۲۰۔ ڈاکٹر احمد سیدان

البیرونی کا علم مثلث

۲۱۔ محمد سعود

البیرونی کی کتاب "استخراج الاوتار فی الدائرہ" کا ایک حصّہ

۲۲۔ پروفیسر ایڈین سائلی

البیرونی اور تاریخ سائنس

۲۳۔ ایس۔ ایم۔ یوسف

البیرونی۔ بحیثیت ایک ریاضی داں

البیرونی ایک ہزار برس کا آدمی ہے۔ ذرا اس زمانے کی کمی وسائل اور افراطِ مسائل سامنے رکھیے، جم کر تصنیفی تالیفی کام کرنے کے خلاف سیاسی عدم استحکام بھی (ان سب کا تفصیلی ذکر اس کتاب اور دوسرے حوالوں میں موجود ہے) اور پھر

دیکھیے کہ ایک شخص کتنی جہتوں میں کتنے بڑے بڑے کام کر گیا ہے۔ اگر پروفیسر لنکووسکی ریٹائرڈ صدر شعبہ شرقیات اکادمی آف سائنسز، ماسکو کا دعویٰ درست ہے کہ البیرونی پر سوویت یونین میں تین سو کے قریب کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ تو ہمارے لیے خوشی کی بات بھی ہے کہ کسی نے ایک مسلمان جی نی اَس پر اتنا کام کیا اور دکھ کا مسئلہ بھی کہ خود ہم نے اس کے لیے دو محولہ بالا کتابوں اور اس محولہ بالا کانگریس کے علاوہ .... (وہ بھی انگریزی زبان میں) اپنی کسی زبان کے ذریعے کوئی نئی تصنیف پیش نہیں کیا۔ راقم الحروف کو تمام عالم اسلام کی تمام زبانوں کے متعلق تو علم نہیں کہ وہاں البیرونی پر کتنا کام ہوا ہے، لیکن پوچھ گچھ سے جو اندازہ ہوا وہ یہی بتاتا ہے کہ نئے مشرقِ وسطیٰ میں جہاں تیل کی دولت نے دوسرے عجب عجب "کمالات" دکھا دیے ہیں۔ البیرونی پر عظیم تصانیف کی بہت کمی ہے (ورنہ وہ آہستہ آہستہ ہمارے علم میں آ ہی جاتیں)

یہ نہیں کہ البیرونی ایک مسلمان جی نی اَس تھا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کا جذباتی فرض بنتا ہے کہ وہ محض یادِ ماضی یا اپنی نشاۃ ثانیہ کے چکر میں اس پر دھڑا دھڑ کام کرنے لگیں۔ تصنیفات کے حوالے سے وہ کوئی خالص مذہبی قسم کا مجاہد مسلمان مفکر بھی نہیں لگتا بلکہ ایک اہل ایمان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک غیر متعصب جویائے علم، سائنس داں، فلسفی اور سیاح ہے، جس کا اصل کام نظری ہی نہیں، عملی تحقیق و جستجو بھی ہے۔ افسوس کہ اس کی دو تصانیف (جن میں پہلی تو ایک حیرت انگیز طور پر شاندار کتاب ہے) یعنی "کتاب الہند" اور "کتاب الصیدنہ" کے علاوہ دوسری (نہایت اہم) تصانیف کے اردو ترجمے بھی موجود نہیں۔ کتاب الہند بھی عام نہیں۔ ایک اور نہایت ہی اہم، بلکہ کئی لحاظ سے اس کی اہم ترین تصنیف "قانونِ مسعودی" کے لیے اردو ترجمے کی تجویز اسی کانگریس کی مجلس میں منظور ہوئی تھی مگر تا حال وہ ترجمہ بھی یا تو ہوا نہیں یا زیر اشاعت ہے۔ بہر حال شائع ہو کر سامنے نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ البیرونی وسطِ ایشیا کا ایک ایسا جی نی اَس تھا جس کے کاموں اور احوال سے واقفیت آج کے اردو داں کے لیے بلا لحاظِ زمانہ و ملت انسانی صلاحیتوں کا ایک سبق آموز مرقع سامنے لاتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ انجمن نے باسٹھ

برس بعد ہی سہی اس کتاب کو ایک بار پھر شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ معلوم نہیں یہ کتاب "بازار" میں کیسی جائے۔ ہمارا بازارِ علم و ادب ایک عجیب دنیا ہے، لیکن ہم اکثر بلالحاظ فوائد اپنی کتابوں کو اس میدانِ کارزار میں ڈال دیا کرتے ہیں۔ انجمن ان معدودے چند پاکستانی اداروں میں ہے جو اشاعتِ علم تحقیق کے سلسلے میں نفع نقصان کی پروا نہیں کرتے ...... نہ جانے وہ ...... اور انجمن ...... کب تک قائم رہیں۔ آثار اس وقت تو اچھے نہیں ہیں لیکن مستقبل کی طرف سے خوش امیدی نا امیدی سے بہتر ہے......

"البیرونی" پر جو کام ہمارے علم میں آیا اس کی ایک نامکمل سی فہرست ہی جو اوپر بنائی گئی اس کی ہمہ جہتی عظمت کا ایک بڑا ثبوت ہے۔ ایسے لوگ اپنی ذات (اور کارناموں) میں فیضِ جاریہ ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ان سے فیض اٹھانے والی نسلیں بعض اوقات یاد بھی نہیں رکھتیں کہ ان کے ورثوں میں کیا کیا کس کی بخشش ہے۔ خود برنی صاحب کے ان دو دیباچوں کے علاوہ جو شاملِ کتاب ہیں، ہم چاہتے تھے کہ اس کتاب کا دیباچہ سید حسن برنی مرحوم کے فاضل صاحب زادے سید ابنِ حسن برنی (بی سی سی آئی) لکھیں، کیوں کہ وہ خود ایک بڑے اہلِ نظر اور اپنے والد کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے، لیکن وہ اس کتاب کی ڈمی تیار ہوتے ہوتے، عارضۂ قلب سے انتقال کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ افسوس کہ یہ کتاب ان کے فاضلانہ ارشادات سے محروم جارہی ہے۔ راقم الحروف نے چند دوسرے فضلاء سے بات کی، لیکن انھیں مصروف پایا بالآخر صدرِ انجمن جناب نورالحسن جعفری نے یہ بوجھ راقم الحروف پر ڈال دیا۔ لندن جانے سے پہلے چند برس تک ابنِ حسن برنی انجمن کے متولیان میں شامل تھے اگر وہ اس وقت حیات ہوتے تو بہت خوش ہوتے۔ انجمن ان سطروں میں بھی ان کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے۔

قارئین ملاحظہ کریں گے کہ سید حسن برنی مرحوم کا رویہ تمام تر سائنسی ہے۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی جارہی تھی۔ ہندی مسلمانوں کا ایک طبقہ "اپنے" علوم اور اکابر کے احیا و تعارف میں بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ (گو وہ طبقہ بہت مختصر تھا) یقیناً سید حسن برنی اس رَو سے متاثر ہوئے اور خود انھوں نے اس کے پہلے

ایڈیشن کے حوالے سے اپنے کسی قدر جذباتی ہو جانے کا اعتراف کیا ہے مگر اشاعتِ ثانی (۱۹۲۷ء) آتے آتے انھوں نے ایک معروضی مورخ و ناقد کی حیثیت سے جدید خطوط پر کام کیا۔ ان کی تعبیر مضامین، ان کا صورتِ حال کو تاریخی تناظر میں دیکھنا، اسباب و علل کی توجیہ کرنا اور البیرونی کے کارناموں پر ایک بھرپور ناقدانہ نظر ڈالنا ثابت کرتا ہے کہ انھوں نے اپنے بیان اور مداحی میں کسی مذہبی تعصب یا غلو سے کام نہیں لیا۔

البیرونی کے معاملے میں ایک گنجلک ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے۔ وہ البیرونی عالمی کانگریس تک میں صاف نہیں ہوئی۔ یہ کہ اتنے کثیر التصانیف اور ہمہ وقتی مصنف ہونے کے باوجود اس نے اپنے بارے میں خود کوئی تفصیلی تحریر نہیں چھوڑی۔ خود نوشت سوانح عمری کا تو اس وقت دستور بھی نہ تھا مگر ایسے اکثر لوگ اپنے کسی نہ کسی دَور میں اپنے بعد آنے والوں کے لیے اپنے بارے میں بعض بنیادی معلومات ضرور چھوڑ جاتے تھے، مثلاً وہ کہاں پیدا ہوئے، کن مکاتب میں یا کن اساتذہ سے تعلیم پائی، پیشے کیا رہے، سیاسی عروج و زوال، مالی حالات، تصانیف اور زیرِ تصنیف کتب و رسائل کی یادداشتیں (یا فہرست) وغیرہ..... مگر ذرا دیکھیے کہ اتنا بڑا آدمی اور اس کے بارے میں یہ تک متحقق نہیں کہ وہ پیدا کہاں ہوا تھا۔ کوئی "بیرون" کو خوارزم سے باہر کے تمام علاقے کے لیے ایک محاوراتی تشخص قرار دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے نہیں۔ بیرون خود ایک موضع تھا..... کانگریس بھی طے نہیں کر سکی، قیاسات ہی قیاسات غالب رہے..... شاید اتنے مشغول اور بڑے انسان نے اپنے بارے میں دانستہ طور پر وہ سب لکھنا ضروری نہ سمجھا ہو جو "لوگ" ضروری سمجھتے ہیں۔

(چونکہ مولد پر بڑی بحث ہوئی ہے اس لیے راقم الحروف ایک گزارش کرتا ہے وہ ایک سابق دلّی والا ہونے کی حیثیت سے سمعانی اور یاقوت حموی کی یہ روایت تسلیم کرنے میں کوئی مشکل نہیں دیکھتا کہ "البیرونی" باہر والے" تھے۔ اس وقت کا خوارزم ایک بڑا اور آراستہ شہر تھا۔ راقم کے بچپن میں پرانے اہلِ دلّی بھی ایک فضول نشہ شاونیت سے سرشار ان لوگوں تک کو "باہر والے" کہہ جاتے تھے جو فصیلوں سے باہر

رہتے تھے، کسی قریبی قصبے یا دیہات کا تو کیا ذکر ہے .... یہاں تک کہ بعض بزرگ خواتین دہلی سے باہر ہر بڑے شہر کے باسیوں کو "باہر والے" کہہ دیا کرتی تھیں۔ یہ شاونیت اہلِ خوارزم میں بھی موجود ہوگی۔ بہر حال خاص اس موضوع پر بڑی بحثیں ہیں اور یہ پرانے زمانوں کا چلن ہی نہیں، حیرت کہ غیر ضروری حد تک آج بھی ہوتی ہیں۔ راقم کی رائے میں اگر کسی زمانے، شہر، ملک کے ماحول اور حالات سے واقفیت بہم ہو جائے تو صرف اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ موضوعِ گفتگو شخصیت کسی شہر سے باہر پیدا ہوئی تھی یا اندر یا اس کے قریب ....)

اب ہم زیرِ نظر کتاب کے چند نکات پر کچھ گفتگو کرنے کی جرأت کریں گے جس سے قاری کو ایک طرح ان کا خلاصہ بھی فراہم ہو جائے گا.........

البیرونی کے زمانۂ حیات کا تعلق چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے اس دور سے ہے جسے مسلمانوں کی تاریخ میں علوم و فنون کی ترقی کا ایک بے مثال دور سمجھا جاتا ہے، لیکن دوسری طرف یہی زمانہ سیاسی حیثیت سے ایک نہایت پُرآشوب زمانہ بھی ہے۔ گویا ایک لحاظ سے یہ زمانہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے تو دوسرے اعتبار سے یہی زمانہ ہماری تاریخ کا ایک سیاہ ورق بھی ہے اس لیے کہ رات دن کے انقلابات، جنگ و جدل، بد نظمی اور فقدانِ امن اس دور کی عام خصوصیات تھیں، اور یہ چیزیں علوم و فنون کی ترقی میں ہمیشہ حارج سمجھی جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں زمانے کی آب و ہوا علوم و فنون کی ترقی کے لیے کسی طرح بھی سازگار نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں خلافتِ شرقی کے اس کنارے سے لے کر خلافتِ غربی کے اس کنارے تک مسلم دنیا کے ہر حصے میں ابوریحان البیرونی اور بوعلی سینا جیسے جلیل القدر علماء و فضلا بکثرت پیدا ہوئے، جو نہ صرف ہر زمانے میں مایہ ناز تصور کیے جائیں گے، بلکہ جن پر پوری دنیائے تمدن بلا لحاظ ملت ہمیشہ فخر کرے گی۔ ایسی صورت میں ہمارے ذہنوں میں یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ ایسے پُرآشوب دور میں علم و حکمت کی یہ بے مثال ترقی آخر کن اسباب کے تحت عمل میں آئی۔ برنی صاحب کی کتاب کا پہلا باب اس اعتبار سے

خاص طور پر لائقِ توجہ ہے کہ اس میں مصنف نے اسی ضروری سوال کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے جس طرح پوری صورتِ حال کو تاریخ کے تناظر میں رکھ کر دیکھا اور جس طرح اس کے اسباب و علل کی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے اس سے ان کی نظر کی گہرائی اور بصیرت کا ثبوت ملتا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں اگر البیرونی کے دور کی سیاسی اور علمی تاریخ کو ایک وسیع تر تناظر میں رکھ کر دیکھا گیا ہے تو دوسرے اور تیسرے ابواب میں اس پر البیرونی کی ذاتی زندگی کے حوالے سے نظر ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں اس کی پیدائش سے غزنی پہنچنے تک اور تیسرے میں غزنی پہنچنے سے لے کر وفات تک کے حالات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برنی صاحب نے البیرونی کے حالات کی جمع و تدوین میں بڑی کوشش اور کاوش سے کام لیا ہے مگر اس سلسلے میں ایک بڑی دقت جو البیرونی کے تذکرہ نگاروں کو پیش آتی ہے وہی ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے یعنی یہ کہ اس کی کوئی خود نوشت، سوانح عمری ہمارے پاس موجود نہیں اور نہ ہی اس کے کسی شاگرد یا دوست یا ہم عصر مصنف نے اس کے مفصل حالات قلمبند کیے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس کے ایک شاگرد السرخی کا ذکر تو بے شک کیا ہے مگر انہی کے بقول اس کے بھی بس چند ہی یادداشتیں (نوٹس) ہم تک پہنچی ہیں۔ علاوہ ازیں خود البیرونی کی جو تصانیف ہم تک پہنچی ہیں ان میں بھی اس نے شاذ و نادر ہی اپنے متعلق کوئی ایسی بات لکھی ہے جس سے ہمیں اس کی داستانِ حیات کو مرتب کرنے میں کوئی مدد مل سکے۔ حتیٰ کہ اس کے خاندان کا حال، بچپن کے واقعات اور تعلیم و تربیت کی کیفیت جیسی ضروری چیزوں کے بارے میں بھی ہمیں یقینی طور پر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ایسی صورت میں اس کے حالات کو مرتب کرنے کی اور کوئی صورت اس کے سوا باقی نہیں رہتی کہ جہاں کہیں اس کی تصانیف میں اس کے قلم سے کوئی ایک آدھ لفظ اپنی نسبت سے ٹپک پڑا، یا دوسرے مورخین و مصنفین کی کتابوں میں کوئی بات کوئی اشارہ اس کی نسبت سے مل گیا۔ بس اسی کو پھیلا کر اس کی داستانِ حیات ترتیب دینی پڑتی ہے۔ کراچی کانگریس نے

اس مہم میں بڑا اضافہ کیا، لیکن اس طریقہ کار سے جو الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں وہ بھی ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں جنھیں اس قسم کے کاموں سے سابقہ پڑتا ہے، لہٰذا کسی بھی بات کو من وعن قبول کرنے سے پہلے اس کی چھان بین کرنے کی ذمے داری بھی ان پر عائد ہوتی ہے، چنانچہ اس کتاب کے مصنف نے بھی اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کیا ہے اور آنکھ بند کر کے کسی بات کو قبول کرنے کی بجائے اپنے ذاتی مطالعے اور غور وفکر کی روشنی میں تمام قدیم اور (اپنے وقت تک) جدید ماخذات کی چھان بین کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے اور حتی المقدور مختلف روایات کی تنقیح و تفتیش کے ذریعے بعض الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے ضمیمہ سوم میں انھوں نے اپنے ماخذات کی جو طویل فہرست دی ہے، اس سے ان کی محنت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ اسکے باوجود یہ بھی کہنا پڑے گا کہ بعض مقامات پر انھوں نے روایات کے ردّ و قبول میں پورے غور وفکر اور احتیاط سے کام نہیں لیا۔ (راقم الحروف جائے پیدائش کے قضیے کے اتنی اہمیت پا جانے سے تنگ ہے لیکن اس کا حوالہ ان مباحث کو سمیٹنے میں پھر آ رہا ہے) اس کی ایک مثال البیرونی کی وجہ تسمیہ یا جائے پیدائش کا قضیہ ہے جس میں انھوں نے غضنفر تبریزی، سمعانی اور یاقوت حموی، ان تینوں کے بیانات کو بغیر کسی تنقیح و تفتیش کے من وعن قبول کر لیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ البیرونی کی کتاب "آثار الباقیہ" کی اندرونی شہادت اور غضنفر تبریزی کی شرح کی رُو سے البیرونی کا خوارزمی ہونا ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر سمجھتے ہیں اور دوسری طرف سمعانی اور یاقوت حموی کی سند پر یہ بھی مانتے ہیں کہ اس کا مولد خوارزم خاص نہ تھا، بلکہ مضافاتِ خوارزم کا کوئی قریہ تھا اور تیسری طرف اس سے یہ نتیجہ بھی نکال لیتے ہیں کہ وہ قریہ بیرون کہلاتا تھا، حالانکہ یاقوت حموی اور سمعانی دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ بیرون کسی خاص جگہ یا قریہ کا نام نہیں بلکہ اس سے مراد شہر خوارزم سے باہر کا مضافاتی یا نواحی علاقہ ہے اور چونکہ اہلِ خوارزم سے باہر والوں کو اجنبی یا بیرونی کہتے تھے، لہٰذا وہ ابوریحان محمد بن احمد کو بھی البیرونی کہنے لگے اب یہ تینوں باتیں، ظاہر ہے کہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور تاوقتیکہ ان میں کوئی مطابقت ثابت نہ کی جائے، ان سے کوئی ایک ہی چیز مراد نہیں لی جا سکتی، لیکن فاضل

مصنف یہ تینوں باتیں بیک وقت کہتے ہیں، مگر نہ تو ان کے باہمی اختلاف پر غور کرتے ہیں اور نہ ہی ان میں کوئی مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان کی عبارت میں ایک ایسا الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے جس سے ان کی اصل مراد کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ برنی صاحب کی کتاب کی اشاعت کے بعد، البیرونی کی جائے پیدائش کے سلسلے میں بعض اہم باتیں سامنے آئی ہیں، مثلاً پروفیسر ایف۔ اے۔ شمسی نے اپنے مضمون "ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی" میں جو حکیم محمد سعید کی مرتب کردہ کتاب

AL-BIRUNI COMMEMORATIVE VOLUME

میں شامل ہے، یہ انکشاف کیا ہے کہ البیرونی پر کام کرنے کے دوران التفہیم کو اس کی ایک بہت غیر معروف کتاب "مقالہ فی حکایت ہند فی استخراج العمر" میں خود البیرونی کا ایک بیان ملا ہے، جس میں اس نے "مدینہ خوارزم" کو اپنی جائے پیدائش بتایا ہے اور مدینہ السلام بغداد سے اس کا فاصلہ اور عرض بلد شمال وغیرہ بتا کر اس کے محل وقوع کی نشاندہی بھی کی ہے، چنانچہ پروفیسر شمسی نے ان چیزوں کی مدد سے کھوج لگا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "مدینہ خوارزم" سے البیرونی کی مراد خوارزم کا بڑا شہر "کاث" ہے جو البیرونی کے زمانے میں خوارزم کا دارالسلطنت تھا۔ پروفیسر شمسی کے بقول اس انکشاف کی رو سے البیرونی کی جائے پیدائش کے سلسلے میں غضنفر تبریزی کا بیان بالکل درست قرار پاتا ہے اس لیے کہ وہ بھی البیرونی کی جائے پیدائش مدینہ خوارزم" ہی کو قرار دیتا ہے۔ اب اتفاق سے یہ بات تو خود برنی صاحب نے بھی اپنی کتاب میں لکھی ہے کہ .... "اس زمانے میں خوارزم کا علاقہ دو حکومتوں میں تقسیم تھا۔ شمالی حصہ جس کا دارالحکومت گرگانج یا جرجانیہ تھا، مامون بن محمد کے قبضے میں تھا اور بقیہ حصہ ابوعبداللہ محمد بن احمد خوارزم شاہ کے قبضے میں تھا اور اس کا دارالسلطنت "کاث" کہلاتا تھا جو عرصے سے خوارزم کا مرکز حکومت تھا۔" لیکن غضنفر تبریزی کی رو سے البیرونی کے خوارزمی ہونے کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر سمجھنے کے باوجود ان کی نظر اس طرف نہ جا سکی کہ "مدینہ خوارزم" سے

غضنفر تبریزی کی مراد دارالسلطنت "کاث" بھی ہو سکتی ہے۔ بہرحال بعض مصنّفین نے البیرونی کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں جو یہ بات کہی ہے کہ بیرون ایک قریہ یا شہر کا نام ہے، جس سے نسبت رکھنے کی بنا پر ابوریحان محمد بن احمد کو البیرونی کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں پروفیسر شمسی کا کہنا یہ ہے کہ یہ ایک قطعی بے بنیاد بات ہے اس لیے کہ اس زمانے میں خوارزم ہی نہیں بلکہ جرجان یا خراسان میں بھی اس نام کے کسی قریہ یا شہر کا کوئی وجود ثابت نہیں، لیکن دوسری طرف ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا دعویٰ یہ ہے کہ تاریخ عالم آرائے عباس مؤلفہ منشی اسکندر بیگ اور الجیہانی کی کتاب "المسالک والممالک" کے فارسی ترجمہ "اشکالِ عالم" کے حوالوں سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ بیرون ایک خاص قصبہ یا شہر کا نام تھا جو خوارزم کے جنوب اور خراسان کے شمالی علاقے میں واقع تھا اور یہی جگہ البیرونی کی جائے پیدائش تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون جس میں یہ بات کہی گئی ہے "ابوریحان محمد بن احمد البیرونی" کے عنوان سے کراچی کانگریس کی

AL-BIRUNI COMMEMORATVE VOLUME

میں شامل ہے اور انھوں نے اپنے مضمون کی بنیاد پروفیسر عبدالحئی کے ایک مقالے پر رکھی ہے جو "بیرون والبیرونی" کے عنوان سے اورینٹل کالج میگزین (بابت مئی ۱۹۶۳ء) میں شائع ہوا تھا۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ اس معاملے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور پروفیسر شمسی دونوں کے موقف ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور تاوقتیکہ ان دونوں کی تطبیق کی کوئی صورت پیدا نہ ہو یا دونوں میں سے کسی ایک کو غلط ثابت نہ کیا جائے، البیرونی کی جائے پیدائش کا مسئلہ تصفیہ طلب ہی رہے گا........

بہرحال ادھر تو یہ صورت حال ہے اور ادھر سوویت روس کے محققین کا دعویٰ ہے کہ البیرونی ازبکستان کے شہر خیوا میں پیدا ہوا تھا (جو اب جمہوریہ ترکمانستان کا ایک حصّہ ہے) اور وہاں البیرونی پر پوری فلمیں ایس بن چکی ہیں جن میں خاص طور پر اسی بات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے کہ البیرونی وسط ایشیا کے شہر خیوا کا باشندہ تھا۔ حیرت کہ لوگ .... ہم بھی ان میں شامل ہیں .... ابھی تک نہ تو اس کی جائے پیدائش کا قضیہ ہی حتمی طور پر طے کر پائے ہیں اور نہ ہی یقینی طور پر یہ بتا

سکتے ہیں کہ اس کی آخری آرام گاہ کہاں واقع ہے۔ ان سوالوں کا اثر اس کی فکری اور تجربی عظمتوں اور ان کے افادیت جاریہ پر تو نہیں پڑتا لیکن اگر وہ اس وقت زندہ ہو کر آ نے اور اپنے بارے میں اتنا کام دیکھے اور یہ بھی دیکھے کہ اس کا مولد و مدفن دونوں ابھی تک سوال ہیں تو کیا سوچے گا!!

البیرونی کے جائے پیدائش کے قضیے کی طرح ایک اور تصفیہ طلب مسئلہ لبیرونی اور محمود غزنوی کے تعلقات کا بھی ہے۔ اس مسئلے میں بنیادی غلط فہمی چہار مقالہ" کی اس روایت سے پیدا ہوتی ہے کہ البیرونی، بو علی سینا اور بعض وسرے نامور علماء و فضلاء جو ایک خاص وقت میں خوارزم شاہ (ابوالعباس بن مامون) کے دربار میں یک جا ہو گئے تھے، سلطان محمود غزنوی نے جب انھیں وہاں سے بلوا کر اپنے دربار کی زینت بنانا چاہا تو خوارزم شاہ کے لیے یہ بات قابل قبول نہ ہو سکی۔ جس پر محمود اس سے بد ظن ہو گیا اور بعد میں یہی بات خوارزم پر اس کے حملے کا سبب بنی۔ "چہار مقالہ" کی وہ عبارت جس کی بنیاد پر یہ حکایت عام ہوئی، برنی صاحب نے اپنی کتاب کے باب دوئم میں نقل کر کے اسے ان غیر معتبر روایات میں شمار کیا ہے جن میں صحیح اور غیر صحیح واقعات بلا امتیاز مخلوط ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں انھوں نے صحیح واقعات کے لیے تاریخ بیہقی پر اعتماد کیا ہے، لیکن چہار مقالہ کی روایت کو غیر معتبر قرار دینے کے باوجود، جرمن مستشرق سخاؤ سے متفق ہو کر وہ خود بھی محمود اور البیرونی کے تعلقات کے بارے میں اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ البیرونی کے تعلقات محمود غزنوی سے خوشگوار نہیں تھے چنانچہ اس خیال کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب کے پہلے ایڈیشن میں کیا تھا، مگر جب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو دوسرے ایڈیشن (دیباچہ طبع دوم) میں اعتراف کر لیا کہ یہ خیال جو تمام تر قرائن و قیاسات پر مبنی تھا، صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اس کی تردید کے لیے تو خود البیرونی کی سند اس قصیدے کی صورت میں موجود ہے جو اس نے ابوالفتح بستی کی مدح میں لکھا تھا، اور جس میں اس نے صاف الفاظ میں محمود کے احسانات اور اس کی سرپرستی کا اعتراف کیا ہے اب ظاہر ہے کہ اس قصیدے کی اندرونی شہادت کو مان لینے کے بعد محمود اور البیرونی کے تعلقات کے سلسلے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی

باقی نہیں رہتی۔ اس کے باوجود فاضل مصنف کا یہ گمان کرنا کہ البیرونی ہندوستان میں پوری طرح آزاد نہیں تھا اور یہ کہ اس پر محمود کی نگرانی تھی، ایک حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ وہ یہ بات بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "کتاب الہند" کی جس عبارت سے انھیں یہ گمان گزرا ہے وہ اس قدر مغلق اور کنایہ آمیز ہے کہ اس سے کوئی یقینی نتیجہ برآمد نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی ان کا خیال ہے کہ یہ بات ناممکن نہیں معلوم ہوتی کہ "محمود نے اس بے اعتباری اور احتیاط کی نظر سے جو اس کے مزاج کا خاصہ تھی، البیرونی کو دورانِ قیام ہندوستان ان تعلقات کی وجہ سے جو اسے خوارزم کے دربار میں اس ملک کے فتح ہونے اور محمود کی سلطنت کا جزو بننے سے قبل حاصل تھے، کامل آزادی نہ دی ہو" .... لیکن یہ خیال تو دراصل خود سخاؤ ہی کا ہے کہ ہندوستان میں البیرونی اور محمود کی نگرانی قائم تھی اور یہ کہ وہ پوری طرح آزاد نہیں تھا۔ سو جہاں تک سخاؤ کا تعلق ہے، چونکہ اس نے محمود اور البیرونی کے تعلقات کو ناخوشگوار بتایا ہے لہٰذا اسے تو البیرونی کے مغلق اور کنایہ آمیز عبارت سے یہ نتیجہ نکالنا ہی تھا کہ وہ ہندوستان میں محمود کی نگرانی سے آزاد نہیں تھا۔ لیکن برنی صاحب کو اس بات پر ضرور غور کرنا چاہیے تھا کہ جب خود ان کے اپنے نزدیک محمود اور البیرونی کے بارے میں سخاؤ کا یہ الزام بے بنیاد قرار پایا کہ ان کے تعلقات ناخوشگوار تھے تو پھر وہ نتیجہ جو البیرونی کی مغلق اور کنایہ آمیز عبارت سے اسی بے بنیاد الزام کی زیرِ اثر اخذ کیا گیا کس طرح درست اور قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فاضل مصنف اس مسئلے میں سخاؤ کی رائے کو رد کرنے کے باوجود اپنے آپ کو اس کے اثر سے پوری طرح آزاد کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اور اسی لیے وہ "کتاب الہند" کی مغلق اور کنایہ آمیز عبارت کی تاویل سخاؤ ہی کے نقطۂ نظر کی روشنی میں کرنے پر مجبور ہیں اور یہی ان کی الجھن کا اصل سبب ہے ورنہ کچھ ضروری نہ تھا کہ وہ بھی "کتاب الہند" کی عبارت مذکور کے اصل مفہوم تک بالکل اسی طرح نہ پہنچ سکتے جس طرح ان کے بعد البیرونی پر کام کرنے والے دوسرے مصنفین پہنچے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں ڈاکٹر انصار زاہد خاں اور حکیم محمد سعید کا نام لیا جا سکتا ہے جنھوں نے اپنی مرتب کردہ کتاب ....

"AL-BIRUNI, HIS TIMES, LIFE AND WORKS"

میں نہ صرف یہ کہ البیرونی کی مذکورہ عبارت کے اصل مفہوم کو واضح کیا ہے، بلکہ دلائل و براہین کے ساتھ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ البیرونی پر ہندوستان میں محمود کی طرف سے کسی طرح کی پابندی یا نگرانی نہیں تھی۔

کیا اسی علمی اور سائنسی زندگی میں حکمرانوں نے "البیرونی" کے افادات سے کوئی سراغ رسانی قسم کا ربط رکھا۔ یہ شبہ آج کا ذہن کر سکتا ہے، لیکن اگر کسی حکمران نے اس کی تصنیفات سے ایسا فائدہ بھی اٹھالیا تو اس سے اس کے کام .... اور نام .... پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن حیرت کہ بزرگ و محترم محققین نے اس پہلو پر زیادہ گفتگو نہیں کی۔

چوتھے باب میں بیرونی کی تصانیف و تالیفات اور تراجم کی فہرست بڑی محنت کے ساتھ مرتب کر کے پیش کی گئی ہے جسے دیکھ کر اس کی وسعتِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ شہرزوری نے لکھا ہے کہ سال میں دو دن (نوروز اور مہرجان) کے سوا کسی وقت بھی بیرونی کا ہاتھ قلم سے، اس کی آنکھیں دیکھنے سے اور دماغ فکر سے جدا نہ ہوتا تھا۔ بیہقی کی تاریخ الحکماء میں لکھا ہے کہ اس نے چالیس سال سے زیادہ تحصیلِ علوم میں صرف کیے اور ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ کتابیں لکھیں، لیکن بدقسمتی سے اس کی زیادہ تر کتابیں ضائع ہو گئیں اور آج کیفیت یہ ہے کہ اس کی کل کتابوں کا دسواں حصہ بھی ہمارے پاس محفوظ نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی مصنفہ اور مترجمہ کتابوں کی کل تعداد ایک سو ستر سے ایک سو اسی تک پہنچتی ہے (بعض کتابیں کسی قدر طویل مقالے بھی ہو سکتی ہیں) مگر اس تعداد میں اب ہمیں ایک اور کتاب "غرۃ الزیجات" کا اضافہ بھی کر لینا چاہیے جو سید صمد حسین رضوی کی کاوشوں کی بدولت دریافت ہوئی ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی مگر بہت نادر قطعی طور پر نامعلوم کتاب ہے جس کا نام بھی البیرونی کی کسی فہرستِ کتب میں شامل نہیں تھا۔ سید صمد حسین رضوی کا کہنا ہے کہ اس کتاب کی موجودگی کا احساس سب سے پہلے انھیں ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر محمد ناظم کی کتاب ....

"LIFE AND TIMES OF MAHMUD OF GHAZNA"

کے مطالعے کے دوران ہوا، جسے کیمبرج یونیورسٹی پریس نے ۱۹۳۱ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۵۹ء میں انھوں نے اس کا اصل عربی مسودہ ہندوستان کی ایک لائبریری میں ڈھونڈ نکالا جہاں سے وہ اس کی فوٹو کاپی بدقت تمام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب ہندی علم ہیئت سے تعلق رکھتی ہے اور سنسکرت کی ایک گمشدہ کتاب "کرن تلک" مصنفہ وجے نندی پر اس کی بنیاد رکھی گئی۔ سید صمد حسین رضوی نے مسودے کی ضروری تصحیح و ترتیب کے بعد اس کا متن، انگریزی ترجمہ اور شرح کے ساتھ پہلی بار ۱۹۶۳ء میں حیدرآباد (دکن) کے ایک رسالے میں آٹھ قسطوں میں شائع کرایا۔ کتاب کا اصل مسودہ لائبریری درگاہ پیر محمد شاہ احمد آباد (بھارت) میں موجود ہے اور اس کی دیگر تفصیلات کے لیے سید صمد حسین رضوی کے مضمون

(A NEWLY DISCOVERED BOOK OF AL BIRUNI GHURRAT-UZZUAT)

مطبوعہ AL–BIRUNI COMMEMORATIVE VOLUME سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

کتاب کے پانچویں اور چھٹے باب میں البیرونی کی دو معرکتہ الآرا کتابوں (آثار باقیہ اور کتاب الہند) پر نقد و تبصرہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں وہ ہیں جنھیں جرمن مستشرق ایڈورڈ سخاؤ نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد مدون کر کے دستبرد زمانہ سے محفوظ کرنے کا انتظام کیا ہے اور ان کے انگریزی اور جرمن ترجمہ بھی شائع کرائے ہیں۔ کتاب "آثار الباقیہ" جس میں ازمنہ گزشتہ کے علمی آثار اور گزشتہ اقوام کے اخبار و روایات سے بحث کی گئی ہے، بیرونی کے قیام جرجان کی یادگار ہے اور اس کا پورا نام "آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ" ہے۔ اس کتاب کو البیرونی نے شمس المعالی قابوس بن وشمگیر والی جرجان کے نام معنون کیا ہے۔

دوسری کتاب "کتاب الہند" ہے، جس میں ہندوؤں کے مذہب، فلسفہ، ادب، جوتش، رسم و رواج اور قوانین وغیرہ کا مفصل بیان ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ہر مسئلے میں ہندوؤں کی مستند کتابوں سے اقتباسات دے کر ان کا نقطۂ

نظر واضح کیا جائے۔ بیرونی کا اس کتاب کی تصنیف سے یہ منشا ہرگز نہیں تھا کہ اس کے ذریعے ہندوؤں کے خیالات کی تردید کی جائے یا ان کے مذہب کے نقائص بتائے جائیں، چنانچہ اس نے کتاب کے مقدمے میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ بحث و مناظرہ کی کتاب نہیں کہ اس میں مخالفوں کے دلائل بیان کر کے ان میں، جو حق کے خلاف ہیں، ان کی تردید کی جائے۔ اس کے برعکس وہ چاہتا تھا کہ ہندو تہذیب اور ہندو تمدّن کی کہانی خود اہلِ ہند کی زبانی بے کم و کاست سنائی جائے اور اسی لیے وہ بار بار اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ میں کسی امر کے کذب و صدق کا ذمے دار نہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا وہ خود اہلِ ہند کی صحیح خیالات کا اظہار ہے اور اس میں کوئی کلام بھی نہیں کہ اس نے اہلِ ہند کے مذہب اور تمدّن کا بیان پوری نہیں تو خاصی بے تعصبی اور غیر جانب داری کے ساتھ کیا ہے۔ بعض اوقات خالص علم اور پیدائشی عقیدے کی بنا پر تعصّب و غیر تعصّب کا امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے ....

لیکن اکتاب کا سببِ تصنیف بیان کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ استاد ابو سہل عبد المنعم بن نوح الطفلسی کی مجلس میں یہ ذکر آیا کہ بالعموم مسلمانوں کی جو معلومات ہندوؤں کے بارے میں ہیں وہ نقائص و اغلاط سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ یہ معلومات ایسے تراجم و تصانیف پر مبنی ہیں جن کی صحت میں کلام ہے اور جن میں سے بعض قطعاً پایۂ تحقیق سے گری ہوئی ہیں۔ ابو سہل نے جب خود اس لٹریچر کا مطالعہ کیا تو البیرونی کی رائے سے اتفاق کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس کمی کو پورا کرے اور اس طرح ابو سہل کی فرمائش پر کتاب لکھی گئی۔

جیسا کہ البیرونی نے خود بھی "کتاب الہند" میں ذکر کیا ہے ہندو علوم کی تحصیل کے سلسلے میں اوّل تو ایک بڑی دشواری یہ تھی کہ اہلِ ہند اور اہلِ اسلام آپس میں بالکل مختلف تھے اور ان کی کوئی بات بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتی تھی۔ زبان، مذہب، رسم و رواج، طریقِ معاشرت، تمدّن غرض ہندوؤں کی ہر چیز مسلمانوں سے مختلف تھی اور پھر بھی پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں جب کہ محمود غزنوی کے مسلسل حملوں کی وجہ سے ہندو ابتر ہو رہے تھے۔ ان میں مسلمانوں سے شدید

نفرت پائی جاتی تھی، لہٰذا وہ ان سے کسی قسم کا میل ملاپ پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسے حالات میں ہندوؤں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا اور ان کے اندر رہ کر ان کے علوم سیکھنا انتہائی کٹھن کام تھا۔ البیرونی لکھتا ہے کہ جو کچھ یہ لوگ جانتے ہیں اس کو بتانے میں بخل سے کام لینا اور غیر قوم والے تو درکنار اسے خود اپنی قوم کے نااہل لوگوں سے بھی شدت کے ساتھ چھپانا ان کی سرشت میں داخل ہے، لہٰذا اس زمانے میں ان کے مذہب و فلسفہ اور ان کے علوم و فنون کی تحصیل کے سلسلے میں ان کا تعاون حاصل کرنا کچھ ایسا آسان نہ تھا۔ علاوہ ازیں ایک اور بڑی دشواری اس سلسلے میں یہ بھی تھی کہ ہندوؤں کے علوم و فنون اور مذہب و فلسفہ کا اصل مخزن سنسکرت زبان تھی اور سنسکرت کی دشوار اور پیچیدہ صرف و نحو اور لغت پر کامل دسترس کے بغیر ناممکن تھا کہ البیرونی ہندوؤں کے علوم اور ان کے ادق مسائل کو اس خوبی، صحت اور وسعت کے ساتھ سمجھ سکتا، جو "کتاب الہند" جیسی تصنیف کے لیے ضروری تھا۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ اس کتاب کی تصنیف سے پہلے جب وہ خوارزم سے غزنی پہنچا تو اس وقت اس کی عمر پینتالیس سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ اس عمر میں ایک ایسی زبان کی تحصیل جو بیرونی جیسے غیر ملکی اور غیر مذہبی آدمی کے لیے بے حد غیر مانوس اور مشکل الحصول تھی، بڑی ہمت کا کام تھا۔ فاضل مصنّف نے خود بھی ان دشواریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے البیرونی کے حوصلے کی داد دی ہے اور اس کے کام کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور بہت اہم نکتہ کی طرف بھی انھوں نے ہماری توجہ مبذول کرائی ہے اور اس کے ذریعے ابن رشد اور ابن سینا وغیرہ کے مقابلے میں البیرونی کے غیر معمولی امتیاز کو واضح کیا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ بے شک ابن رشد اور ابن سینا وغیرہ نے علوم یونان سے خود بھی بہت فیض اٹھایا اور دنیا کو بھی پہنچایا، مگر چونکہ وہ ارسطو اور جالینوس کی زبان سے بالکل ناآشنا تھے لہٰذا ان کا تمام تر انحصار ان عربی تراجم پر رہا جو دوسروں نے یونانی زبان کی کتابوں سے کیے تھے۔ یونانی علوم کے اصل سرچشموں تک براہِ راست پہنچنے کا انھیں کبھی خیال تک نہ آیا (یہ کہنا آسان ہے مگر ان بزرگوں کی عملی مشغولیات بھی مدِ نظر رہنی ضروری ہیں) ان کے مقابلے میں البیرونی کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے علوم ہند اور اہلِ ہند کے

حقیقی حالات پر مطلع ہونے اور دنیا کو ان سے واقف کرنے کی نیت سے ان کے ملک کی سیاحت کی۔ ان کی زبان سیکھی اور ان کی مذہبی اور علمی تصانیف تک براہِ راست رسائی حاصل کر کے ان کی بنیاد پر اپنا کام کیا۔ فاضل مصنف کے بقول اگر ایک اسی اعتبار سے دیکھا جائے تو حکمائے اسلام بلکہ حکمائے عالم میں البیرونی ایک غیر معمولی امتیاز کا مستحق قرار پاتا ہے ....

اب "کتاب الہند" جیسی اہم اور معرکہ الآرا تصنیف کے حوالے سے ممکن ہے کہ باب ششم کو تشنہ سمجھا جائے مگر اس سلسلے میں مصنف کی یہ معذرت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس کتاب کی اشاعتِ ثانی کے وقت وہ بعض دوسرے ابواب کی طرح باب ششم پر نظرثانی کر کے اسے بھی از سرِ نو لکھ سکتے تھے لیکن اس باب کو ہاتھ نہ لگانے کا سبب یہ ہوا کہ ان دنوں وہ "کتاب الہند" ہی کا ترجمہ کر رہے تھے اور ترجمے کی پہلی جلد پریس کو جانے والی تھی اب ان کے بقول اس وقت تک ان کے پاس اس کتاب کی تنقید کے لیے اتنا مواد جمع ہو چکا تھا کہ وہ مستقل اور جداگانہ حیثیت سے لکھے جانے کے قابل تھا اور اس کا "کتاب الہند" کے ساتھ ہی شائع ہونا زیادہ مناسب تھا۔

ساتویں باب میں البیرونی کے مساحتِ کرۂ ارض کا حال "قانون مسعودی" سے اخذ کر کے لکھا گیا ہے جس سے مساحتِ ارض کے اس محیر العقول کارنامے پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے جو البیرونی نے تحصیل پنڈدادن خاں ضلع جہلم کے ایک پہاڑی مقام (قلعہ نندنا) کو منتخب کر کے انجام دیا اور واقعی یہ بات ایک حیرت ناک کرامت سے کم نہیں کہ کرۂ ارض کے پورے دَور اور نصف قطر کی پیمائش کا کام البیرونی نے تن تنہا مختصر سے وقت میں انجام دے کر کم و بیش وہی نتائج حاصل کر لیے جو عہدِ جدید میں انتہائی ترقی یافتہ اور جدید ترین آلات کی مدد سے بڑی کوشش اور کاوش کے بعد حاصل کیے گئے ہیں۔ (اس بات پر شبہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو پچھلے حوالے، لیکن روایت نے ایسی جڑ پکڑ رکھی ہے کہ اس امتیاز سے اس کا نام ہٹ کر نہیں رہتا جب تک کسی اور کا کریڈٹ ثابت نہ ہو جائے نام البیرونی کا ہی چلے گا) ....

"قانونِ مسعودی" کا دیباچہ بھی مع ترجمہ بطور ضمیمہ کے اس کتاب میں شامل کیا ہے اور "قانونِ مسعودی" کے مضامین کی فہرست بھی ایک ضمیمے میں دے دی

کی یہ بدنامی بھی مسترد ہوتی ہے کہ وہ بطور خاص مسلمان نوجوان، سنجیدہ تحقیق و تصنیف سے شوق نہیں رکھتے تھے اور فنون میں صرف "فنونِ لطیفہ" پر وقت "ضائع" کرتے تھے۔

کاش کبھی محولہ بالا دو انگریزی کتابوں اور کراچی کانگریس کے یادگاری مجموعے اردو میں ترجے ہو کر ایک ہی ساتھ شائع ہوں، دو تین جلدوں میں آجائیں گے۔ وہ اور برنی صاحب کی یہ کتاب "البیرونی" تعارف اور متنازع فیہ امور پر مباحث ایک نادر مجموعہ کہلائیں گے۔

اس طویل "حرفے چند" کے لیے ایک مرتبہ پھر معذرت ..... لیکن! شاید یہ ضروری ہو گیا تھا۔ کتاب کے ممدوح اور مداح دونوں اپنے اپنے درجے میں غیر معمولی شخصیات ہیں۔ اول الذکر پر ایک بڑی مدت تک اردو میں جو کام ہوا وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ (ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور کی انسائی کلوپیڈیا میں البیرونی کا ذکر آزادی کے کافی بعد آیا ہے) دوم الذکر سید حسن برنی مرحوم کا نام تو پاک و ہند کے اردو حلقوں میں فراموش کیا ہی جا چکا تھا (تاآنکہ ہم نے مقالاتِ برنی کی پہلی جلد چھاپی)

یہ پاکستان میں "البیرونی" کا پہلا ایڈیشن ہے (یوں تیسرا ہے) اور پاکستان بننے کے بعد البیرونی پر جو کام ہوئے ان کا حوالہ ناگزیر تھا۔ جب حوالہ دینا ہے ہی تو کھل کر کیوں نہ دیا جائے۔ چنانچہ متعلقہ اداروں کے شکریے کے ساتھ کچھ اقتباسات دے دیے گئے۔ راقم تحقیق (اور تنقید) کا آدمی نہیں یہ بڑے مناصب ہیں۔ لیکن "البیرونی" (اور سائنسدانوں کی سوانح) سے خاص شغف رکھتا ہے۔ مصروفیات کے باوجود جو کچھ ذہن میں محفوظ تھا اسے تلاش کر لیا۔ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ دوسرے اہم حوالے رہ گئے ہوں۔ یہ بھی جو نقل ہوئے اردو اشاعتوں کی کیفیت (اور کمیت) دیکھتے ہوئے غنیمت ہیں۔ عنواناتی ترجے (صفحہ ۲۶ اور صفحہ ۲۸ تا ۳۱ بھی خود کیے ہیں جب کہ ترجے کی مہارت نہیں رکھتا۔ ان میں کوئی غلطی پائی جائے تو ذمہ داری راقم الحروف کی ہے۔ کیوں کہ ان کتابوں میں ترجے نہیں دیے گئے۔ وہ انگریزی میں ہے۔

جب یہ کتاب پہلی بار چھپی (۱۹۱۵ء) صاحبِ کتاب سید حسن برنی مرحوم کی عمر ان کے صاحبزادے آل حسن برنی کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق سترہ برس تھی۔

ہے۔ البیرونی کو ہیئت اور متعلقاتِ ہیئت سے جو غیر معمولی شغف تھا اس کے ثبوت کے لیے تو اس کی تصانیف کی فہرست ہی پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہے جو باب چہارم میں درج ہے، لیکن فاضل مصنّف کے بقول اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے "قانونِ مسعودی" کو دیکھنا ضروری ہے جو فنِ ہیئت میں بیرونی کی سب سے اہم اور ممتاز تصنیف ہے۔ "قانونِ مسعودی" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی نے متقدمین کی بہت سی غلطیوں کو درست کرنے کے علاوہ کتنے ہی ایسے طریقے اور قاعدے دنیا کے سامنے پیش کیے جن کی اختراع و ایجاد کا سہرا اس کے سر بندھتا ہے۔

کتاب کے آٹھویں باب میں البیرونی کی شخصیت پر مجموعی نظر ڈالی گئی ہے اور ہر ممکن زاویے سے اس کی عظمت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن بقول مصنّف تاریخ علوم میں البیرونی کی عظمت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جس غیر معمولی تبحرِ علمی کی ضرورت ہے اس کے بغیر تو اس کے علمی رتبہ و مقام کا اندازہ لگانا بھی ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کے باوجود دنیائے علم میں البیرونی کے رتبے و مقام کے تعین کی کوششیں بھی بہرحال ہوتی ہی رہی ہیں۔ مقدمہ تاریخ علوم (AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF SCIENCE) کا مصنّف جارج سارٹن چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر اور پانچویں صدی ہجری کے نصف اول کو ابنِ سینا کی بجائے البیرونی کے نام سے منسوب کرتا ہے۔ جرمن محقق ڈی بور، تاریخ فلسفہ اسلام میں لکھتا ہے کہ ابنِ سینا اپنے ہم عصر البیرونی سے علوم و حکمت اور جودتِ طبع میں کمتر پایہ رکھتا تھا۔ اسی طرح دورِ حاضر کا ایک اور جید عالم ایرانی مصنّف سیّد حسین نصر کہتا ہے کہ اگر بوعلی سینا کی کتابوں کی طرح البیرونی کی "قانون مسعودی" کا ترجمہ بھی اطالوی زبان میں بروقت ہو جاتا تو یقیناً اس کی شہرت بھی بوعلی سینا کی کتاب "قانون" ہی کی طرح ہوتی۔ اب ظاہر ہے کہ ایسے یگانہ روزگار اور نابغۂ عصر کے فضائل و کمالات کا کماحقہ احاطہ کرنا ایک چھوٹی سی کتاب میں تو کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا، لیکن البیرونی کی زندگی اور اس کے علمی کارناموں کے بارے میں یہ کتاب ہمیں جو معلومات فراہم کرتی ہے ان سے نہ صرف اس کی عظمت کے کئی گوشے بے نقاب ہوئے ہیں بلکہ ہندوستان میں بیسویں دہائی کے نوجوانوں

(انھوں نے سال پیدائش ۱۸۹۸ء بتایا ہے) اس وقت کے وسائلِ تحقیق اور قلّتِ ماخذات سامنے رکھیے تو یقین نہیں آتا کہ ایک بالکل نوعمر فرد نے اتنے اہم اور بڑے موضوع پر جو اس دور میں کوئی مقبول موضوع بھی نہ تھا، کتنا کام کر لیا۔ یہ کتاب سیّد حسن برنی مرحوم کو بھی ایک درجے کا نابغہ ثابت کرتی ہے اور بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی "جدّت پسندی"، ذہنی پھیلاؤ اور اردو کے معاملے میں دُور بینی پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ ۱۹۱۵ء جیسا زمانہ اور مولوی صاحب کی یہ منصوبہ بندی...... یقیناً وہ اور سیّد حسن برنی مرحوم سرسیّد، حالی، شبلی، کی روایتوں کے امین تھے مگر برنی صاحب مرحوم کے معاملے میں ان کی کم عمری اور یہ ذوق...... اور تلاش اور محنت ...... ایک اہم واقعے اور ہمارے عہد تک ایک زرّیں مثال کے طور پر اُبھرتے ہیں۔

انجمن یہ اشاعت بڑی خوشی اور فخر کے ساتھ پیش کر رہی ہے۔

(۱۹۹۰ء)

مقالاتِ برنی

(حصّہ دوم)

سیّد حسن برنی

پہلا ایڈیشن

اردو میں مقالوں کی روایت قائم کرنے کا سہرا جس کے بھی سر بندھے، اسے بیسویں صدی کے اوائل سے آگے بڑھانے والوں کی فہرست (جو بہت طویل نہیں بنتی) سید حسن برنی مرحوم کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ انھوں نے اسے وہ وسعت، بلندی اور گہرائی عطا کی، جو مغرب میں اس صنف کا خاصہ بن چکی تھی اور اردو میں بھی ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔

بابائے اردو برنی صاحب کو بہت پسند کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۳ء میں اُن کا ایک بہت ہی اہم مسوّدہ "البیرونی" کتابی صورت میں چھاپا (انجمن نے اُس کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۸۹ء میں شائع کر دیا ہے)...... اس کے علاوہ بابائے اردو کی فرمائش پر برنی صاحب نے دوسرے مقالے بھی تحریر کیے جو اپنے وقت کے مؤقر جرائد میں چھپتے رہے۔

"مقالاتِ برنی" کی جلد اوّل انجمن نے ۱۹۸۶ء میں شائع کی۔ یہ مجموعہ ملکی اور غیر ملکی سطح پر بڑی اہمیت کا حامل قرار دیا گیا۔ برنی صاحب ایک نہایت فاضل، طباع اور محنتی بزرگ تھے۔ بلند شہر (یو۔ پی۔ ہندوستان) میں ایک کامیاب وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت سے علمی اور تاریخی موضوعات پر پوری جستجو کے ساتھ اپنی بات کہنے والے ایک صاحبِ طرز مقالہ نگار کے طور پر معروف تھے۔ مگر اُن کی کاوشوں کے مجموعے عرصہ دراز تک پاکستان میں منظرِ عام پر نہ آ سکے۔ تقریباً دس برس پہلے اُن کے بڑے صاحبزادے سید ابنِ حسن برنی مرحوم نے انجمن کی یہ بڑی خدمت کی کہ مقالات کا پہلا حصہ انجمن کو عنایت کیا (جیسا کہ عرض کیا گیا۔ وہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا) زیرِ نظر مقالات اُن کے چھوٹے صاحبزادے نے انجمن کی فرمائش پر فراہم کر دیے

تھے مگر وہ بکھرے ہوئے اور زدہ حالت میں تھے۔ اُن کو مرتب کرنے کی کٹھن ذمہ داری ڈاکٹر اسلم فرخی نے اُٹھائی جو انجمن کے مشیر علمی ہیں۔ مقالاتِ برنی کی اشاعت میں مرحوم ابن حسن برنی کی بیگم نے بھی بطور خاص دلچسپی لی ہے۔

ان مقالات کے عنوان ہی ثابت کرتے ہیں کہ سید حسن برنی مرحوم کتنے مشکل کاموں میں ہاتھ ڈالتے تھے جب کہ آج سے ساٹھ ستر برس پہلے تحقیق کے لیے آج جیسی سہولتیں بھی میسر نہ تھیں۔ انھوں نے بعض ان موضوعات پر خاص توجہ دی جن کے حوالے سے متعصب مغربی محققین نے بڑی غلط فہمیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ یہ موضوعات تاریخی مغالطوں کی ذیل میں آتے ہیں اور نسل در نسل چلتے رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مصر میں اسکندریہ کا کتب خانہ مسلمان فاتحین نے جلادیا تھا....

کئی مقالے بڑی علمی شان رکھتے ہیں اور ہمارے ذہنی سرمائے میں بڑے اضافے کا باعث ثابت ہوں گے۔ "بلبن نامے کا ایک ورق" تو صرف برنی صاحب مرحوم ہی کی وجہ سے متعارف ہوا تھا.... فہرست عنوانات میں تنوع کے ساتھ ساتھ مصنّف کا وہ حسنِ انتخاب جھلکتا ہے جو صرف بڑی حیثیت کے فضلا ہی سے منسوب ہے.....

یہ انجمن ہی کا اختصاص ہے کہ اُس زمانے میں روشِ عام سے ہٹ کر ایسی کتابیں شائع کرتی ہے جن کی کھپت تجارتی بازار میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ مگر علم، فضیلت اور اعلیٰ درجے کی تحقیق اب بھی ہمارے فکری اور ثقافتی تقاضوں سے خارج نہیں ہوئے..... نہ ہو سکتے ہیں.... جامعات، کالجوں اور مؤقر کتب خانوں کے علاوہ افراد کی ایک تعداد اب بھی اعلیٰ پائے کے مقالات سے استفادہ کرنے کے لیے موجود ہے.... امید ہے کہ "مقالاتِ برنی" کی یہ جلد ان قارئین کو بہت پسند آئے گی .... راقم الحروف وہ علمی درجہ نہیں رکھتا کہ ان عنوانات اور برنی صاحب کی کاوشوں پر کوئی تنقیدی تو کیا تعریفی گزارشات بھی پیش کرسکے۔

(۱۹۹۱ء)

داستانِ سحر البیان

میر غلام عشرت

تدوین و ترتیب

ڈاکٹر احمد سجاد

پہلا ایڈیشن

کچھ گزارشات مروجہ آداب کے مطابق، کچھ تاثراتی جو امید ہے لائق توجہ قرار پائیں گے۔

ہماری اشاعتی مجلس نے اس مقالے کی اشاعت کچھ مدت پہلے طے کر لی تھی مگر بوجوہ اشاعت میں تاخیر ہو گئی۔ ان وجوہ میں اتنے ضخیم مسودے کی کتابت کا مسئلہ بھی شامل تھا کیوں کہ کراچی میں مقررہ مدت کے اندر معقول معاوضے پر عمدہ کتابت کرنے والے کاتب مفقود ہوتے جاتے ہیں۔ چند مہینوں سے انجمن آہستہ آہستہ نئی میکانکی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے لگی ہے "قومی زبان" اور "اردو" اس کوشش کے تازہ ترین نمونے ہیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ آئندہ ہماری بیشتر کتابیں کسی نہ کسی میکانکی نظام کے تحت چھپیں گی۔ آج کل کئی نظام متعارف ہو رہے ہیں) بعض خطِ نوری نستعلیق، نہایت مہنگے، بعض نسبتاً کم مہنگے ..... مگر وقت کے تقاضے ہمیں بھی کسی کی طرف لے جائیں گے۔ سب سے بڑا مسئلہ اعراب کا ہے۔ یہ نظام تاحال اعراب نہیں رکھتے۔ کمپوزنگ کے بعد اعراب ہاتھ سے لگوانے پڑتے ہیں جو ایک مشکل کام ہے (مہنگا سودا بھی) اس لیے فی الحال ایسے نظاموں کے ذریعے چھپنے والی کتابیں اعراب کے بغیر چھپ رہی ہیں۔ بعض میں ضرورت بھی نہیں پڑتی لیکن جہاں اعراب ناگزیر ہیں ان کی عدم موجودگی سے کوفت ہوتی ہے اور بعض الفاظ کے مطالعے میں قاری پریشان بھی ہو سکتا ہے۔ ماہرین اس تگ و دو میں ہیں کہ اعراب کا مسئلہ بھی ہو جائے۔ امید ہے کہ ہو جائے گا۔

سب سے پہلے فاضل مصنف پروفیسر محمد مجید کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہوں نے انجمن کو یہ مقالہ شائع کرنے کی اجازت دی۔

وجہ تصنیف پر مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم اور فاضل مصنف نے جو کچھ

فرما دیا ہے اس پر کوئی اضافہ نہ ضروری ہے نہ مناسب ..... ایک جزوی سی بات عرض کر دی جائے۔ جب مولانا عرشی مرحوم نے اپنا پیش لفظ لکھا تھا (۱۹۷۷ء) اس کے بعد سے پاکستان میں قدیم روہیل کھنڈ و رام پور کی ادبی خدمات پر کافی کام ہوا ہے جو اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ تازہ ترین ایک چار جلدی ضخیم تالیف ہے۔ عنوان "تاریخ شعرائے روہیل کھنڈ" جسے ایک خاموش محقق اور فاضل بزرگ جناب شایان بریلوی مرحوم نے برسوں کی تحقیق اور کاوش کے بعد مرتب کیا ہے اور یہ حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ پاکستان ایجوکیشن سوسائٹی کراچی کے بانی و مہتمم اعلیٰ جناب مولوی الطاف علی بریلوی اور پروفیسر محمد ایوب قادری نے بھی اس جہت میں کئی منصوبے شروع کیے تھے مگر وہ سب ان کے انتقال کے سبب تا حال مکمل ہو کر شائع نہیں ہو سکے۔ امید ہے کہ کبھی نہ کبھی منظرِ عام پر آ جائیں گے۔

خود پروفیسر احمد سجاد صاحب نے اس مقالے میں معیار کے لحاظ سے عشرت بریلوی کی شاعری سے ایسے شواہد مہیا نہیں کیے جو انھیں اپنے وقت کا ہی سہی ایک اہم شاعر ثابت کریں۔ یوں اس زمانے کے تقریباً ہر خطۂ ہند میں ہزاروں شعرا ملتے ہیں۔ اگر "خم خانۂ جاوید" مکمل ہو جاتا تو اردو شعرا کی تعداد لاکھوں سے اوپر جاتی۔ اسم نویسی کی حد تک یہ بھی ایک قسم کی تاریخی ضرورت ہے اور عشرت صاحب کی ایک خصوصی شعری تصنیف "ریاض الحسین" میں اشعار کی مبینہ تعداد (تیرہ ہزار پانسو اسی) اور "پدماوت" کا تکملہ ہی انھیں بہت سے، محض تک بند ہی نہیں، صاحبِ دیوان، باقاعدہ شعرا، سے ممیز کرتے ہیں مگر اعلیٰ معیارِ شعر کے باب میں نہ کسی مستند نقادِ عصر کی سند دستیاب ہے نہ شعروں کے نمونے۔ بہ حیثیت شاعر ان کی اہمیت بقول مصحفی "جوان کثیر الکلام" سے زیادہ ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں چوں کہ "ریاض الحسین" کا اصل حوالہ مذہبی ہے اس لیے ہمیں اسے ایک الگ مقام دینا پڑے گا۔ بہرحال دنیائے ادب میں کسی ممدوح کی ادبی صفات کو اس کی کسی ایک خوبی کی وجہ سے تمام اعلیٰ مقامات پر فائز کرنا ضروری نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض جواہر قابل کو بہت سی وجوہ سے نہ صرف اپنی

زندگی میں ایسی سند قبول یا شہرت نہیں ملتی جو اُن کے بعد کسی مدت تک جاری رہے۔ بعض کو ان کے انتقال کے بعد بھی بہت دن تک پہچانا اور مانا نہیں جاتا ہے اور پھر کبھی نہ کبھی زمانہ انھیں اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیتا ہے کہ پچھلوں پر حیرت ہوتی ہے۔ اس وقت ان وجوہ کی تفصیلات اور بے شمار مثالوں پر گفتگو ضروری نہیں۔ قارئین ادب خوب واقف ہیں......

شاید جناب عشرت بریلوی کے سلسلے میں یہ جاننے کے لیے زیادہ تحقیق کی ضرورت پڑے کہ اپنے وقت میں نہ صرف اتنی کثیر التصانیف، بارسوخ، اور معروف شخصیت ہونے کے باوجود جب کہ ان کے شاگرد بھی کافی تھے اور بعد میں ان کی ذریت بھی بڑی معاشرتی اہمیت کی حامل رہی، وہ کیوں اپنے نامور معاصرین کے فوراً بعد کی صف میں بھی نہ آسکے۔ اور آج بھی کہ پروفیسر احمد سجاد نے ان کا اتنا تفصیلی تعارف کرایا ہے ان کی شاعری کسی اہم دریافت کی ذیل میں بھی کیوں نہیں آسکی۔ غزلیں کم ملی ہیں اور جو ملی ہیں۔ وہ اپنے عصری تناظر میں بھی کوئی قابل ذکر حیثیت نہیں رکھتیں۔ ان کے معیارِ شعر (نہ کہ مقدار) پر خود پروفیسر احمد سجاد نے ایسی قدیم وجدید آرا نقل کی ہیں جو ہمیں ان کی طرف سے خوش گمان نہیں کرتیں۔ کاش کبھی ان کے دواوین دستیاب ہو جائیں اور ان کا ایک بھرپور مطالعہ ان کا کوئی بہتر مقام متعین کر سکے۔ صفحہ ۴۸-۴۷ پر دو مندرجات بڑے دلچسپ ہیں.... اسی ضمن میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی رائے (صفحہ ۲۰) جو دراصل رائے بھی نہیں۔ ایک تاریخی اسم نویسی کے ساتھ بے نیازی کا سا انداز ہے۔ اس پر حکیم قطب الدین باطن صاحب کا "گلستانِ بے خزاں" پر تبصرہ (صفحہ ۲۱-۲۰) ملاحظہ ہو۔ حکیم صاحب شیفتہ کی اس بے نیازی پر نہ صرف شیفتہ کو عشرت سے رشک وعداوت میں مبتلا (؟) بلکہ خارج از آدمیت بھی قرار دیتے ہیں، مگر عشرت کی تعریف میں یہ فرماتے ہوئے کہ "کیا تحریر ہے کیسی تقریر ہے" کون سے شعر بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

تاعمر اگرچہ میری بھی تحریر شرط ہے
لیکن مزاج پائے تو تقریر شرط ہے
تدبیر پیش چلتی نہیں ہے کسی طرح
عشرت ہر ایک کام میں تقدیر شرط ہے
تا مرگ زندگی میں ہجراں کے غم اُٹھائے
بالیں پہ میری جاناں، افسوس تم نہ آئے

"خود معرکہ زیبا" کے ناصر صاحب جو بعض سخت متنازعہ فیہ بیانات اور رویوں کے باوجود مجموعی طور پر ایک بہت اہم تذکرہ و تبصرہ نگار مانے جا چکے ہیں ان کے لیے یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں (صفحہ ۲۲) "شاعر کثیر الحیثیت میر غلام علی عشرت علی، ساکن بریلی بقول مصطفےٰ خاں صاحب تذکرہ چار باغ شاگرد لطف علی بیگ لطف کا قصہ پدماوت تصنیف کیا ہوا. اس کا مؤلف (ناصر) کی نظر سے گزرا ہے۔ تلاش کم اور بے ربطی بہت سی اس میں ہے۔" دیگر تذکروں کی مثالوں میں بھی رسمی یا چلیے کسی قدر واقعی مداحی کے باوجود کوئی شعر ایسا نقل نہیں کیا جو دل کو چھو لے۔ "جلوۂ خضر" میں البتہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ غزل اُن کی مشہور ہے:

شبِ وصال میں دل پر قلق ابھی سے ہے
سحر ہے دور، مرا رنگ فق ابھی سے ہے

ڈاکٹر لطیف بھی ایسے معدودے چند اشعار کا حوالہ دیتے ہیں جن میں فضا کی تازگی اور اثر انگیزی ہے (صفحہ ۴۸)

بہرحال، جیسا کہ عرض کیا گیا عشرت کے غزلیہ کلام سے چند دُرِّ آبدار دستیاب ہوئے لیکن انھیں اس حوالے سے آج بھی کوئی تاریخی مقام نہیں دیا جا سکتا گو دیگر شعری تخلیقات کی ایک اپنی جگہ متعین ہو سکتی ہے۔ حیرت ہے کہ اتنی طویل مثنوی "ریاض الحسین" کے بارے میں (صفحہ ۴۱ پر) پروفیسر احمد سجاد کو "اعلیٰ درجے کی شاعری نہیں صرف واضح بیانات ملتے ہیں۔" لیکن ساتھ ہی وہ شہادت امام حسینؓ کا منظر بڑا دردناک اور اثر انگیز بتاتے ہیں۔ چوں کہ راقم، پوری مثنوی کے دیدار سے محروم ہے اس لیے اس کی ادبی حیثیت پر کوئی تاثراتی رائے بھی پیش

نہیں کر سکتا (تنقید کا تو ادعا ہی نہیں) لیکن ایسے معاملات میں تفوق عقیدت کو حاصل ہوتا ہے اس لیے اس حوالے سے عشرت بریلوی کے لیے دل سے دعائے خیر ہی نکلتی ہے۔ امام حسین علیہ السلام کے حوالے سے تیرہ ہزار سے زیادہ شعر کی مثنوی لکھ دینا ایک بڑے ثواب کا کام تھا اور اتنی مقدار بھی دوسری تصنیفات کے ساتھ ساتھ ان کی زود گوئی اور محنت کا ثبوت ضرور دیتی ہے۔ جب تک یہ نسخہ ہمارے سامنے آئے۔ صفحہ ۴۲ پر ڈاکٹر لطیف کی مختصر رائے ہی سیر حاصل مانی جا سکتی ہے۔

اب کچھ اصل موضوع یعنی "داستان سحرالبیان" اور اس پر فاضل مصنف پروفیسر احمد سجاد کی محنت کے حوالے سے.....

اس میں شک نہیں کہ پروفیسر صاحب نے اس موضوع پر ایک تحقیقی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ "اردو نثری داستانوں" میں جو تشنگی اس داستان کے باب میں تھی وہ پوری بھی ہوتی ہے اور مخطوطے (اس اشاعت) کے مختلف مقامات کی نقل سے عشرت کی کاوشوں کے ایسے کئی رنگ اور نمونے سامنے آتے ہیں جو اتنے کثیر الصفحات متن کو دلچسپی کے ساتھ پڑھنے کی ہمت دلاتے ہیں۔

نہ جانے کیوں، پروفیسر صاحب صاف صاف یہ فرمانے سے گریز کر گئے کہ داستان کا نام صرف مثنوی سحرالبیان کی "امکانی شہرت" ہی سے نہیں، کھلے طور پر مثنوی کے نام سے متاثر ہو کر رکھا گیا۔ مثنوی کو تیس برس کا تقدم زمانی حاصل ہے۔ وہ اپنے وقت ہی میں زبان زد خاص و عام ہو چکی تھی، عشرت بریلوی ایک واقف ادب شخصیت تھے، جیسا کہ پروفیسر احمد سجاد نے خود قدم قدم پر فرمایا ہے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ مثنوی کے نام اور متن سے متاثر نہ ہوں، جب کہ بہت سے کردار اور داستان کے مقامات بھی مماثل ہیں۔ انھوں نے اسی عنوان سے کوئی دوسری شعری کاوش تو کی نہیں کہ عنوانی سرقے کے مرتکب کہے جائیں یا میر حسن جیسے استاد سے ٹکرائیں انھوں نے تو اس نام سے متاثر ہو کر اس سے ملتی جلتی گو کئی لحاظ مثلاً کرداروں کی تعداد، واقعات وغیرہ کے لحاظ سے مختلف بھی، ایک طویل نثری داستان لکھی ہے جس میں بقول پروفیسر احمد سجاد خود ان کا اپنا تخیل اور اسٹائل بہت کارفرما

ہے۔ راقم کی ناچیز رائے میں پروفیسر احمد سجاد کو اس تکلف کی ضرورت نہ تھی۔

"ظاہر ہے کہ ۳۰ برس پہلے کی ایک مشہور و معروف مثنوی سے کسی فنکار کا استفادہ کرنا غیر ممکن نہیں ہوسکتا ہے۔"

کیوں کہ آگے چل کر خود فرماتے ہیں:

"واقعہ بھی یہی ہے کہ عشرت بریلوی نے میر حسن سے استفادہ ضرور کیا ہے مگر اس سے ان کی داستانی فنکاری اور تخیل کی بوقلمونی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کیوں کہ علم و ادب کی دنیا میں ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔"

(باب منظوم و منثور داستانوں کا فرق)

یہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ میر حسن کی مثنوی سے متاثر ہوئے اور انھوں نے بھی ایک داستان لکھنے کی سوچی (ایسے ماخذات یا کہانیاں تو تاریخ میں ہمیشہ سے گڈمڈ اور پھیلے ہوئے چلے آتے ہیں۔ وہ کسی کا اجارہ نہیں مانے جاتے) انھوں نے سوچا کہ اس مثنوی سے ٹکر لینا تو ممکن نہیں لیکن اس سے ایک جائز استفادہ کرتے ہوئے ایک اپنی داستان نثر میں کیوں نہ لکھی جائے۔ چنانچہ انھوں نے لکھ دی .... کاش وہ اس کا نام "سحر البیان" نہ رکھتے کہ اس طرح اس وقت بھی ایک مستند سینئیر سے مقابلے کا اشتباہ پیدا ہوا ہوگا اور آج بھی یہ اچھا نہیں لگتا۔ آج ایسے اتباع اساتذہ و معاصرین کی کوئی تنازعاتی حیثیت نہیں لیکن اگر نام رکھ لیا تو کوئی ہرج بھی نہیں۔ آج ایسی اشاعتیں (پرانی) زبان کے ارتقا، معاشرتی مطالعے اور عصری تجزیوں کے لیے پڑھی جاتی ہیں۔ اصل مسئلہ خود داستان کا ہے۔ اور اس کے تعارف، تجزیے اور تبصرے میں پروفیسر احمد سجاد نے ہزار پہلو سے قاری کی بڑی رہنمائی کی ہے۔

اردو کی نثری داستانوں پر ڈاکٹر گیان چند کی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" ہے جو خود بابائے اردو کے انتخاب پر انجمن نے ۱۹۵۴ء میں شائع کی (اور ان کے بعد ہم نے ڈاکٹر جین صاحب کی ترتیب نو کے بعد دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں چھاپا ہے)

آج بھی اس موضوع پر غالباً سب سے اہم بوطیقا کی حیثیت سے اسی کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ حیرت ہے انھوں نے اس داستان پر کوئی سیر حاصل گفتگو نہیں کی۔ وہ اس کا نام بھی قصہ سحرالبیان بتاتے ہیں (صفحہ ٦٧٠) اور حوالہ اسٹیٹ لائبریری رام پور کا ہے یعنی اغلباً وہی مخطوط جس کے متن کو تاحال دستیاب مخطوطات میں سے اس اشاعت کے لیے فاضل مرتب پروفیسر احمد سجاد صاحب نے ترجیح دی ہے۔ بہرحال یہ معاملہ ان تحقیقی نزاکتوں میں شامل ہے۔ جو راقم الحروف کی استعداد سے بالا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پروفیسر احمد سجاد نے اس موضوع پر ایک بڑا تحقیقی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس سبب سے ایک ایسی نثری داستان معروف ہوئی ہے جس سے اردو کے پرانے اساتذہ اور محققین تو واقف ہو چکے ہوں گے مگر آج کے اساتذہ محروم ہیں۔ ہم عام قارئین کے لیے بھی سحرالبیان کا عنوان صرف میر حسن کی مثنوی سے ہی وابستہ چلا آ رہا ہے۔ آج کے عام قاری کے لیے یہ اشاعت نہ صرف ایک انکشاف ہے بلکہ ایک بہت دلچسپ مطالعہ بھی ..... مقالے کے اہم ترین حصے ان ابواب پر مشتمل ہیں۔

(۱) داستان سحرالبیان کے مختلف نسخے
(۲) قصے کا خلاصہ
(۳) منظوم و منثور داستانوں کا فرق
(۴) ماخذات پر گفتگو
(۵) اسلوب وغیرہ کا بیان

کل ابواب جو ۵۱ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ پروفیسر احمد سجاد کی تلاش، محنت اور حسنِ ترتیب کے داد خود ہیں۔ متن بھی قارئین کے سامنے ہے۔ راقم الحروف نہایت ادب کے ساتھ یہ کہنا چاہے گا کہ اپنے ممدوح کی مداحی میں فاضل پروفیسر صاحب نے مثنوی سحرالبیان، میر حسن دہلوی اور بہت سے مشتاقانِ سخن کے ساتھ ایک فیصلہ دیتے ہوئے زیادتی کر دی ہے..... اس طرح کہ کسی تفوق و امتیاز قائم کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"....... فنِ داستان: سراپائی کے نقطۂ نظر سے عشرت کی داستان سحر البیان کو مثنوی پر بدرجہا فوقیت حاصل ہے۔"

"داستان" کیا ہوتی ہے۔ اس لفظ پر اردو تو کیا انگریزی میں بھی کوئی متفق الیہ فتوےٰ موجود نہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی اپنی کتاب میں بہت سے مباحث کے باوجود نہ کسی کو بطور سند نقل کیا نہ اپنی طرف سے کوئی فیصلہ صادر کیا جو اردو میں نثری اور منظوم داستانوں کے لازمی عناصر ترکیبی بتائے۔ بہت سے عناصر ترکیبی بیان ہوتے رہے ہیں مگر تاحال کوئی حرف آخر اس باب میں سامنے نہیں آیا۔

..... نہ شاید آ سکتا ہے۔ پلاٹ، کردار، جزئیات .... سیکڑوں عناصر ہیں جن سے ایک داستان بنتی ہے۔ ایک افسانہ، ایک قصّہ ترتیب پاتا ہے، لیکن صرف کوئی ایک عنصر یا چند عناصر ایسے تقابلی تفوق کی اجازت نہیں دیتے جو پروفیسر صاحب مثنوی سحر البیان کے خلاف دے گئے ہیں۔

مزید یہ کہ نہ تو مثنوی سحر البیان کے مصنف نے دعویٰ کیا کہ وہ ان عناصر اور شرائط کے ساتھ قصہ سنا رہے ہیں جن کو فاضل مرتّب نے معیارِ فوقیت بنایا نہ میر حسن کے نقادوں نے اسے تکنیکی اعتبار سے (گو داستان کی کوئی تعریف جیسا کہ عرض کیا متفق الیہ نہیں ہے) ایسا پارۂ ادب قرار دیا۔ جس میں "فنِ داستان گوئی" کے تمام آداب کامل طور پر ملحوظ رکھے گئے ہوں۔ مثنوی سحر البیان پر لاکھوں صفحات لکھ دیے جائیں تب بھی اس کی صفت اس کا سحر البیان ہی ہے۔ وہ اردو سے کبھی خارج نہ ہو سکنے والا ایک ایسا ادب پارہ ہے جس کا حسن اور تاثیر آج بھی تمام اردو دانوں کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ "گلزارِ نسیم" سے مسلسل تقابلی موازنے اور دلی، لکھنؤ کی تمام لسانی آویزشوں کے باوجود، مثنوی سحر البیان کی تاثیری فوقیت آج بھی مسلم ہے ...... اس سے اس نثری داستان کا کیا مقابلہ ...... یوں بھی یہ امر محلِ نظر ہے کہ کچھ اپنے معیار قائم کر کے اس کے مطابق کسی کو کسی پر ایسی "بدرجہا" فوقیت دے دی جائے۔ مثلاً ہم بھی طے کر دیں کہ شعر کے باب میں مقدار آ۔ فوقیت حاصل ہے تو

اردو دیوانِ غالب پر نہ جانے کتنے، شاید لاکھوں، دیوان فوقیت کے حامل کہلائیں گے۔

ہماری پرانی داستانیں معاشرتی مطالعے بھی کہی جاتی ہیں، ہمیں زیرِ نظر داستان کو اس طرح بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ اپنی نوع کی دوسری داستانوں کے مقابلے میں اس نقطۂ نظر سے کیا اضافے پیش کرتی ہے۔ پروفیسر احمد سجاد کی رہنمائی میں اور اپنے طور پر بھی ہمیں داستانِ سحر البیان کا معاشرتی مطالعہ ہی اس کی اشاعت کے لیے سب سے بڑی ترغیب ثابت ہوا ہے۔

اب کہ یہ داستان عام ہوئی، امید ہے کہ اردو کے اساتذہ اور قارئین اس سے پورا پورا فیض اٹھائیں گے۔ ہم پروفیسر احمد سجاد کا شکریہ ایک بار پھر ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے اس مخطوطے کی اشاعت کا اعزاز انجمن کو بخشا۔

(۱۹۹۱ء)

اردو

قومی یکجہتی اور پاکستان

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

مقدمہ

جمیل الدین عالی

پہلا ایڈیشن

تکلف بر طرف اگر اس مقالہ کا عنوان وہ نہ ہوتا جو ہے تو راقم الحروف کو یہ "حرفِ طویل" لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی ... مگر مصنّف کا تجویز کردہ عنوان نہیں بدلا جا سکتا (جو برسوں سے معروف بھی ہے) ...... بلکہ یہ عنوان پاکستان میں قومی یکجہتی کے ہر آرزو مند اور کارکن کے لیے مزید سوچ بچار اور تحریر کے لیے ایک رہنما ترغیب ہے۔

تقسیمِ ہند سے پہلے تک حصولِ پاکستان کے لیے مسلمانوں میں جو بے مثال یکجہتی پیدا ہو چکی تھی یہ کتاب اس کی ایک نہایت بیش قیمت تاریخی دستاویز ہے جو مطالعے، فراست اور محنت سے ترتیب دی گئی ہے۔ ہر باب کے آخر میں تفصیلی اشاریہ اس امر کا ثبوت ہے کہ فاضل مصنّف نے کتنی چھان بین کی ہے اور اپنے بیانات کے لیے کیسے مستند ذرائع سے حاصل شدہ شواہد پر اپنے موقف کی بنیاد رکھی ہے۔

انجمن، ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ممنون ہے کہ انھوں نے یہ مقالہ اشاعت کے لیے انجمن کو عنایت کیا۔ اس میں شک نہیں کہ تحریکِ پاکستان کے حوالے سے اُردو کے کردار پر خاصا قیمتی اور مستند مواد کئی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے مگر وہ اقتصادی اور سیاسی مسائل، معاملات اور مباحث کے ساتھ آمیز ملتا ہے۔ خاص اس موضوع پر راقم الحروف کی معلومات کے مطابق اب تک یہ سب سے جامع اور منفرد دستاویز ہے۔ گو بعض مقامات پر تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کے بیانات کسی قدر ان کی داخلیت پسندی یا ان کے اپنے موقف کی روشنی میں مرتب شدہ بھی نظر آتے ہیں مگر اس کا بہرحال انھیں حق ہے۔

تقسیمِ ہند ایک حقیقت بن چکی ہے۔ پاکستان پر آزادی کے چوالیس سال گزر چکے ہیں اب یہ عرض کرنا کوئی رسم پوری کرنا نہیں بلکہ ایک انسانی دردمندی اور

سچائی کا تقاضا ہے کہ ہمیں اور ہندوستانیوں کو مستقبل کی طرف دیکھنا بلکہ اُسے مل جل کر تعمیر کرنا ہی آنسب ہے اس طرح کہ ہم اپنے ماضی کی تلخیاں فراموش کرنے کی کوشش کریں، اپنے تعصبات اور شاونیت کو ختم بالفی الحال یہ پوری طرح ممکن نہیں تو انھیں کم سے کم ہی کرتے ہوئے اپنے مشترکہ مصائب و مسائل سے جو سامراج چھوڑ گیا ہے اور جو ہماری غیر متناسب طور پر بڑھتی ہوئی آبادیوں، اقتصادی پس ماندگی، بعض پارٹیوں، طبقات اور افراد کی تنگ نظری کے بیپاک سے آمیز ہیں عہدہ برا ہونے کی مشترکہ منصوبہ بندی پر سوچیں۔ یہ خیال اس وقت صرف ایک آئیڈیل نظر آئے گا لیکن مستقبل یا جدید تر دور میں اکیسویں صدی کے تقاضے (اور بائیسویں بھی آنی ہے) ہم دونوں، بشمول وسط ایشیا کو جلد یا بدیر اس آئیڈیل کی طرف جانے کے لیے مجبور کر کے رہیں گے۔ راقم الحروف اس وقت تقسیم ہند کی مسلمہ ناگزیرت پر مزید روشنی نہیں ڈالے گا۔ صرف اتنا کہنا چاہے گا کہ تاریخ اپنے اس باب کو ان مٹ طریقے سے لکھ چکی ہے اب اگلے ابواب ہمیں اور آئندہ نسلوں کو لکھنے ہیں۔ اُردو اس مجوزہ قربت میں ایک بڑا کردار ادا کر سکتی ہے۔

تقسیم سے پیشتر ہندی مسلمانوں میں قومی یکجہتی پیدا کرنے یا انھیں علیحدہ قومیت کا احساس دلانے میں اُردو نے ایک مرحلے سے جو کردار ادا کیا اس کی تقریباً تمام تفصیل اس دستاویز میں آ چکی ہے۔ اس طرح یہ مقالہ، یہ کتاب اس موضوع کے طالب علموں ہی نہیں بد قسمتی سے آج پاکستان میں متعدد خطرات میں مبتلا قومی یکجہتی کے قیام اور استحکام پر سوچنے والوں کے لیے بھی نہ صرف ایک مستند پس منظر بلکہ ایک ایسے بابِ نصاب کی حیثیت رکھتی ہے جسے ہم باب اول بھی کہہ سکتے ہیں۔

انجمن نے نہایت خوشی اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی اجازت سے اس کتاب کے آخر میں دو اور بیش قیمت مقالے شامل کر دیے ہیں ایک انجمن کے پاکستان میں محسن و متولی پیر حسام الدین راشدی مرحوم کا مقالہ "اُردو زبان کا اصلی مولد سندھ" اور دوسرا جامعہ سندھ کے شیخ الجامعہ، ایک عظیم فرزند سندھ اور پاکستان کے منفرد و نامور مفکر ڈاکٹر آئی آئی قاضی مرحوم کا مقالہ (اُردو ترجمہ از جناب الیاس عشقی) "اُردو کیا

ہے"۔ ثانی الذکر مقالہ ڈاکٹر صاحب کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو انھوں نے 1938ء میں "یومِ اردو" پر کراچی میں قراردادِ پاکستان، لاہور (1940ء) سے دو برس پہلے پیش کیا تھا۔ اس کے متن میں ڈاکٹر قاضی مرحوم کی ایک اپنی خاص تحقیق کی جھلکیاں بھی ہیں جن کا اشاریہ اتفاق سے دستیاب نہیں لیکن قارئین ملاحظہ کریں گے کہ ڈاکٹر صاحب جیسے فاضل اجل کی بیشتر کوشش اُردو کے خلاف اس غیر منطقی تعصب کو ردّ کرنے اور کرانے پر مرکوز تھی جو اس زمانے میں بعض اُردو مخالف حلقوں میں زور پکڑ گیا تھا۔ وقت نے بتایا کہ ڈاکٹر قاضی مرحوم کی یہ کوشش کامیاب رہی اور اُردو کے حق میں سندھ سے بھی اتنے ہی بلند اور مؤثر نعرے بلند ہونے لگے جتنے دوسرے مقامات سے ہو رہے تھے ..... برسبیل تذکرہ راقم نے اوسلو میں (ڈنمارک کے شہری مگر ناروے میں) اُستادِ اُردو ڈاکٹر فین تھیئسین (استاد اردو) سے URD اور URDISH کے الفاظ اور معانی اسکینڈی نیویائی لغات میں تلاش کرائے (1987ء) وہ ڈاکٹر قاضی کی تحقیق پر حیرت کرتے رہے۔

اس بے مثال پس منظر یہ سواد کے ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا، گو کافی اختصار سے (یہ "حرفے چند" ایک مضمون ہے کوئی باقاعدہ مقالہ نہیں) کہ تقسیم ہند یعنی قیامِ پاکستان کے بعد بھی قومی یکجہتی کے معاملے میں اُردو نے کیا کردار ادا کیا، کن دشواریوں سے گزری، اب کس حیثیت میں ہے اور مستقبل کیسا نظر آتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب سے یہ تو واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ قیامِ پاکستان کی وجوہ میں مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی عوامل کے ساتھ ساتھ اُردو کا پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان ہونا ایک لازمی عنصرِ تحریک کی حیثیت اختیار کر گیا تھا کیوں کہ یہ پورے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں ان کی اپنی اپنی بڑی مضبوط مادری زبانیں ہونے کے باوجود ایک مشترک ثقافتی رابطہ و علامت بن چکی تھی اس کے بعد پاکستان بنتے ہی بانیٔ پاکستان کا یہ بیان بھی جو ان مرحوم و مغفور نے چٹاگام کے ایک جلسۂ عام (1948ء) میں ایک واضح حکم کے طور پر دیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی ہماری قومی تاریخ کے بر ریکارڈ پر ہے۔ لیکن بنگلہ دیش میں اُردو بہ حیثیت قومی زبان کی مخالفت بھی آزادی کے کچھ عرصے بعد سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ دراصل

اپنی بیماری اور ایک طویل فضائی سفر کی صعوبت کے باوجود قائداعظم کے کراچی سے چٹاگانگ جانے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ انھوں نے یہ خطرہ پوری طرح محسوس کرلیا تھا اور مخالفت کے گڑھ میں ہی پالیسی بیان دینے کی غرض سے تشریف لے گئے تھے۔ یہ بھی تاریخ ہے کہ اس وقت آپ محترم نے بیرونی شہ پر کام کرنے والے شرپسند مخالفین اور بعض اپنی خود ساختہ سچائیوں کے مطابق مخالفت کرنے والوں کی زبان بھی بہت دن کے لیے بند کردی تھی۔

لیکن ان کی وفات کے بعد جو اُسی سال واقع ہوگئی دوسرے سیاسی عوامل اور مشرقی و مغربی پاکستان کی باہمی سیاسی کشمکش اور نئے پرانے معاشی تضادات اس طرح اُبھرے اور ان میں ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں کہ اُردو مشرقی پاکستان میں کم از کم نظری طور پر واحد قومی زبان نہ مانی جاسکی گو وہ وہاں حسبِ سابق خوب بولی اور سمجھی جاتی رہی۔ مسلسل سیاسی دباؤ کی الجھنوں سے متاثر ہونے والے ہمارے پہلے دستور (1956ء) کو دو قومی زبانیں......اُردو اور بنگلہ...... تسلیم کرنی پڑیں۔ یہ الگ بات کہ راقم الحروف سمیت لاکھوں کروڑوں مشاہدین کے مطابق اُردو نہ صرف دونوں خطوں میں رابطے کی زبان تھی بلکہ بنگلہ دیش میں خوب بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔ جب کہ بنگلہ کا چلن مغربی پاکستان میں تھا ہی نہیں۔ اس لیے کہ اُردو پہلے سے پورے جنوبی ایشیا بشمول بنگال اور آسام میں بول چال، رابطے اور ادب و تدریس کی زبان کے طور پر جم چکی تھی اور بنگلہ اپنی قدامت، اہمیت اور خوبصورتی کے باوجود ایک علاقائی زبان ہی مانی جاتی تھی (اس میں پوتھی ادب کی وجہ سے اس کا ایک بڑا رنگ اسلامی تھا) اب بھی ہندوستان میں بنگلہ ریاستی حیثیت کی زبان ہے مگر اپنے ہمسایہ ہندی لتی کے صوبوں مثلاً بہار، سی۔ پی اور یو۔ پی تک میں نہیں پھیل سکی جب کہ (مغربی) بنگال میں بول چال کی اُردو بہ آسانی بولی اور سمجھی جاتی ہے (اُردو ادب اُردو رسم الخط میں بھی زندہ ہے) خود بنگلہ دیش میں بھی یہی کیفیت ہے۔ راقم نے گلڈ سے ایک دو جلدی کتاب چھاپی تھی (بنگلہ دیش کی علیحدگی سے کئی برس پہلے) جسے پروفیسر شبیر کاظمی مرحوم، پرووائس چانسلر، جامعہ راجشاہی نے مرتب کیا تھا عنوان تھا "اُردو بنگلہ مشترکہ الفاظ"....وہ قومی یکجہتی کی طرف اسی حوالے سے ایک اضافی کوشش تھی تا کہ اُردو

دوست بنگلہ دانشوروں کے ہاتھ مضبوط تر کیے جاسکیں۔ وہ آج بھی بہت سے کتب خانوں میں موجود ہے مگر افسوس سیاست دانوں نے ہمیں برادیا!

چونکہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن کر ایک علیحدہ برادر ملک بن چکا ہے۔ اس لیے اس وقت ہم اپنے محترم برادر ملک میں اُردو بنگلہ کی تلخ، غیر ضروری اور محض سیاست زدہ کشمکش کا تفصیلی حال بیان نہیں کریں گے لیکن راقم الحروف ایک مشاہدہ تحریر کرتا چلے، پاکستان رائٹرز گلڈ کے ایک ایسے کارکن کی حیثیت سے اور دیگر منصبی ضروریات کے سبب سے جو شاید راقم الحروف کا تجربہ داخلیت سے بھی آمیز کر سکتا ہے پانچویں دہائی کے آخر سے بنگلہ دیش بن جانے تک وہاں بار بار جانے اور اُردو بنگلہ ادیبوں سے گہرے ذاتی مراسم کے سبب اس موضوع پر بے تکلفانہ گفتگو کا موقع ملتا رہا اس لیے یہ گزارش ضرور ریکارڈ پر رہے کہ وہاں رفتہ رفتہ اعلیٰ سطحوں اور ان سے متاثر عام سطحوں پر اُردو کے خلاف سیاسی مہمات میں وہاں مقیم مغربی پاکستان سے جانے والے سرکاری عہدہ داروں اور اُردو کے نادان دوستوں کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ اس کی تفصیلی داستان راقم الحروف ایک اندوہناک یادداشت کے طور پر الگ سے تحریر کر رہا ہے جو انشاء اللہ کسی دن انجمن یا کسی اور ادارے سے شائع ہوگی۔ ان نادان اُردو دوستوں میں یوپی اور بہار کے بہت سے گھرانے، بعض ادبی مشاہیر اور اعلیٰ مناصب کے اُردو گو اور پنجابی تر اُردو گو سرکاری ملازمین خاصی تعداد میں شامل تھے.....

کسی کی مادری زبان کی تحقیر خواہ وہ زبان اپنی وسعت اور ساخت کی وجہ سے نسبتاً "کم تر" ہو کسی کے لہجے اور تلفظ کا استہزا ایک نہایت قابل اعتراض، غیر اخلاقی اور مصالح مرسلہ کے لحاظ سے بھی بڑا غیر دانش مندانہ رویہ ہے۔ کسی کو کسی کی ماں کا اپنی ماں سے کوئی تقابل یعنی صفاتی موازنہ کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ کسی کو کسی غیر دعویدار سے اپنے معیار کا لہجہ اور تلفظ طلب کرنے کا حق بھی نہیں (راقم الحروف اپنے تخلص کے پہلے حرف کو فن تجوید کے مطابق ادا نہیں کر سکتا۔ الف کی صوت ادا کرتا ہے عین کا مخرج جو ریاضت طلب کرتا تھا وہ بچپن میں کرائی نہیں گئی۔ عربی مضمون نہ تھا)

اب مغربی پاکستان یعنی موجودہ پاکستان میں اُردو کی حیثیتِ نفاذ اور ضرورت کا

ایک طائرانہ مطالعہ یا مختصر جائزہ..... معذرت کہ یہ ایک تاثراتی گفتگو ہے نہ کہ تحقیق جس کے لیے حوالہ کتب یا کوئی اشاریہ ضروری ہو۔ اتنا یقینی ہے کہ اس میں کوئی واقعاتی غلط بیانی نہیں پائی جا سکتی۔

مغربی پاکستان میں اُردو ایک بڑی اور باہمی رابطے کی زبان کی حیثیت سے کبھی کی جم چکی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد اسے قومی زبان کے طور پر صرف سرکاری دفاتر میں انگریزی کی جگہ لینی تھی۔ اس کا کسی بھی علاقائی یعنی پاکستانی زبان سے کوئی تضاد نہ تھا۔ پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے ضلعی دفاتر، ماتحت عدالتوں اور ریونیو ریکارڈ میں پچھلی صدی سے اُردو ہی استعمال ہو رہی تھی (اب بھی ہوتی ہے) صرف سندھ میں انگریزی اور سندھی (اور کسی قدر فارسی) کا چلن زیادہ تھا، گو بہت سی کارروائیاں اُردو میں بھی درج کر لی جاتی تھیں ..... وفاقی حکومت چونکہ نئی نئی گورنمنٹ انڈیا تقسیم ہونے کے عمل میں قائم ہوئی تھی اس لیے وہ وراثت میں بہت سے انگریز حکام اور انگریزی زبان ساتھ لائی اور (سینٹرل سیکرٹریٹ) وفاقی معتمدی کا کام انگریزی میں ہی جاری رکھا گیا ..... چونکہ حکومت چلانے والے سینئر مسلمان بھی سابق آئی سی ایس (انڈین سول سروس) آئی پی ایس (انڈین پولیس سروس) آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس اور ملٹری اکاؤنٹس سروس کے اراکین تھے جنھوں نے ہندوستان میں مقابلے کے امتحان انگریزی میں دیے، تربیت انگریزی میں پائی اور سرکاری کام انگریزی میں ہی کرنے کے عادی ..... بعض تو انگریزی میں اظہار کے "ماہر" معروف ہو چکے تھے اس لیے اور اس لیے بھی کہ اُردو کی بہت سی دفتری اصطلاحات پچھلی صدی سے دفاتر میں انگریزی کے نفاذ کے بعد متروک و معدوم ہو چکی تھیں انھیں اُردو کو وفاقی دفاتر میں نافذ یا استعمال کرنے کے معاملے میں ایک طبعی دشواری محسوس ہوئی کابینہ بڑے محب وطن محترم بانیانِ پاکستان پر مشتمل ہونے کے باوجود کاروبارِ حکومت چلانے میں انھیں حکام کی محتاج تھی۔ ماتحت عمال میں بھی انگریزی میں ہی لکھنے پڑھنے کے تربیت یافتہ اور عادی آتے تھے۔ گو ان میں طبقہ اوسط سے تعلق رکھنے کے سبب اُردو کی عملی مہارت اور جذباتی سطح پر اس سے محبت نسبتاً اعلیٰ افسران سے کہیں زیادہ تھی ..... راقم نے 13 اگست 1947ء سے وفاقی سکرٹریٹ کو ایک

اسسٹنٹ کی حیثیت سے ذاتی طور پر خوب دیکھا اور (دوسرے مناصب تک پہنچتے ہوئے) شاید اچھی طرح سمجھا ہے۔ 1947ء سے 1951ء تک وہ انجمنِ عمّالِ حکومت پاکستان کا ایک جوشیلا عہدہ دار بھی رہا، اس ٹریڈ یونین قسم کے ادارے نے تنخواہوں اور دیگر مسائل کے حوالے سے جو جدوجہد کی اس نے کئی وزارتوں کے اعلیٰ ترین افسران اور طریق کار سے واقف کرایا۔

ابتدا میں جو کچھ ہوا اس کا ایک مختصر سا حال بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے کتابچے "اُردو کا المیہ" شائع کردہ انجمن ترقی اُردو پاکستان میں موجود ہے۔ راقم اسے دُہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ انجمن میں تیس سال اعزازی کام کرنے کے بعد اتنی جرأت ضرور کرے گا کہ اسے اس لحاظ سے نامکمل قرار دے کہ یا تو جوشِ نفاذ اور آئیڈیلزم میں بابائے اُردو مرحوم کی نظر اس وقت بین الصوبائی اقتصادی، سیاسی کشمکش پر گہری نہیں تھی یا انھوں نے بوجوہ اس کا تفصیلی ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔۔۔ بہرحال وہ اُردو کے سب سے بڑے کارکن اور ایک وقت سے تحریکِ پاکستان میں اُردو ہی کے حوالے سے قائداعظم کے شریک کار رہ چکے تھے۔ بانیانِ پاکستان سے بجا طور پر عقلی، جذباتی اور حقیقتاً پاکستان کے عظیم تر مفاد میں یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ اُردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے فوراً نہ سہی جلد سے جلد تر نافذ کرنے کے واضح اور فوری اقدامات کریں گے جن کا فقدان انھیں مایوس اور برہم کیے دیتا تھا۔ اِدھر بانیانِ پاکستان کو بچائے پاکستان کے لیے جو کٹھن لڑائی پڑ رہی تھی۔۔۔۔۔۔ تقسیم کے نتیجے میں دونوں طرف فسادات اور آبادی کا انخلا، مہاجرین کی آمد اور آبادکاری، کشمیر کے واقعات و سانحات، خالی خزانے کے مسائل، ملک میں کوئی صنعتی بنیاد نہ ہونا بڑی طاقتوں کی روایتی ریشہ دوانی سے مقابلہ، ساتھ ہی پاکستان کو ناکام بنا دینے کے لیے بیرونی سازشوں کا بروئے کار آجانا، بعض مقامی سیاست کاروں کی خود غرضی، بدعنوانی، مالیاتی کرپشن یہ ایک سخت اور ہمہ جہتی آزمائش کا منظر نامہ جو راقم اور اس کے بزرگوں اور ہم عمر لوگوں نے خود دیکھا ہے (اور بڑی حد تک کئی تصانیف میں آبھی چکا ہے) ایک نہایت ہی پیچیدہ اور صبر آزما جنگی کیفیت کا مرحلہ تھا جس سے بانیانِ پاکستان کی وفاقی کابینہ کو بے سروسامانی کی حالت میں نبرد آزما ہونا تھا اور بعد

ر مجموعی طور پر وہ اس میں کامیاب رہے..... ہاں شاید یہ اس وقت بھی ممکن تھا کہ اُردو کے لیے سائنٹفک اور مستقبلیاتی بنیادوں پر کوئی منصوبہ بندی مرکز قائم کر دیا جاتا اور ہم اس سمت میں زعمائے قوم کی جستہ جستہ اور انفرادی کوششیں دیکھتے بھی ہیں، شاید ان مخصوص حالات میں وہ اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کر سکتے تھے۔ آج اتنے دن بعد کسی کمرے میں بیٹھ کر اُن حالات کا خدانخواستہ کوئی الزامی تجزیہ کرنا زبان یا قلم چلانے کی حد تک آزادی فکر و اظہار کے تحفظ میں تو آسکتا ہے لیکن جو لوگ اس آگ کے شعلوں سے گزر رہے تھے اُن کی طرح شمہ برابر بھی محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ بہت ہی نچلی سطح پر سہی راقم ان لوگوں میں شامل ہے۔ جو تعمیر پاکستان کی تپش سے کئی برس گزرے......

لیکن ابھی تحی ہونے کے ساتھ اور اس کے بعد قومی زبان میں جدید تقاضوں کے مطابق پھیلاؤ اور اسے سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کی ضرورت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا اور یہ ضرورت یقیناً تسلیم بھی کی جاچکی تھی مگر اب اغلباً اقتصادی ناہمواریوں کے دور نہ کیے جانے سے اور کسی حد تک انفرادی انا اور گروہی مفادات پرستی سے بین الصوبائی سیاسی چپقلش شدید طور سے ابھر آئی تھی اور اُردو بھی اپنی تمام تر مقبولیت اور مسلّمہ عملی اہمیت کے باوجود اس چپقلش کی نذر ہونے لگی۔ بنگلہ دیش میں اوّلین شورش اور قائداعظمؒ کے تاریخی سفر کا ذکر کیا جاچکا ہے اب دوسری اختلافی آوازیں اندرونِ سندھ سے بلند ہوئیں جو کسی حد تک تو "اُردو گو" مہاجرین کی مسلسل آمد اور ان کی آباد کاری کی اقتصادی پیچیدگیوں، شر پسند عناصر کی پیدا کردہ باہمی غلط فہمیوں اور بعض اُردو شاونیت پسندوں یا اُسی پرانے محاورے کے مطابق اُردو کے نادان دوستوں کی مرہونِ منت کہی جاسکتی ہیں مگر در حقیقت وفاقی عہدوں، پنجاب کی ناگزیر برتری اور بعض اُردو دوست سینئر افسران کے خلاف سیاسی کشمکش کا شاخسانہ تھی۔ راقم بلا تکلف یہ بھی عرض کرسکتا ہے کہ سندھ میں بسنے والے اُردو گو مہاجرین سندھی زبان کی حیثیت اور اہمیت کو پہچاننے میں خاصی تاخیر اور کم نظری کا شکار بھی ہوئے جب کہ اُردو اور سندھی میں نہ پہلے کوئی لڑائی تھی نہ آج ہے۔ 1972ء کے لسانی سمجھوتے کے بعد سے تو (خواہ بعض سیاسی نعرہ باز کچھ کہتے رہیں) بحمد اللہ

اُردو سندھی عملاً ایک دوسرے سے بڑی تیزی کے ساتھ قریب آ رہی ہیں کیوں کہ ابتدائی مدارج تعلیم میں دونوں لازمی مضامین ہیں۔ لیکن اسی دوران سندھ میں سیاسی کشمکش نے جو عجیب و غریب کروٹیں لیں انھوں نے اُردو سندھی لسانی قربت پر گہرے سائے ضرور ڈالے ہیں۔ وفاق کے سرکاری دفاتر میں نفاذِ اُردو سے گریز کی کہانی خاصی طویل، عبرت انگیز اور دلچسپ ہے۔ اسے راقم نے کسی قدر اختصار سے انجمن کی تازہ اشاعت "اصطلاحاتِ پیشکاری" میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے بہت سے معاصر مورخین و مفکرین نے بار بار لکھی ہے۔ اس لیے اس وقت اسے دہرانا غیر ضروری ہے۔ یہ کہہ دینا البتہ لازم لگتا ہے کہ اگر پچھلے چوالیس سال میں اُردو کو بتدریج بھی نافذ کر دیا گیا ہوتا (جیسا کہ پنجاب، سرحد اور بلوچستان میں خاصی حد تک ہوتا رہا ہے) تو شاید آج قومی یکجہتی بھی اپنے بہترین مدارج میں داخل ہو چکی ہوتی....

اب قومی یک جہتی کے حوالے سے چند دوسرے واقعات کا خلاصہ ضروری ہے۔ سیاسی آویزشوں کے جلو میں بعض عناصر نے سوست پالیسی اور اس کے زیرِ اثر بعض عناصر نے اپنی سچائیوں کے مطابق اُردو کو قومی زبان ہی ماننے سے انکار کرنا چاہا اور اسے محض "رابطے کی زبان" کا لقب دیا۔ یاد کیجیے ایک مختصر العمر عوامی ادبی انجمن، کراچی 72-1971ء کا منشور جس پر مخدومی جناب فیض احمد فیض نے بھی دستخط کیے تھے۔ وہ غلغلہ کچھ دن رہا۔ پھر ختم ہو گیا مگر ان آوازوں کے ارتعاش کئی برس تک آتے رہے۔ اس سے پہلے صوبہ سرحد سے پنجاب اور وفاق کے خلاف سیاسی شکایتوں کے جلو میں اُردو کے خلاف بھی آوازیں بلند کی جا چکی تھیں جب کہ اُردو کی پشتو سے بھی کوئی لڑائی نہ تھی نہ ہے۔ بس چونکہ پنجابی مادری زبان والوں یعنی پنجابیوں میں پنجابی کے ساتھ ساتھ اُردو پچھلی صدی سے علمی، تحریری، ادبی ذریعہ اظہار کے طور پر اپنائی جا چکی تھی اور وہ وفاق پسند مانے جاتے ہیں اس لیے ان خفا خفا بزرگوں کا نزلہ پنجابیوں کے ساتھ اُردو پر بھی گرتا تھا۔ شکر ہے کہ شکایتیں کم ہو جانے کے علاوہ اور تجارتی وجوہ سے بین الصوبائی مواصلت کی مقدار و رفتار میں بہت تیز اضافے کے ساتھ اُردو کی عملی ناگزیریت واضح ہو چکی ہے۔ پچھلی دہائی میں پنجاب جیسے اُردو صوبہ میں بھی

بعض دوستوں نے اپنی سچائی کے مطابق ہی سہی ایک اقدام ایسا کیا جس نے کچھ عرصے تک پھر بالکل غیر ضروری طور پر مخالفت اُردو کی صورت اختیار کیے رکھی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا دستور سب پاکستانی زبانوں کے ادیبوں اور زبانوں پر مشتمل تھا اور سب پاکستانی زبانوں کے ذیلی حلقے بنا دیے گئے تھے جن میں اعزازی عہدیداران اسی زبان کے ادیب بذریعہ انتخاب مقرر کرتے تھے۔ غالباً 1962ء میں لاہور کے پنجابی ذیلی حلقے کے دفتر سے جالندھر کی کسی پنجابی انجمن نے براہ راست رابطہ قائم کرتے ہوئے گورمکھی رسم الخط میں پنجابی ادب کے تبادلے اور ترویج و اشاعت کی تحریک کی اور ایک بیان کے مطابق یہ تحریک ہمارے پنجابی ذیلی حلقہ لاہور میں پسندیدگی کے ساتھ زیر غور آئی۔ گلڈ کے ضوابط کی رو سے جو منتخب منتظمہ بنائی تھی بیرونی تعلقات کا مضمون مرکزی تھا (جیسا کہ ہر قومی ادارے میں ہوتا ہے) پنجابی ذیلی حلقہ مغربی پاکستان کے دفتر لاہور سے وابستہ تھا۔ (اس وقت موجودہ چار صوبے ایک نئی سیاسی وحدت..... مغربی پاکستان ..... میں ضم تھے) گلڈ کا مرکزی دفتر کراچی میں واقع تھا۔ اس خط کتابت پر مغربی پاکستان کی منتظمہ اور اس کے معتمد اعزازی جناب قتیل شفائی نے اصولی اعتراض کیا جسے ذیلی حلقے کے معتمد اعزازی جناب شفقت تنویر مرزا نے رد کر دیا۔ وہ اُردو روزنامہ "امروز" سے وابستہ تھے۔ راقم اس وقت اعزازی مرکزی ایگزیکٹیو سکریٹری تھا، سکریٹری جنرل جناب قدرت اللہ شہاب (مرحوم) اور اعزازی خازن ابنِ انشا (مرحوم) ...... راقم اُن دنوں ڈھاکہ میں دو ڈھائی مہینے تک اپنی منصبی ذمہ داریوں کے سلسلے میں تعینات تھا۔ نیابت ابنِ انشا کے سپرد تھی۔ قتیل صاحب نے شکایت مرکز کو بھیجی (جہاں ابن انشا مرحوم راقم کی نیابت کر رہا تھا) ابن انشا نے مسل سکریٹری جنرل یعنی قدرت اللہ شہاب کو پیش کی انھوں نے گلڈ کے دفتر لاہور جا کر قتیل صاحب اور مرزا صاحب سے مذاکرات کیے اصولی طور پر کسی بھی ذیلی مرکز کو خارجہ تعلقات سے منع کرتے ہوئے عوامی تائید کی غیر موجودگی میں گورمکھی رسم الخط کے تعارف، فروغ اور مجوزہ راست تعلقات کے خلاف فیصلہ دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس مسئلے کو حسبِ ضابطہ صوبائی مجلسِ منتظمہ سے گزارتے ہوئے گلڈ کے اجلاسِ عام کے سامنے رکھا جائے مرزا صاحب یا ان کی ذیلی منتظمہ نے مبینہ طور پر

اسے تسلیم نہیں کیا اور شہاب صاحب نے تحریری تنبیہ کے بعد قتیل صاحب کی سفارش پر ذیلی حلقے کو معطل کر کے نئے انتخابات کے احکام دے دیے.... اس بات کو تیس برس کے قریب گزر رہے ہیں اور نہ وہ گلڈ رہا ہے نہ راقم 1971ء سے گلڈ کے ساتھ کسی عہدہ دار کے طور پر وابستہ۔ اللہ علیم ہے کہ راقم کو اتنی دور ڈھاکہ میں اس تمام صورتِ حال کی خبر بھی نہ ہوئی مگر بعض احباب کی طرف سے راقم پر یہ الزام لگایا گیا کہ چونکہ اُردو گو تھا اس لیے شہاب صاحب پر اثر انداز ہوا اور پنجابی ذیلی حلقہ معطل کرایا.... پھر روزنامہ "امروز" اور "پاکستان ٹائمز" میں راقم کے خلاف طرح طرح کے خطوط چھپے ہی (اور یہ کوئی اہم بات نہیں راقم شاید اس سے بھی زیادہ مذمت کا مستحق ہو) بہت سے خطوط بنام مدیران میں اچانک پنجابی بمقابلہ اُردو یا اُردو بمقابلہ پنجابی کا قضیہ شروع ہو گیا جس میں بہت سے گمنام خطوط نگاروں کے نام بھی نظر آنے لگے۔ اس قضیے کے اثرات نہایت ناخوشگوار مرتب ہوئے گور مکھی تو دھری کی دھری رہ گئی ایک غیر ضروری جنگ اردو، پنجابی کے مابین نظر آنے لگی۔ اس وقت صوبائی عہدیداروں کے علاوہ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم اور پروفیسر حمید احمد خان مرحوم نے جس طرح کھل کر اُردو کی حمایت کی وہ بھی پاکستان میں قومی یکجہتی بذریعہ اُردو کی ایک خوبصورت اور ہمت افزا تاریخ ہے۔ (اُردو کے لیے ڈاکٹر صاحب اور پروفیسر صاحب کی دوسری بے مثال خدمات تو ریکارڈ پر ہیں ہی) شہاب صاحب مرحوم نے یہ سب کہیں لکھا بھی ہے۔ اگلے واقعات گلڈ کے معاملات سے گتھے ہوئے ہیں بہرحال یہاں اس قضیے کا بیان غیر متعلق نہ ہو گا، اس لیے کہ ایک اُردو کے اتنے بڑے مضبوط اور قدیم سے سرپرست علاقے میں جس نے اُردو کو علامہ اقبال جیسی نادر روزگار شخصیت عطا کی ہے ایک غیر ضروری تنازعہ کافی تکلیف دہ صورتِ حال پیدا کر کے قومی یکجہتی مجروح کر رہا تھا۔ اب بھی گاہے گاہے "پنجاب صرف برائے پنجابی زبان" کی آوازیں اٹھتی ہیں 1989ء میں ایک مقامی سیاسی شخصیت نے اپنی پارٹی کا ایک کل پاکستان ثقافتی جلسہ لاہور میں منعقد کیا تو اپنی تقریر میں نہ جانے کس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم سے تو ہماری مادری زبان بھی چھین لی گئی ہے.... (حالانکہ ان کی پارٹی دستور 1973ء کے متعلقہ شق کی طرفدار رہی اور ہے

جس میں اُردو کو پچھلے دساتیر کی طرح قومی زبان قرار دیا گیا ہے وعدۂ نفاذ کے ساتھ...) مگر پنجاب میں ادیبوں، دانشوروں، اساتذہ اور عوام و خواص کی غالب اکثریت اُردو کو اپنا چکی ہے وہ پنجابی بولتے ہیں ایک اچھی تعداد بڑا خوبصورت پنجابی ادب بھی تخلیق کرتی ہے پنجابی ایم اے تک تدریس بھی ہے مگر اس سب کا اُردو سے کوئی تضاد نہیں۔ پچھلے کچھ سالوں میں اُردو کو صوبائی سکرٹریٹ اور دوسرے دفاتر میں نافذ کرنے کے لیے واضح فیصلے کے ساتھ چند مشاہیر ادبا، فضلاء اور تجربہ کار منتظمین پر مشتمل کمیٹیاں بھی بن گئیں جو تیزی کے ساتھ کام کر رہی ہیں ایک اطلاع کے مطابق کم از کم تیس فیصد روداد یں (سمریاں) وزیر اعلیٰ اور کابینہ کو اُردو میں بھیجی جاتی ہیں جو نفاذ اُردو کی ایک عملی ابتدا ہے۔ تقریباً دو کروڑ روپے اُردو ٹائپ رائٹروں اور کمپیوٹروں پر صرف کیے جانے کی تجویز ہے۔ کئی تربیتی کورسوں کا انتظام ہو رہا ہے۔ اردو مختصر نویسی اور اُردو ٹائپ سیکھنے والے ملازمین کو تشویق ترغیب دینے کی کئی تجاویز مرتب ہو چکی ہیں۔ کمرشل کالجوں میں بھی سہولتیں بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ ..... ان کمیٹیوں کی نگراں یا بڑی کمیٹی میں نامور اُردو ادیب اور انتظامی ماہرین مثلاً جناب احمد ندیم قاسمی، جناب پروفیسر مرزا منور، جناب اشفاق احمد، جناب مختار مسعود، بیگم بشریٰ رحمن شامل ہیں جب کہ بلحاظ عہدہ صوبائی چیف سکرٹری، ایڈیشنل چیف سکرٹری اور کئی دوسرے اعلیٰ حکام مستقلاً وابستہ رہیں گے۔ چھوٹی چھوٹی نفاذی مجلسیں، کمشنروں کی صدارت میں ڈپٹی کمشنروں اور دیگر عہدیداروں کے مابین شروع ہو چکی ہیں۔

بلوچستان 1969ء کے اواخر میں صوبہ بنا 1970ء کے عام انتخابات نے صوبائی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ (اس سے پہلے وہاں ایجنٹ گورنر جنرل مشاورتی امداد سے حکومت کرتا تھا اور مارشل لاء کے زمانے میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر)...... جب 1971ء میں بنگلہ دیش الگ ہو گیا اور مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں سول صوبائی حکومتوں کی تشکیل ہوئی تو ابتدائی دور میں مارشل لاء اُٹھنے کے بعد (1973ء) صوبوں میں بااختیار گورنر مقرر کیے گئے جو منتخب نمائندے بھی تھے (یہ ایک عارضی دستوری قسم کا انتظام تھا) 1972ء میں پہلے گورنر جناب غوث بخش بزنجو ہوئے

جنھوں نے جولائی 1972ء کے احکام میں ہی اُردو کو صوبہ کی دفتری زبان قرار دے دیا ۔(انجمن نے اس اقدام پر انھیں خصوصی مبارکباد دی تھی) اُردو ٹائپ رائٹرز کی کمی اور سی۔ایس۔پی حضرات کے عدم تعاون سے وہاں کے دفاتر میں اُردو سو فیصد تو رائج نہ ہو سکی مگر عام شہری اُردو میں بھی درخواستیں دے سکتا ہے اور صوبائی اسمبلی کے ساتھ ساتھ کافی سرکاری کارروائی اُردو میں ہوتی ہے وہاں آج تک بحمد اللہ بلوچی، اُردو تضاد علیحدہ طور سے نہیں اُبھرا، سیاسی عوامل پشتو۔ بلوچی تضاد گاہے گاہے اُبھار دیتے ہیں ہاں جب معدودے چند سیاست داں اپنی وجوہ سے قومیتیں بمقابلہ یک قومیت کے قضیے اُٹھاتے تھے وہ اور چند عناصر بلوچی بمقابلہ اُردو کے قضیے بھی شروع کر دیتے تھے لیکن کچھ عرصہ میں وہ سب دھواں تحلیل ہو جاتا تھا۔ بلوچی زبان اپنی شاندار روایات کے ساتھ زندہ ہے اور تخلیقی پرورش پا رہی ہے اس کے فروغ کے لیے بلوچی اکادمی بھی قائم ہے گو وہ کسی اکادمی کی محتاج نہیں۔ایک زندہ و توانا زبان کی طرح اپنے اٹل حق کے بل پر بھی پرورش پا رہی ہے اور ترقی کرتی رہے گی۔اُردو میں بلوچی زبان و ادب کی ایک جامع تاریخ جناب کامل القادری مرحوم نے مرتب کی تھی جسے انجمن کو شائع کرنا تھا انھوں نے تحریر کے ساتھ ہی انجمن کے ذریعے کتابت بھی کرائی تھی۔ اس میں کچھ وقت لگا ساتھ ساتھ ہی صوبوں بمقابلہ مرکز کے سیاسی تنازعات زور پکڑتے گئے۔ فوجی کارروائی کی نوبت آ گئی۔

چونکہ اس کتاب میں بلوچی قبائل کا تفصیلی بیان بھی تھا اور اس وقت بلوچستان ایک حساس صوبہ ہو چکا تھا اس لیے ہم نے چاہا کہ بلوچی نسل کے بلوچی گو فضلاء بھی اسے دیکھ لیں تاکہ اشاعت کے بعد کسی متنازع فیہ مسئلے میں ملوث نہ ہو جائے۔ اس عمل میں بعض فضلاء نے چند مقامات پر شبہ ظاہر کیا کہ تنازعات پیدا ہو سکتے ہیں۔ کامل القادری مرحوم اپنی تحقیق پر مصر اور تحریر میں ترمیم پر تیار نہ ہوئے۔ ہمیں ایسے زمانے میں شدید احتیاط کا پابند رہنا تھا کیوں کہ ہمیں تو بلوچی زبان و ادب کی تاریخ مطلوب تھی بلوچی قبائل پر کوئی متنازعہ فیہ تحقیق نہیں۔ چنانچہ ان کے اور انجمن کے مابین یہ تفہیم ہو گئی کہ انجمن کتابت کے اخراجات خود برداشت کرے گی اور وہ اسے اشاعت کے لیے کسی بھی ناشر کو دے دیں گے۔ ہماری بد قسمتی کہ ہم وہ

کتاب نہ چھاپ سکے لیکن ہم ماضی کے تجربات اور اپنی احتیاط کے سبب کسی سیاسی تنازعہ میں حصہ لیتا تو کیا حتی المقدور اس کے امکانات سے بھی محتاط رہنے کے پابند ہیں۔(وہ کتاب شائع ہو چکی ہے شاید اشاعت سے پیشتر مرحوم نے چند مقامات میں ترمیم کر بھی دی تھی لیکن چونکہ مسودہ راقم کے سامنے نہیں اس لیے یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا.....) یہ کتاب ایک شاندار اشاعت ہے۔ اس پر کوئی تنازعہ سامنے نہیں آیا ہے۔

سرحد میں بھی پنجاب کی طرح اُردو قدیم سے وہاں کی تخلیقی ادب ہی نہیں بڑی حد تک دفتری زبان کے طور پر رائج تھی اور ہے۔ پشتو، ہندکو ان کی بولیاں اور زبانیں ہیں پشتو میں عظیم کلاسیکی ادب بھی موجود ہے اور آج بھی پشتو نثر و نظم کی تخلیقات پشتو خزانوں میں اضافے کر رہی ہیں سرکاری طور پر ایک پشتو اکادمی بھی قائم ہے۔ دوسرے ادارے بھی فروغِ پشتو کے لیے کام کرتے ہیں۔ لیکن بحمداللہ پشتو اور اردو کے مابین کوئی تضاد نہیں بلکہ پشتو اور ہندکو بولنے اور لکھنے والے بعض ادبا تو اُردو کے اکابر میں شمار ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ان کی تعداد کم نہیں۔ راقم نے 1966ء میں قدیم و جدید پشتو شاعری کا ایک اُردو ترجمہ محترمی فارغ بخاری اور رضا ہمدانی سے کرایا تھا اور ایک کتاب "پشتو شاعری" شائع کی جو اس عظیم زبان کے لیے ہمارے احترام و تعاون کی ایک علامت ہے۔ آج صوبہ سرحد اردو کا ایک مضبوط قلعہ کہلاتا ہے اردو کے قدیم حمد و نعت، سلام، مراثی، قرآن مجید اور احادیث کے اردو ترجمے آج بھی پختون مذہبی محفلوں میں پہلے کی طرح رائج ہیں.......

ریاست آزاد جموں و کشمیر آج پاکستان کا سیاسی حصہ نہیں مگر پاکستان سے تجارتی، جغرافیائی، نسلی اور ثقافتی روابط ایسے ہیں کہ کسی لسانی مغائرت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ تقسیم سے پہلے پوری ریاست کی سرکاری زبان اردو تھی۔ بول چال میں بھی اردو کثیر الاستعمال ہے۔ آزاد ریاست جموں و کشمیر کی دفتری زبان حسب سابق اردو ہی ہے۔ ان کی اپنی بولیاں بھی ہیں مگر کاروبار اور باہمی تعلقات کی زبان اردو ہے اور جموں و کشمیر کے اردو ادبا و شعرا کی تعداد اور ان کی تخلیق و تحقیق کا معیار ہمیشہ کی طرح آج بھی پوری دنیائے اردو کا مایہ افتخار ہے۔

صوبہ سندھ میں مرکز اور صوبے اور خود صوبے کے اندر باہمی سیاسی آویزشوں کی زد میں اردو کتنی بار آئی۔ یہ ایک دکھ بھری کہانی ہے جو سندھ کے مخصوص حالات اب بھی کبھی کبھی تازہ کرا دیتے ہیں۔ 1972ء میں اس وقت کے گورنر سندھ نے بہ عجلت ایک سخت متنازع فیہ قانون بنانا چاہا جس پر سندھ میں آباد موثر اور فعال اردو گو اور پنجابی گو طبقوں کی طرف سے شدید ردِ عمل ہوا۔ اسی دوران میں جناب رئیس امروہوی مرحوم نے "جنگ" کراچی میں ایک قطعہ چھپوا دیا جس کا آخری مصرع تھا "اردو کا جنازہ ہے بڑی دھوم سے نکلے" اسے روزنامہ "جنگ" کراچی نے صفحہ اول پر سیاہ حاشیوں کے ساتھ شائع کیا۔ دوسری طرف سے بھی شدید ردِ عمل ہوا لسانی فسادات پھوٹ پڑے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے دونوں زبانوں کے وفود اسلام آباد طلب کیے۔ مذاکرات ہوئے پھر وہ خود کراچی آئے۔ مزید مذاکرات کے بعد ایک سمجھوتہ ہوا اور قانون میں متفقہ ترمیمات کی گئیں۔ یہ "لسانی سمجھوتہ" کہلاتا ہے اور آج تک زیر عمل ہے۔ ابتدائی نصاب میں اردو سندھی دونوں کی تدریس اور دونوں میں کامیابی لازمی ہے ۔سندھی اعلیٰ ترین مدارج تک پڑھائی جاتی ہے۔ دراصل اردو سندھی لسانی تنازع سیاسی آویزشوں سے پیدا ہوا تھا اور اُسے تقویت ایک تعلیمی رپورٹ (1961ء) سے ملی "شریف کمیشن۔" (ڈاکٹر شیخ محمد شریف مرحوم) وفاقی معتمدِ تعلیم اس کے سربراہ تھے۔ اس کمیشن نے چند ایسی تجاویز دی تھیں مثلاً قانون کی مدّتِ تدریس پنجاب کی طرح تین سال کر دینا، ثانوی تعلیم گیارہویں جماعت تک لے جانا، سندھی زبان کی اہمیت پہلے کی نسبت کم کر دینا..... کئی سخت متنازع فیہ تجاویز تھیں۔ سندھ میں ون یونٹ کے خلاف پہلے ہی جذبات اُبل رہے تھے۔ چار صوبے ایک صوبے میں ضم کر کے مغربی پاکستان کے نام کا صوبہ بنا دیا گیا تھا اور مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں مساوات PARITY کا اصول اختیار کیا گیا تھا (یہ ایک سیاسی کہانی ہے) اس رپورٹ نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا اور سندھ میں وفاق اور مرکزیت کے خلاف جو تحریکیں چل پڑی تھیں اردو مفت میں ان کی زد میں آ گئی۔ یہی آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی جس کا ایک شاخسانہ 1972ء کے محولہ بالا واقعات ہیں۔ رپورٹ کا وہ حصہ تو منسوخ ہو گیا مگر تلخ یادیں چھوڑ گیا۔ بہرحال 1972ء

کے لسانی سمجھوتے کے بعد سندھ میں کوئی اردو سندھی تنازعہ بالائے سطح نہیں رہا۔ قومیتوں، قوم، سیاسی حقوق کے مطالبات اور دوسرے قضیوں کا معاملہ علیحدہ، ان پر تبصرے کا یہ محل نہیں۔ لیکن اس موقع پر یہ ضرور اظہار کر دیا جائے کہ سندھ میں انجمن کی باقاعدہ شاخ 36-1935ء میں ہی قائم ہو چکی تھی اور سندھ کے مسلمانوں نے سندھ میں اردو کی جو خدمات انجام دی تھیں وہ ریکارڈ پر موجود ہیں۔

جب بابائے اردو انجمن ترقی اردو کو پاکستان لائے تو اس کا صدر دفتر تلاش کرنے اور انجمن کو اس کا قبضہ دلوانے میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ سندھ پیر الٰہی بخش مرحوم اور انجمن کے متولی پیر حسام الدین راشدی مرحوم نے ہی سب سے زیادہ مدد کی تھی۔ دراصل یہ عمارت جس میں آج بھی ہمارا صدر دفتر اور اردو کالج (فنون) قائم ہے اور جہاں اب بابائے اردو مرحوم کا مزار بھی بن چکا ہے انہی دو صاحبوں اور دیگر سندھی سرپرستانِ اردو نے دلوائی تھی بعد میں پیر حسام الدین راشدی مرحوم نے جس طرح مسلسل انجمن کی مدد کی اس کا اعتراف ہم اپنی بہت سی اشاعتوں میں کرتے رہتے ہیں۔ پیر صاحب نے مولوی صاحب کی وفات کے بعد بھی انجمن اور اس کے کالجوں کو راقم کی معتمدی اور صدر انجمن اختر حسین کی صدارت کو اپنی دل آویز اور مضبوط شخصیت اور اپنے دوست جناب ممتاز حسن مرحوم کی معاونت سے جو سہارا دیا، جیسی رہنمائی کی، وہ انجمن ہی نہیں پاکستان بھر میں اردو تحریک کی تاریخ میں ایک بڑا اور درخشاں باب ہے۔ (پیر صاحب مرحوم اردو لغت بورڈ کراچی اور اردو سائنس بورڈ کے بانیان اور نہایت فعال متولیان میں شامل رہے ہیں۔)

اردو کے حوالے سے نہ صرف پنجاب بلکہ سندھ کو بھی پورے پاکستان میں ایک خاص فوقیت کا حامل کہا جاتا ہے۔ گو یہ ایک خالص علمی، تحقیقی مسئلہ ہے لیکن اس کا ذکر زبان پر لانا ان جگہوں کی طرف دوبارہ توجہ دلاتا ہے جن سے اردو کا گھنا درخت پھلا پھولا۔ اردو کے بارے میں یہ امر محققین کی توجہ اور محنت طلب کرتا رہتا ہے کہ اس نے کب اور کس علاقے سے شروعات کی۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اندازے تو اسے ہزار سال سے بھی قدیم تر بتاتے ہیں اور ہندستانی علاقوں کے حوالے لاتے ہیں مگر علامہ سید سلیمان ندوی بڑے بیش قیمت دلائل کے ساتھ اس

موقف کے حامی و مددگار تھے کہ اردو دراصل مسلمانوں کی سندھ میں آمد کے ساتھ اسی صوبے میں پیدا ہوئی تھی۔ اس موقف کی مکمل تائید پیر حسام الدین راشدی نے کی ہے گویا بابائے اردو اس سے جزوی اختلاف کرتے تھے اور حافظ محمود شیرانی اردو کا اصل مولد پنجاب کو بتاتے تھے۔ اس وقت راقم ان بزرگوں اور دوسرے محترم محققین کے مختلف مکاتبِ فکر کی تفصیل میں نہیں جائے گا۔ مقصد صرف یہ یاد دلانا ہے کہ ایک نہایت ہی محترم مکتب فکر کے مطابق سندھ اردو کا مولد بھی قرار دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی سندھ میں شاہجہانی عہد سے یعنی جب دوسرے علاقوں میں اردو پروان ہی چڑھ رہی تھی اردو شاعری کی ابتدا بھی نظر آتی ہے۔ عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی جو رائج الوقت ادبی زبان فارسی کے شاعر تھے (ان کا فارسی دیوان سندھی ادبی بورڈ نے شائع کیا ہے) اردو کے شاعر بھی کہلاتے ہیں۔ ان کے بعد ولی کے دو معاصرین کامل صابر اور قاسم کا ذکر ملتا ہے اور پھر میر و سودا کے ٹھٹھوی معاصر تخلص ضیاء نمایاں نظر آتے ہیں۔ ادبی مشاہیر کی نمو ایک ماحول میں ہوتی ہے۔ عام دھارے سے بالکل الگ کسی تنہائی میں نہیں ہو سکتی صاف ظاہر ہے کہ ایک اردو ماحول ہوگا جس نے اوسط تناسب کے مطابق ان اردو مشاہیر کو جنم دیا۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے "سندھ میں اردو شاعری" کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے جس میں ستر سے زائد ایسے سندھی شعرا کا ذکر ہے جنھوں نے عہد بہ عہد سندھی، ہندی اور فارسی کے علاوہ اردو میں شاعری کی ہے۔ افسوس کہ اٹھارویں انیسویں صدی کے تذکرہ نویسوں کی دست رس فاصلوں، غیر محفوظ راستوں، سیاسی کم ارتباطی اور برطانوی یلغاروں کے سبب سندھ کے ان متقدمین میں اردو تک نہ ہو سکی ورنہ تذکرہ نویس ان کے اذکار اور نہ صرف نمونہائے کلام...... بلکہ ان پر اس وقت کے رواج کے مطابق تبصرے بھی اپنی تالیفات میں شامل کیا کرتے۔ ضیاء ٹھٹھوی تو بعض دہلوی اور لکھنوی معروف متقدمین سے بھی کہیں زیادہ سینئر ہیں لیکن سندھ کے ممتاز ترین مشاہیر میں حضرت سچل سرمست کا نام بہ حیثیت ایک اردو شاعر بھی لیا جاتا ہے گو ان کی وجہ شہرت ان کا سندھی فارسی عارفانہ کلام اور صوفیانہ زندگی ہے۔ ان کا بیشتر اردو کلام تو دستیاب نہیں مگر جو مل سکا وہ سندھی ادبی بورڈ شائع کر چکا ہے۔ "سندھ میں اردو" کی مرتبہ محترمہ ڈاکٹر شاہدہ

بیگم، ابو تراب کامل، دو مل فقیر، مراد فقیر شاہو خاں زنگیجہ، ثابت علی شاہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت شاہ (عبداللطیف) بھٹائیؒ کے بعض اشعار کو بھی اردو قرار دینے کا موقف رکھتی ہیں۔ مگر اس سے پروفیسر غلام ربانی آگرو کو اختلاف ہے اور ان کا کہنا ہے کہ "سندھی علم و ادب کا کوئی بھی محقق یا ماہر ڈاکٹر صاحبہ کے اس بیان سے متفق نظر نہیں آتا" لیکن اس کا سبب یہ نہیں بتایا کہ خدانخواستہ حضرت شاہؒ اردو سے لاعلم تھے بلکہ یہ ہے کہ حضرت شاہؒ عربی اور فارسی کے عالم تھے مولانا روم اور حافظ سے ذہنی استفادہ بھی کرتے ہیں مگر سندھی کے علاوہ کسی اور زبان میں شاعری نہیں فرماتے۔ چنانچہ راقم حضرت شاہؒ کو محض سخن سازی کی خاطر اردو شاعروں میں شمار نہیں کرے گا اور یہ کیوں ضروری ہو کہ ہم اپنے موقف کو تقویت دینے کے لیے ایسے محترم بزرگوں سے غیر متحقق باتیں منسوب کریں، "ہمارے لیے ان کے فیوض روحانی اور ان کے ترجموں کے ذریعے ان کی عظمتِ تخلیق و فکر سے استفادے کی سعادت کم نہیں اور یہ تو بہت ہی بہتر ہوگا اگر ہم سندھی زبان میں دست گاہ بہم پہنچا کر حضرت شاہؒ کے کلام سے براہِ راست فیض حاصل کریں......"

حضرت سچل سرمست کے بعد نمایاں صفوں میں میر عبدالحسین سانگی اور خلیفہ نبی بخش لکھے جاتے ہیں۔ سانگی حکمراں تالپور کے آخری رکن خاندان تھے جن کی حکومت انگریزوں نے غصب کرلی۔ ان کے کلام کی خصوصیت سوز و گداز ہے جو غالباً اس انتزاع سلطنت کا شاخسانہ بھی ہے۔ ان کا مکمل اردو مجموعہ اور خلیفہ نبی بخش کا مکمل اردو کلام بھی سندھی ادبی بورڈ نے شائع کردیا ہے۔

سندھ میں جدید اردو نثر دیگر علاقوں میں جدید اردو نثر کے بہت بعد نہیں آئی۔ ایک تفصیل ہے جو متعلقہ تذکروں میں ملتی ہے مگر یہاں ایک بہت بڑے نام کا ذکر لازمی ہے مرزا قلیچ بیگ سے پاکستان کے سب اردو اہلِ قلم واقف ہیں، ان کی تصانیف کی تعداد سیکڑوں پر جاتی ہے۔ وہ سندھی نثر کے معمارِ اعظم کہلاتے ہیں مگر اردو نثر میں ان کی تحریریں سندھ میں اردو کے تسلسل اور توسیع کا ثبوت ہیں، اس وقت ہندو اور مسلمانوں میں بول چال کی عام زبان پر رسم الخط کا جھگڑا انگریز نے کھڑا کر رکھا تھا۔ (اسی قضیے نے سرسید کو "ہندوستانیت" سے دل برداشتہ کیا) سندھ کے

سندھی ادیبوں میں بھی اس قضیے کے اثرات در آتے تھے۔ ہندو زیادہ تر سنسکرت اور ہندی کے الفاظ استعمال کرنے لگے تھے اور مسلمان عربی، فارسی اور اردو کے، اس حوالے سے مرزا قلیچ بیگ جو یوں بھی ایک غیر معمولی شخصیت ہیں مسلم نشاۃ ثانیہ کے ایک فعال عنصر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور اردو کے ایک حامی و مددگار بھی۔

آزادی سے پہلے سندھی کے بعد سندھ میں اردو چلن تو ثابت ہے ہی، پیر حسام الدّین راشدی مرحوم نے بقول پروفیسر ربانی اگرو (صفحہ 34 "قومی زبان" کی ترقی میں صوبوں کا حصہ" شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد) اپنی تصنیفات میں اس بات کا اکثر ذکر کیا ہے کہ اس دور کی مردم شماری میں سندھ کے مسلمانوں نے اپنی مادری زبان سندھی کی بجائے اردو لکھوائی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اس قومی یکجہتی کا ایک عظیم الشان مظاہرہ تھا جو تیسری دہائی سے مسلمانانِ ہند میں حقوق مسلمین کے سلسلے میں پیدا ہو رہی تھی اور جس نے بالآخر پاکستان قائم کرالیا۔ 1937ء میں علامہ آئی آئی قاضی کی صدارت میں کراچی نے ایک تاریخی یوم اردو منایا صوبائی انجمن ترقی اردو کا کام آگے بڑھایا (علامہ مرحوم کا خطبہ زیرِ حوالہ آچکا ہے اور اس اشاعت کے آخر میں شامل بھی ہے) پیر حسام الدّین راشدی کا ایک مقالہ بھی جس میں وہ اردو کا مولد سندھ بتاتے ہیں اسی اشاعت میں شامل ہے۔)

یہ صرف قبل آزادی سندھ میں اردو کا ایک نامکمل سا خاکہ ہے جو اس لیے اس ریکارڈ پر لایا گیا کہ گاہ گاہ اب بھی کچھ عناصر سندھ میں اردو کو ایک بیرونی زبان قرار دینے پر مصر ہو جاتے ہیں جو صرف آزادی کے بعد ان پر تھوپی جا رہی ہے.... آزادی کے بعد سندھ میں نہ صرف "اردو اسپیکنگ" بلکہ "سندھی اسپیکنگ" اردو شعراء ادبا اور محققین کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ان گزارشات میں نہیں سما سکتی نہ یہاں اسے دہرانے کی ضرورت ہے.... راقم اتنا جانتا ہے کہ آج کے دور میں سندھی کے سب سے بڑے شاعر مانے جانے والے ہمارے دوست شیخ ایاز 48-1947ء میں راقم اور دیگر احباب کے ساتھ کراچی کے مختلف ریستورانوں اور محفلوں میں نہ صرف اردو شعر و ادب پر اچھی فکر کا ثبوت دیتے تھے بلکہ اپنی نہایت خوبصورت اردو شاعری بھی سناتے تھے انھوں نے "شاہ جو رسالو" حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی ضخیم

کتاب کا اردو نظم میں جو ترجمہ کیا ہے وہ اردو میں ان کی مہارت، اس کے محاورے اور اظہار کی بے شمار جہتوں پر ان کی فکر اور قدرت کا ایک خوبصورت نمونہ ہے...... اب ان کے سندھی مجموعوں کے بعد ان کا اردو مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اگر صوبہ در صوبہ چلا جائے تو یہ پس منظریہ بیان بہت طویل ہو سکتا ہے جب کہ ایک خاصا مستند مگر کسی حد تک نامکمل جائزہ ایک معاصر ادارے کی ایک پیشین تالیف میں آ چکا ہے (جس سے سندھ کے باب میں اس وجہ سے استفادہ کیا گیا کہ بعض عناصر سندھ میں اردو سے مغائرت کا مسئلہ خاص طور پر اُچھالتے ہیں) اس تالیف کا عنوان (جیسا کہ عرض کیا گیا) "قومی زبان کی ترقی میں صوبوں کا حصہ" مرتبہ ڈاکٹر اعجاز راہی، ناشرین مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ہے..... دراصل یہ ڈاکٹر وحید قریشی صدر نشین مقتدرہ کے دور میں ایک سیمینار کی روداد ہے۔ (سال اشاعت 1985ء) جس میں مرتب کی طرف سے چند کلمات کے علاوہ مندرجہ ذیل ابواب شامل ہیں۔

(1) صدارتی خطبہ از جناب اقبال احمد خاں (اس عہد میں وفاقی وزیر عدل و انصاف)

(2) صدر نشین اکادمی ادبیاتِ پاکستان ڈاکٹر شفیق الرحمن کا ایک مختصر مگر بلیغ خطبہ۔

(3) قومی زبان کی ترقی میں سندھ کا حصہ۔ از پروفیسر غلام ربانی آگرو موجودہ صدر نشین اکادمی ادبیات پاکستان

(4) قومی زبان و ادب کی ترقی میں بلوچستان کا حصہ۔ از ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔

(5) قومی زبان و ادب کی ترقی میں صوبہ سرحد کا حصہ۔ از جناب رضا ہمدانی

(6) قومی زبان و ادب کی ترقی میں پنجاب کا حصہ۔ از ڈاکٹر انور سدید۔

یہ تقریباً ایک سو دو صفحات پر مشتمل ایک مستند دستاویزی حیثیت کی تالیف ہے جو وسعتِ موضوع کے لحاظ سے کسی قدر تشنہ ہوتے ہوئے بھی موجودہ پاکستان میں اردو سے قدیم ہم آہنگی پر رہنمایانہ روشنی ڈالتی ہے۔ راقم اردو اور قومی یکجہتی کے ہر کارکن سے گزارش کرے گا کہ اس کا مطالعہ ضرور کیا جائے۔ آج کے نوجوان جو اردو کے پرجوش حامی بھی ہیں پاکستانی صوبوں میں اردو کی گہری جڑوں سے مناسب حد تک واقف نہیں۔ ان کے لیے یہ تالیف بہت ہی قیمتی مواد اور ماخذات فراہم کرتی ہے۔

راقم نے دانستہ کئی دوسرے مباحث اور حوالوں سے گریز کیا ہے کیوں کہ ضخامت اجازت نہیں دیتی اور وہ دوسری اشاعتوں اور مقالوں میں زیرِ گفتگو بھی آتے رہتے ہیں۔ صرف پس منظر اور حوالہ مسائل کے بعد ایک حقیقت واقعہ سامنے رکھیے تو ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا عنوان کتاب ہمارے حال و مستقبل کے لیے بھی ایک ہزار معانی کھانی بن جاتا ہے۔

آج کی حقیقتِ واقعہ

آج کی حقیقتِ واقعہ کے کئی عناصر جو درج ذیل ہیں خود بولتے ہیں۔

(1) دستورِ پاکستان کے مطابق اردو پاکستان کی قومی زبان ہے۔

(2) عوامی سطح پر اردو ہی رابطے کی زبان ہے۔ ایک محنت کش تورخم سے برائے معاش کراچی کی طرف چلتا ہے تو مختلف لسانی علاقوں میں صرف اردو ہی کے ذریعے نہایت آسانی کے ساتھ ادائے مطالب و تفہیم مطالب کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔

(3) قومی سطح کے رہنما عوام سے اردو میں ہی خطاب کرتے ہیں..... چند برس سے وفاق، پنجاب، سرحد اور بلوچستان میں سالانہ میزانیے یعنی بجٹ کے خطبے اردو میں ہی دیے جا رہے ہیں۔ (خواہ بعض بجٹ دستاویزات کو انگریزی میں چھاپا جائے) سندھ میں بھی بجٹ انگریزی یا سندھی میں پیش کیا جائے تو اردو ترجمہ ساتھ ہوتا ہے۔

(4) اردو روزناموں اور جرائد کی اشاعت تمام اطراف پاکستان تک پہنچنے کے علاوہ بیرونی دنیا کے تقریباً اُن تمام مقامات میں پھیل رہی ہے جہاں پاکستانی کام کرتے ہیں۔ بطور خاص مشرقِ وسطیٰ، امریکہ، برطانیہ، جرمنی، اسکینڈے نیویا، شمالی افریقہ، ماریشس، شیسلیز، جاپان، ہانگ کانگ، سنگاپور وغیرہ ..... ہندوستان کا ذکر دانستہ نہیں کیا گیا کیوں کہ اس وقت گفتگو پاکستان میں قومی یکجہتی کے حوالے سے ہے۔ (ہندوستان کے اردو حلقوں میں تو ہمارے روز نامے اور جرائد جاتے ہی ہیں۔ ویسے ہندوستان میں اردو بجائے خود ایک بڑا موضوع ہے۔ عام بول چال میں غالباً سب سے بڑی زبان اور تحریر و ادب میں بھی ایک نہایت ہی اہم زبان.....)

(5) تمام پاکستانی صوبوں میں اردو نصاب تمام مدارج میں نافذ ہے۔ اردو میں مذہبی کتابوں کی تعداد ہمیشہ سے تمام قبل از تقسیم ہندوستانی زبانوں سے کہیں زیادہ تھی اب تو یہ تناسب اور بھی بڑھ چکا ہے۔

(6) ماتحت عدالتوں سے لے کر عدالت عظمیٰ تک بہت سا کام اور بطورِ خاص عدالت ہائے عالیہ و عدالت عظمیٰ میں جرح اور دلائل اردو میں بھی مستعمل ہیں۔

(7) جیسا کہ اوپر بتایا گیا، کئی صوبوں کے سرکاری دفاتر میں اردو بھی رائج ہے اور سندھ میں درخواستیں اور دستاویزات اردو میں بھی قبول کی جاتی ہیں۔ پنجاب سرکار میں کامل اردو نفاذ کے لیے نہایت ٹھوس اقدامات پوری تیزی سے کیے جا رہے ہیں۔ باقی تینوں صوبوں کی بلدیاتی کارروائیاں اردو میں بھی ہوتی ہیں۔ اندرونِ سندھ میں بھی اردو کی اجازت ہے۔ کراچی کی بلدیہ عظمیٰ نے اردو کو کبھی سے اختیار کر رکھا ہے۔

(8) پی آئی اے کے جہازوں پر تمام اعلانات انگریزی کے ساتھ اردو میں لازمی ہیں، پاکستان کے فضائی اڈوں پر آنے جانے والی دوسری بیرونی فضائی کمپنیوں کے جہازوں میں ان کی قومی زبان اور انگریزی کے ساتھ تمام اعلانات اردو میں بھی ہوتے ہیں۔

(9) پورے ملک میں انگریزی روزناموں کی کل روزانہ اشاعت 1991ء میں بھی ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ نہیں بڑھی جب کہ اردو روزناموں کی مصدقہ تعداد دس لاکھ روزانہ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ (ملاحظہ ہو آڈٹ بیورو آف سرکولیشن کی رپورٹ 1990ء) ہفتہ وار اور ماہانہ جرائد کے اعداد و شمار بوقت تحریر دستیاب نہیں۔ اندازہ ہے کہ ہزار سے اوپر ہو چکے ہیں۔

(10) اردو کالجوں (فنون، سائنس، تجارت، قانون) میں سائنس کے بیشتر اور فنون کے تمام مضامین کا اردو میں تدریسی تجربہ یونیسکو نے پانچویں دہائی میں ہی قابلِ تحسین قرار دے دیا تھا اس کے بعد سے ایک آدھ مضمون چھوڑ کر تمام مضامین میں ذریعہ تدریس و امتحانات کے طور پر تمام جامعات میں قابلِ قبول ہو چکی ہے۔

(11) مختلف نجی، نیم سرکاری اور سرکاری اداروں نے اردو لغات، اصطلاحات،

معاشی علوم، اقتصادی تجارتی علوم پر طبعزاد تصانیف، تالیفات، ترجموں، قاموس اور (تخلیقی ادب کے علاوہ) دیگر موضوعات پر جتنا کام کرلیا ہے اس کی کوئی جامع فہرست تو تاحال مرتب نہیں ہو سکی لیکن اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی مستند کتابوں کی تعداد لاکھوں سے اوپر پہنچ چکی ہے اور اردو کو ہر شعبہ علم میں زیادہ سے زیادہ قابلِ استعمال بنانے کے بے شمار منصوبے پوری تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ یوں علوم کے فکری اور عملی تقاضوں کا بڑھتا ہوا پھیلاؤ دنیا بھر کی (نام نہاد) ترقی یافتہ زبانوں میں بھی مسلسل اضافوں کا طالب رہتا ہے۔انگریزی جیسی زبان کو کمپیوٹر ٹیکنالوجی، خلائی علوم، طب بطورِ خاص جینیاتی انکشافات و تجربات وغیرہ کے لیے ہر سال ہزاروں نئی سے نئی اصطلاحات، الفاظ تک وضع کرنے پڑتے ہیں..... اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ اردو میں قرار واقعی سرکاری سرپرستی نہ ہونے سے رفتار کار اتنی تیز نہیں مگر وضع اصطلاحات، ترجموں، مرتبات وغیرہ کے اضافے برابر جاری ہیں۔

(12) اردو میں ہماری علاقائی یعنی پاکستانی زبانوں کے بہت سے صرفی، نحوی اور لغاتی اثرات تو ہمیشہ سے آمیز تھے بلکہ بڑی حد تک وہ ان سے مرکب بھی تھی۔ آزادی کے بعد سے وہ بھی بڑی تیزی کے ساتھ انھیں نمایاں طور سے اختیار کرتی جاتی ہے۔ آج ہماری پاکستانی اردو پاکستان کے ہر صوبے اور ہر لسانی عرفیت کا لب و لہجہ بھی اپنا چکی ہے جو اسے حسین تر بنا رہا ہے اور لسانی تشکیلات کے جو مستند تاریخی فارمولے ہیں ان کے مطابق اس کی نئی تشکیل و توسیع کا طبعی عمل محسوس و غیر محسوس طریقے سے پورے پاکستان میں جاری رہتا ہے۔ پاکستان میں اردو کا موجودہ تخلیقی ادب قدم قدم پر اس کے نہایت جاندار، خوبصورت نمونے پیش کررہا ہے۔

یہ ایک حقیقتِ واقعہ تھی ... یہ قومی یکجہتی کی راہ میں مثبت عناصر ہیں جن کی اہمیت اور عملی، طبعی، قوت مسلّم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقتِ واقعہ ہماری قومی زندگی کا ایک تاریک پہلو بھی ہے جس کا ذکر ناگزیر ہے اور جو قومی یکجہتی کی راہ میں ایک بڑے ہی منفی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ وفاق میں 79-1978ء سے بحث کی تقریر (نہ کہ بحث دستاویز) تو اردو میں ہونے لگی ہے، غیر ملکی سربراہان کے اعزاز میں اور یوم آزادی اور یوم پاکستان پر ہمارے

سربراہ مملکت و سربراہ حکومت کے خطبے بھی اردو میں آنے لگے ہیں مگر دستور میں واضح شق اور وعدے کے برخلاف وفاقی دفاتر میں اردو کا نفاذ باقاعدہ طور پر شروع بھی نہیں ہوا۔ عدم نفاذ کے موضوع پر راقم نے کسی قدر تفصیل سے انجمن کی تازہ تالیف "اصطلاحاتِ بینکاری" کے حرفے چند میں روشنی ڈالی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کتاب کا محترم قاری وہ کتاب بھی خریدے ... بلکہ بینکاری میں دلچسپی نہ لینے والا عام قاری شاید اس کتاب سے رسمی دلچسپی بھی نہیں لے گا۔ اس لیے یہاں وہ سب تو اسی طرح دہرایا نہیں جا سکتا ... (اور وہ ایک پوری، خاصی طویل کہانی ہے) لیکن ان اسباب کا اختصار ضرور کیا جا سکتا ہے جو اردو کے نفاذ کے علاوہ، قومی یکجہتی میں بھی حائل ہو رہے ہیں۔

(1) نفاذ اردو سے بالآخر ملک میں طبقاتی ناہمواری کی شدت میں کمی ہو سکتی ہے یہ امکان مفاد پیوستہ اور دور نہ دیکھنے والے اعلیٰ طبقات کو منظور نہیں۔

(2) بعض حکومتیں اپنی جہدِ بقا میں شدت کے ساتھ مصروف رہنے کی وجہ سے اس طرف بھرپور توجہ نہیں کرتیں، بعض حکومتیں دستور کی اس شق سے مخلصانہ طور پر متفق نہیں عوامی دباؤ کے سبب کھل کر اس کی مخالفت بھی نہیں کرتیں۔

(3) مقابلے کے امتحانات مسلسل انگریزی میں ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے امیدواروں کو شروع سے انگریزی میں اختصاص حاصل کرنا پڑتا ہے۔ نوکری ملنے کے بعد سارا کام تو انگریزی میں کرنا ہی ہوتا ہے مزید لازمی تربیت کے مراحل۔ نیپا، ایڈمنسٹریٹیو اسٹاف کالج میں جو لمبے لمبے دورانیوں کی ہوتی ہے ذریعہ ابلاغ صرف انگریزی ہے۔ یعنی ترقی کے لیے بھی انگریزی میں ہی سب کچھ پڑھنا اور لکھنا پڑتا ہے۔

(4) بیورو کریسی، چند مستثنیات کے علاوہ، نفاذ اردو کے خلاف رہتی ہے کیوں کہ انھیں ڈر ہے کہ وہ اردو تحریر میں اپنا مافی الضمیر روانی اور پوری بلاغت کے ساتھ تحریر نہیں کر سکیں گے، ماتحتوں کے برابر آ جائیں گے (حالانکہ دیگر بہت سے اسباب کی بنا پر ماتحت صرف زبان کی بنیاد پر ان جیسی حیثیت حاصل نہیں کر سکتے) انھیں اس کی عادت نہیں اس لیے الجھن ہوتی ہے۔... حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ یہ

ایک پکا، مستقلاً، مقتدر طبقہ ہے یہ حکومت کو ڈراتا ہے کہ وفاق میں اردو لفاظ اضطراب وانتشار پیدا کر دے گا۔ حکومت کا روز مرہ کام بند ہو جائے گا۔

(5) پارلیمان، اور اس کے ذریعے کابینہ میں آنے والے زیادہ تر جاگیر دار اور "اعلیٰ طبقے" سے ہوتے ہیں۔ وہ راعی اور رعایا کا تصور لے کر آتے ہیں نہ کہ خادم اور خلق خدا کا.... قومی زبان خلقِ خدا کی قومی زبان ہے اگر وہ اسے سیاسی خطابوں کے علاوہ دفتری لکھت پڑھت میں بھی استعمال کرنے لگیں تو (وہ سوچتے ہیں کہ) وہ آہستہ آہستہ رعایا کے برابر ہو جائیں گے...... حالانکہ اب بیشتر تقریریں اردو میں ہونے لگی ہیں۔

(6) ہمارا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ..... اور آج کل ہر طرف وہی برسر کار و اقتدار ہے.... اردو کو شعر و ادب، سیاست (اور کسی حد تک صحافت عوام میں تبادلۂ خیال کی زبان تو سمجھتا ہے "کام کی زبان" نہیں سمجھتا... وہ اصطلاحات نہ ہونے کی شکایت کرتا ہے۔ جب اصطلاحات وضع کر کے دکھائی جائیں تو انھیں "مشکل اردو" قرار دینے لگتا ہے۔ پرانی، مُسَلَّمَ، اصطلاحات کو آؤٹ آف ڈیٹ کہتا ہے۔ سائنس کے جدید سے جدید شعبے میں اردو استعمال نہ ہوسکنے کا ذکر کرتا رہتا ہے جب کہ سائنس اور طب یعنی علوم خصوصی و جدید کی اصطلاح تو خود اچھے سے اچھا انگریزی جاننے والا بھی نہیں سمجھ سکتا تاوقتیکہ وہ سائنس، طب کے متعلقہ شعبے کا طالب علم اور ماہر نہ ہو۔ سائنس کے بعض علوم بعض شعبے اس تیزی سے پھیل رہے ہیں کہ بڑے بڑے مغربی اداروں نے ان کے لیے وضع اصطلاحات کے خاص انتظامات کیے ہیں اور پھر بھی اظہاریات کے مطالبے پورے نہیں کر پاتے۔ طبیعیات، طب (بطور خاص نئے نئے انکشافات) اور معاشیات میں جو نئے سے نئے بلکہ انقلابی تصورات داخل ہو رہے ہیں وہ خود انگریزی اور سبھی یورپین، زبانوں کے لیے اظہاری مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ ان اظہارات کے لیے لغات مروجہ میں الفاظ نہیں ہیں۔ چنانچہ کبھی قدیم یونانی، کبھی لاطینی سے استفادہ کر کے، کبھی دوسری زبانوں کے قریب المعنے الفاظ سے آمیز کر کے کبھی کوئی بالکل باہر کا لفظ اپنا کر اصطلاحیں بنائی جارہی ہیں۔ یہ علوم جدید کے لاانتہا پھیلاؤ کے ساتھ ایک مسلسل عمل شروع ہوا ہے جو جاری رہے گا۔ مگر ہمارے مشاہفیت زدہ

انگریزی پسند یہ سب انگریزی زبان کے لیے تو جائز رکھتے ہیں قومی زبان میں وضع و تعارف اصطلاحات کو ایک بے کار، مشکل سے سمجھ میں آنے والا بلکہ سمجھ میں نہ آنے والا اقدام قرار دیتے ہیں۔ جب کہ قومی زبان میں ایک مخصوص مکتبِ فکر جس سے راقم بھی متفق ہے سائنسی اور طبی شعبوں میں ایسی ہزارہا انگریزی اصطلاحوں کو من و عن اردو میں سمو لینے کے حق میں ہے جو بین الاقوامی حلقوں میں زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں..... بہر حال "اصطلاحات نہ ہونا" یا "اچھی مستند" اصطلاحات نہ ہونا ایک الزامی حربہ ہے جس کے ذریعے اردو نفاذ کو بار بار روک دیا جاتا ہے جب کہ وضع اصطلاحات کا کام مسلسل اور بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

(7) باہمی سیاسی پیچیدگیوں میں "لسانی مسئلے" کو (جب کہ اکثر اوقات اس وقت اس کا وجود ہی نہیں ہوتا) اسیر کر کے نفاذ کی بات ٹال دی جاتی ہے۔

(8) انگریزی ایک وقار اور برتری کی علامت کے طور پر قبول کر لی گئی ہے اور اسی حیثیت میں عام آدمی پر بھی تھوپی جا رہی ہے چنانچہ عام آدمی بھی گھبرا کر اور اپنے مفادات سے مجبور ہو کر اُدھر ہی جانا چاہتا ہے اور اس کا ذہن اس امر میں آلودہ ہوتا جا رہا ہے کہ وہ نفاذ اردو کے لیے کوئی ہمہ گیر عوامی تحریک چلائے یا نہ چلائے جس میں بہت سی قربانیاں دینی پڑیں گی۔

(9) بیرونی طاقتوں بالخصوص امریکہ و یورپ کا مفاد اسی میں ہے کہ پاکستان میں قومی یکجہتی پیدا نہ ہونے پائے اور اس کی راہ میں عدم نفاذ اردو اسے مناسب لگتا ہے چنانچہ ظاہر و خفیہ ان کے ادارے بھی ہماری انتظامیہ، دنیائے روابط اور اربابِ سیاست پر منفی طور سے اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

(10) گاہے گاہے اردو بمقابلہ دیگر پاکستانی یعنی علاقائی زبانوں کا مسئلہ کھڑا کر کے نفاذ ملتوی کرا دیا جاتا ہے جب کہ اردو اور کسی پاکستانی زبان کا کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ یہ چند، محض چند مگر نہایت طاقت ور عناصر ہیں جو ایک تاریک، منفی حقیقتِ واقعہ پیش کرتے ہیں.....

جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ آج کی حقیقتِ واقعہ سے صرف چند عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے..... اس تناظر میں یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اگر ہمیں پاکستان میں

قومی یکجہتی کا قیام و استحکام مطلوب ہے تو دوسرے سیاسی، سماجی، اقتصادی اقدامات کی اہمیت اپنی جگہ، لسانی سطح پر اس کا ذریعہ اردو اور صرف اردو ہے انگریزی یا کوئی دوسری زبان نہیں جب کہ انگریزی کی بین الاقوامی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اپنے اپنے دائرہ کار میں پاکستانی زبانوں کی ناگزیریت فروغ اور استحکام کی اہمیت تو مسلم ہے ہی، ایک بار پھر دہرا دیا جائے کہ اردو کا کسی بھی مقامی زبان سے کوئی تضاد نہیں بلکہ اردو اپنی وسعتوں کے لیے ان سے مسلسل تعاون کرتی رہے گی جو ایک جدلیاتی اور لسانیاتی لازمہ ہے۔

اردو نے تحریکِ پاکستان کی راہ میں قومی یکجہتی کے لیے جو کردار ادا کیا وہ فاضل مصنف ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی زیرِ نظر کتاب سے ثابت ہے۔ جب اردو قیامِ پاکستان کا ایک، اشتراکِ مذہب کے بعد غالباً سب سے بڑا، محرک ثابت ہو چکی ہے تو تاریخی تسلسل کا فارمولا لازمی طور پر اس موقف کی طرف لے جاتا ہے کہ وہی پاکستان میں قومی یکجہتی، اس کے استحکام اور ترقی پذیر مستقبل کی راہ میں ایک ناگزیر ذریعہ ہے۔

جو عناصر آج بھی قیامِ پاکستان کی تاریخی ناگزیریت تسلیم نہیں کرتے (اور انھیں اس کا فکری حق ہے یا نہیں یہ الگ بحث ہے راقم ضرور یہ ناگزیریت تسلیم کرتا رہا ہے اور کرتا ہے) ان سے محبانِ پاکستان کے مباحث مختلف تحریروں اور مجالس میں جاری رہتے ہیں یہ انھیں دہرانے کا موقع نہیں لیکن جو عناصر قیامِ پاکستان، قومی یکجہتی اور استحکامِ پاکستان کے حق میں ہیں، اور پاکستان کا مستقبل بہتر بنانے کے خواہاں، انھیں ہر سطح پر اور ہر جائز طریقے سے اردو کے تحفظ و فروغ کے لیے ہر کام کرنا ہوگا۔ ایک قوم کے لیے ایک زبان ضروری ہوتی ہے۔ اگر پاکستانی اپنے آپ کو ایک قوم سمجھتے ہیں تو انھیں اپنی قومی زبان کو دستور کے مطابق، معروضی حقائق کے مطابق اور تعمیرِ مستقبل کے لیے اردو کو ہی وفاقی سرکاری دفاتر میں بھی نافذ کرنا ہوگا جس کی تیاریاں ہر طرح مکمل ہو چکی ہیں۔ یقیناً بہت سے شعبہ ہائے حیات کے جدید اور آنے والے عملی تقاضے انگریزی اور دوسری بڑی بین الاقوامی زبانوں کی طرح اس میں اضافوں کا مطالبہ بھی کرتے رہیں گے مگر جیسا کہ عرض کیا گیا

ایسے اضافے وضع اصطلاحات اور ترجموں کے ذریعے اب بھی ہو رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے......

انجمن نے آزادی سے قبل قومی یکجہتی کے لیے اردو کے ذریعے جو کردار ادا کیا وہ کئی دوسری اشاعتوں کے علاوہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی زیر نظر کتاب سے ظاہر ہے۔ آزادی کے بعد بھی انجمن کی خدمات جاری ہیں، جن کی تفصیل ہماری اشاعتوں اور جرائد کے ذریعے سامنے آتی رہتی ہے لیکن آزادی کے بعد سے قومی اور تجارتی جمع قومی مقاصد کے تحت بہت سے دوسرے نیم خود مختار اور سرکاری اور نجی اداروں نے ترقیِ اردو کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں انجمن خدانخواستہ معاملات اردو کی اجارہ دار نہیں وہ ان سب سے تعاون کرتی رہی ہے اور سب کی کامیابی کے لیے دست بدعا رہتی ہے ..... اردو پر پہلے بھی کسی کا اجارہ نہیں تھا اب بھی نہیں ہے۔ ذمہ داری سب کی تھی اب بھی ہے۔

ہاں ابھی وہ وقت آتا ہے جب کوئی پاکستانی نہایت مسرت و اعتماد کے ساتھ پاکستان میں اردو کا طربیہ لکھے گا۔ وہ بابائے اردو کے کتابچے (پاکستان میں اردو کا المیہ) کا داغ بھی دھوئے گا اور ہمارے عظیم قومی مستقبل کی ایک مستحکم ضمانت بھی بن جائے گا وہ وقت دور نہیں.... گو قریب بھی نظر نہیں آتا (کیوں کہ جب تک اردو وفاقی دفاتر میں نافذ نہیں ہوتی انگریزی کی غیر متناسب اہمیت، اس کے، پاکستان کے، عظیم ترین امکانات پر تاریک سائے ڈالتی رہے گی....) اگر ہمارے اربابِ اختیار چاہیں تو وہ وقت بہت قریب آسکتا ہے۔

1991ء

فرہنگ

اصطلاحاتِ بینکاری

تشکیل، ترجمہ، تدوین

محمد احمد سبزواری

معاونت و مقدمہ

جمیل الدین عالی

پہلا ایڈیشن

اس اشاعت میں بڑی محنت، توجہ اور تمام ممکنہ مہارت و مشاورت سے تیار کی ہوئی گیارہ ہزار کے قریب اردو اصطلاحاتِ پیشکاری شامل کی گئی ہیں۔ یہ اس شعبے میں آج سب سے زیادہ ضخیم اور یقیناً اہم ترین اردو دستاویز ہے جس کے فنی، تکنیکی، افادی اور دوسرے پہلوؤں پر ہم اس مقدمے کے دوسرے باب میں گفتگو کریں گے بلکہ ادباً مشورہ ہے کہ جنھیں صرف اس اصطلاح سازی سے دلچسپی ہے وہ باب سوم پہلے ملاحظہ فرمالیں مگر ہمیں اس سے پہلے اصل مسئلے ..... ایسی کوششوں کی افادیت اور سرکار دربار میں نفاذِ اردو..... کے حوالے سے کچھ ضروری گزارشات ریکارڈ پر لانی ہیں کیوں کہ یہ اصطلاحات محض کسی علمی نمائش یا کوئی بجٹ خرچ کرنے کے لیے وضع اور شائع نہیں کی جارہی ہیں۔ ہمارا مقصد اپنی اشاعتوں میں محض ایک اور کتاب کا اضافہ کرنا نہیں تھا۔ ہمیں کسی نے اس کے لیے مجبور بھی نہیں کیا، فی الحال اس کی کوئی "مارکیٹ" بھی نظر نہیں آتی کہ کچھ منافع کمایا جاسکے ..... اتنی محنت ایک ممکنہ افادیت، اور پاکستان کے دستوری و تاحال قومی موقف کے مطابق ..... ایک ضرورت کے تحت کی گئی ہے جو تحریکِ پاکستان کا ایک نہایت اہم حصہ تھی اور ہے اور جو قیامِ پاکستان کے بعد بھی قائد اعظم کے واشگاف اعلان (ڈھاکہ) کے حوالے سے ایک واضح، بنیادی اور نہ صرف پاکستانی قومی یک جہتی بلکہ مستقبل میں پاکستانی اقتصادی ترقی کے لیے ایک حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔ خواہ اس حکم کی تعمیل میں کیسے ہی طاقت ور عناصر کتنے ہی روڑے اٹکاتے رہے ہوں..... قائد اعظم کا اعلانِ ڈھاکہ صرف تحریکِ پاکستان کے بنیادی وعدے دہرا دینے کا اقدام نہیں تھا۔ اسے آج بھی غور سے دیکھا جائے تو عصرِ حاضر اور آنے والی کئی دہائیوں، اگلی پوری صدی کے لیے ایک بہت ہی دُور اندیشانہ رہنما تھا اور ہے کیوں کہ پچھلے چالیس سال میں یونیسکو سے لے کر ہر قابلِ ذکر بین الاقوامی ادارے اور ماہرین تجربات، مشاہدات اور

تحقیقات کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی قوم کے سرکاری اور کاروباری معاملات یعنی تدریس سے لے کر تمام علمی شعبہ ہائے حیات میں ایک قومی زبان ہی نافذ و رائج ہونی چاہیے۔ اگر کسی مخصوص شعبے کے ذخیرہ الفاظ میں کوئی کمی ہے تو اسے نئے الفاظ و اظہار، ترجموں وضعِ اصطلاحات، اور نئے آمیزوں کے ایک مسلسل عمل سے پورا کرتے رہنا چاہیے۔ انگریزی، جسے آج ہم نعوذ باللہ صبح و شام سجدہ کرتے ہیں، نہ تو ہمیشہ سے اتنی ترقی یافتہ تھی جتنی آج ہے۔ نہ آج بھی اتنی ترقی یافتہ ہے کہ جامد ہو جائے تو سینکڑوں نئے نئے تقاضوں سے جو دنیا کی معاشی اور سائنسی تبدیلیاں ہر روز پیدا کر رہی ہیں صرف آج کے جاریہ لغات و اظہار کے بل پر ادائے مطالب کر سکے۔ مثلاً اسے خلائیات، جینیات، کمپیوٹر سائنس اور اقتصادی بحرانوں میں روز روز نئے سے نئے اظہار، اصطلاحات، مرکبات تلاش اور وضع کرنے پڑتے ہیں، جن کے لیے پرانے یونانی، لاطینی ماخذات سے ہی نہیں دنیا کی کسی بھی زبان سے کوئی لفظ، کوئی آمیزہ، کوئی مدد مل جائے اسے اپنانے میں ذرا تکلف نہیں کیا جاتا۔ سائنسی اور طبی (بطور خاص جینیاتی) علوم میں تو وقفوں وقفوں سے پوری کی پوری موضوعاتی کتب لغات مرتب کی جا رہی ہیں جو عام آدمی ہی کیا ایسے خاص آدمی کے لیے بھی نامانوس ہیں جسے ان علوم سے روز مرہ کا علمی، تحقیقی، تجرباتی واسطہ نہیں پڑتا.... اقتصادیات سے صرف ایک مثال لیجیے۔ انگریزی کی کوئی بھی پرانی، مستند، ڈکشنری، آکسفورڈ ویبسٹر نکال لیجیے۔ وہاں STAGFLATION کا لفظ نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ جس کیفیت کا اظہار اس لفظ، آمیزے، مرکب یا اصطلاح سے مقصود ہے وہ اُن دنوں موجود ہی نہیں تھی یا معاشتین اسے اس سائنٹفک طریقے سے نہیں دیکھتے تھے۔ انگریزی میں ایک لفظ ہے INFLATION اُسے رواجاً افراط یا افراطِ زر کہتے ہیں۔ دوسرا لفظ ہے STAGNATION۔ اسے جمود، سکوت، بے حرکتی، رکا ہوا ہونا، بندھا ہوا ہونا، جامد، اتفاق بند کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لارڈ کینز کے معاشی فلسفے میں (جو بڑی حد تک آج بھی جاری وساری کہلاتا ہے اور جس کی جگہ کوئی دوسرا باقاعدہ، تمام وضع نہیں ہوا گو اس میں دراڑیں پڑ گئی ہیں) اگر کسی معیشت میں جمود ہو یعنی وہ متحرک نہ ہو تو افراطِ زر نہیں ہو سکتی تھی۔ بظاہر یہ ایک قسم کا "طبعی" فارمولا تھا یعنی

جب معیشت متحرک ہی نہ ہو تو پیدائشِ زر اس درجے تک کیسے پہنچ سکتی ہے کہ افراط کا شکار ہو جائے.... مگر بے شمار عوامل کی وجہ سے، جن کا اندازہ بڑے بڑوں کو نہ تھا، مغربی معیشت (سابق سوشلسٹ ممالک کی ایک اپنی کہانی ہے) باقی دنیا کے بیشتر ممالک میں بھی معیشت، ایسی کیفیت سے گزرنے لگی کہ مطلوبہ حد تک متحرک بھی نہیں اور غیر مطلوبہ حد تک نہ صرف پیدائشِ زر ہوئی بلکہ افراطِ زر نے بھی آدبوچا.... اب اس کیفیت کا اظہار کیسے ہو۔ ماہرین یا لوگوں نے STAGFLATION مرکب وضع کرلیا۔ چونکہ یہ ایک مشکل آمیزہ بھی نہیں تھا اور تقریباً ہر فرد اس سے متاثر ہو رہا تھا، اس لیے یہ اصطلاح جلد عام بھی ہو گئی۔ آج مغرب کا تو معمولی سے معمولی تعلیم یافتہ بھی اور "ترقی پذیر" غیر مغربی ممالک کے غیر ماہرِ اقتصادیات خواں بھی اسے خوب بولتے اور سمجھتے ہیں۔ جب تک یہ اصطلاح وضع نہیں ہوئی تھی۔ یعنی کوئی تیس چالیس برس پہلے تک۔ کیا انگریزی ایک ترقی یافتہ زبان تھی یا نہیں؟ جواب ہاں بھی ہے اور نہیں بھی.... دنیا کی کوئی بھی زبان ازل سے کاملیت کے ساتھ نہ بنی نہ محفوظ ہوئی کہ جوں ہی کوئی اظہار مطلوب ہوا کھٹ سے ایک بنا بنایا لفظ سامنے آیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا.... ایک عرصے تک خود دربارِ انگلستان میں فرنچ رائج تھی اور اسے انگریزی کے مقابلے میں عزت و وقار کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی زبان کے ارتقا و نفاذ کی تاریخ جاننے والے تمام تفصیل جانتے ہیں۔ اسے دہرانا ضروری نہیں۔

معتبر فرنچ دانشور جن پر لسانی شاونیت کا الزام بھی نہیں لگ سکتا اور خود بہت سے انگریز اور امریکی ماہرین انگریزی اس ادعا و اعتراف کا بار بار اعلان کرتے ہیں کہ بعض فرنچ بلاغتوں کی تہہ داری کا مقابلہ آج کی انتہائی ترقی یافتہ انگریزی بھی نہیں کر سکتی۔ جہاں تک راقم جانتا ہے انگریز فرنچ کے خلاف ایسا دعویٰ نہیں کرتے۔ بہرحال، مقصود انگریزی، فرنچ کا موازنہ نہیں۔ صرف اتنا دہرانا ہے کہ کوئی بھی زبان ہمیشہ سے ہمیشہ کے لیے کامل نہیں ہوا کرتی۔ نہ ہو سکتی ہے۔ اگر اسے انسانی ذہن کے ارتقا اور معاملات کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنا ہو تو اس میں اضافے، تغیرات اور دوسری زبانوں سے استفادہ لازمی ہوتے ہیں۔ بلکہ اگر چند فقرے بڑھا کر

ایک کلیہ پوری طرح دہرانے کی اجازت ہو تو یاد دلایا جائے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی کسی ایک فرد یا معاشرے تک کی طبع زاد ایجاد نہیں ہے۔ ہر زندہ زبان افراد کے باہمی ارتباط اور معاملات کی انحصار طلبی نے پیدا کی ہے۔ اس نے طرح طرح کے سفر کیے ہیں۔ سفروں میں دوسرے ساتھی ساتھ لیے ہیں اور کبھی نادانستہ کبھی دانستہ آمیزے پیدا کیے ہیں اس طرح کہ "دوسری" زبانوں کے الفاظ بھی اسی کا حصہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اردو میں دخیل الفاظ کی ایک پوری فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ انگریزی میں تو کئی تحقیقات پر مشتمل دبیز کتابیں چھپتی رہتی ہیں۔ تو پھر، پس ماندگی کے حوالے سے، مقتدرہ (اسٹیبلشمنٹ) کا سارا زور اردو پر ہی کیوں گرتا ہے۔ ایک وقت میں پس ماندہ تو ہر زبان رہی ہے اور جب اسے نئی توانائیاں بہم پہنچائی گئیں وہ نئے نئے تقاضے پورے کرنے لگی۔ اردو بھی اسی عمل سے گزری اور اب بھی اگر مقتدرہ خلوص نیت کے ساتھ، معقول وسائل کے سمیت اسے مطلوبہ توانائی فراہم کر دے تو وہ سائنس، طب، ٹیکنالوجی اور معاشیات کے جدید ترین شعبوں میں بہت جلد انگریزی کا متبادل ثابت ہو سکتی ہے۔ بڑی حد تک ہوتی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا "نفاذ" نہیں کیا جاتا، اور بول چال کی حد تک، اعلیٰ ترین تخلیقی سطح پر قومی ارتباط کے معاملے میں تو وہ اب بھی ہمارے ملک کی سب سے بڑی زبان ہے اسے بانیانِ پاکستان اور آج بھی پاکستانی عوام نے قومی زبان اسی سبب سے قرار دے رکھا ہے۔

یہ ابتدائی سطریں اس تمہید کا آغاز ہیں جو ان "اصطلاحاتِ بینکاری" پر گفتگو سے پہلے راقم نفاذِ قومی زبان کے باب میں کرنا چاہتا ہے۔ اگر قومی زبان وفاقی حکومت میں نافذ کرنے کی نیت ہی مشتبہ ہو جیسی کہ اب تک محسوس ہو رہی ہے تو بینکاری کے شعبے میں علمی طور پر متعارف ہونے کے باوجود عملی طور پر استعمال نہیں ہو سکے گی۔ ساری اصطلاحات دھری کی دھری رہ جائیں گی۔۔۔۔ اسی طرح جیسے آج بھی برسوں کی محنت اور مہارت سے تیار کی ہوئی ہزاروں مستند، غیر متنازعہ، آسان، دفتری اصطلاحات و دستاویزات کئی سرکاری سطحوں پر منظور و مقبول ہو کر بھی سامنے موجود ہیں۔ مگر نافذ نہیں کی جاتیں۔ وہی ایک بہانہ جاری ہے کہ ابھی اردو "اس قابل"

نہیں۔

یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ ہمیں ان زیرِ نظر اصطلاحات کی فوری قبولیت یا نفاذ پر ذرا اصرار نہیں یعنی ہم یہ اس لیے پیش نہیں کر رہے کہ انھیں تمام و کمال قبول کر لیا جائے۔ وضعِ اصطلاحات سے متعلق ہمیشہ سے صرف ہمارے ملک میں ہی نہیں دنیا بھر میں جہاں نئی اصطلاحات اور معاملاتی ترجموں کی ضرورت پیش آئی یا تو بعض کو زبانِ خلق نے نقارۂ خدا بنا دیا (گو علمی معاملات میں ایسا کم ہوتا ہے) یا، اور اکثر یہی ہوا، انھیں ایک دو سے زیادہ افراد یا اداروں نے دیکھا اور کبھی بجنسہ یا باترمیم منظور کر کے درجہ استناد دے دیا۔ ہم نے اپنی طرف سے پوری احتیاط اور محنت کی ہے مگر ہم ان اصطلاحات کو حرفِ آخر قرار دے کر پیش نہیں کر رہے۔ ہم نے خاص اس فن کے ایک ماہر، فاضل اور خود بابائے اردو کے منتخب کردہ بزرگ جناب محمد احمد سبزواری کی اہلیت، فضیلت، تجربے اور محنت سے فائدہ اٹھا کر کئی علمی، فاضل، پیشہ ور بینکاروں سے مشورہ بھی کیا ہے۔ ہم ان اصطلاحات پر کھلا اظہارِ رائے، مذاکرات ضروری ہوں تو مذاکرات اور ترامیم تجویز ہوں تو ترامیم .... سب کا خیر مقدم کریں گے۔ مگر! یہ کام کسی کو تو کرنا تھا۔ آج سے چالیس برس پہلے بھی بینک دولتِ پاکستان کے گورنر جناب زاہد حسین مرحوم کی فرمائش پر انجمن کے زیرِ اہتمام بابائے اردو نے اپنی نگرانی میں انھی بزرگ جناب محمد احمد سبزواری کی اعانت سے سرانجام دیا اور اب بھی انجمن ہی نے یہ ذمہ داری قبول کی اور اس کی خوش قسمتی کہ جناب محمد احمد سبزواری حیات اور فعال ہیں اور ان ہی نے یہ کارنامہ، نسبتاً بڑے پیمانے اور جدید ترین خطوط پر سرانجام دیا ہے۔ راقم کا دخل صرف اتنا ہے کہ اتفاق سے اس کو شعبہ بینکاری میں 21 برس ملازمت کرنی پڑی تھی اور اسے صدر دفتر سے لے کر شاخوں تک، یعنی عملی میدان بینکاری میں کچھ مشاہداتی علم حاصل کرنا پڑا تھا۔ جب کہ سبزواری صاحب نے کبھی شعبہ بینکاری میں ملازمت نہیں کی۔ راقم نے ان کی ان انتہائی فاضلانہ کوششوں کو مختلف عملی نقطہ ہائے نظر سے دیکھا اور جیسا کہ آگے ذکر آئے گا کئی فاضل سینئر بینکاروں سے مشورت و رہنمائی حاصل کی گئی تب کہیں جا کر

یہ دستاویز تیار ہوئی ہے۔ اس کی اشاعت بوجوہ کسی قدر تاخیر سے ہو رہی ہے۔ جس کے لیے راقم بطور خاص معذرت خواہ ہے۔ مگر شاید یہی وقت ہے جب اس دستاویز پر توجہ کی توقع کی جا سکتی ہے کیوں کہ آج کی مقتدرہ میں شامل سیاسی عناصر جو فیصلوں کی طاقت رکھتے ہیں وہ اردو کے خلاف ان تعصبات میں معروف نہیں جن سے ایک حکومت کے اس موضوع سے متعلق بعض عناصر کھلے طور پر متصف تھے۔ ہم کو یہ توقع بھی ہے کہ ان کے نفاذ سے پہلے بھی انھیں من و عن نہ سہی بڑی حد تک متعلقہ طقوں اور قوم پرست دور اندیش بینکاروں میں قبولیت حاصل ہو سکتی ہے اور بعض بینک اپنے اپنے طور پر بھی چند اُن شعبہ ہائے کار میں جن کا تعلق عام کھاتہ دار کے ساتھ روزمرہ آسان رابطے سے ہے بہت سی اصطلاحات کو متعارف یا رائج بھی کرا سکتے ہیں جیسا کہ راقم نے آٹھویں دہائی میں خود نیشنل بینک آف پاکستان کی منتظمہ سے منظوری لینے کے بعد پنجاب کے چند اضلاع اور کراچی حیدرآباد وغیرہ میں آزمائشی طور پر کیا تھا۔۔ اور یہ آزمائش کامیاب ثابت ہو کر وہاں متعلقہ فارموں، اصطلاحوں اور تحریروں کو رائج کر چکی ہے۔۔۔ (اس کا کسی قدر ذکر آگے آتا ہے)

لیکن بوقت تحریر بھی قومی زبان کے دفتری نفاذ میں جو روڑے اٹکے ہوئے ہیں یا اٹکائے جا رہے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر راقم الحروف بڑی خوش گمانی سے کام لے تب بھی یقین نہیں کہ اس مستقبلیاتی کوشش کی سرکاری پذیرائی کافی مثبت ہوگی یا نہیں اور اگر ہوئی تو کیا عملی شکل اختیار کرے گی۔۔۔۔

جیسا کہ عرض کیا گیا دراصل تمام اصطلاحات کی طرح ان اصطلاحات کا معاملہ بھی سرکاری سطح پر نفاذ اردو سے گتھا ہوا ہے۔ مجموعی طور پر بینکاری کی زبان بھی لازماً وہی ہونی چاہیے جو سرکاری ہوگی۔ خدشہ اس بات کا ہے کہ جو بااثر حلقے اور افراد روزمرہ کے آسان تر معاملات میں بھی قومی زبان کا نفاذ نہیں ہونے دیتے (جب کہ وہ آسان تر عمل ہے) وہ انھیں بھی کسی نہ کسی بہانے یا صاف صاف یہ کہہ کر سرد خانے میں پھینک دیں گے کہ یہ ایک بڑے نازک معاشی شعبے کا معاملہ ہے جو قومی نہیں رہا بلکہ بین الاقوامی ہو چکا ہے۔ حالاں کہ پاکستان میں پچانوے فیصد بینکنگ پاکستانی کھاتہ داروں اور پاکستانی بینکوں کے۔ بین ہوتی ہے اور پاکستانی کھاتہ داروں کی غالب

ترین اکثریت رابطے کی زبان کے طور پر صرف قومی زبان میں ہی بہتر تفہیم دستاویزات و معاملات اور اظہارِ مطالب کر سکتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا۔ ان اصطلاحات کے اہم پہلوؤں پر گفتگو اگلے باب میں ہوگی۔ اولاً (اور لازماً) ہمیں قومی زبان کے نفاذ کا سابقہ اور موجودہ منظر نامہ دیکھنا ہے۔

باب دوم

نفاذ

سرکاری دفاتر بطور خاص، وفاقی معتمدی (سیکریٹریٹ) اور وفاق کے متعلقہ محکموں میں قومی زبان کا نفاذ یا عدم نفاذ ایک طویل المیہ ہے جو قیام پاکستان سے آج تک جاری ہے۔ کوئی حکومت ایسی نہیں آئی جو کھل کر یہ فیصلہ کر سکے کہ قومی زبان قومی تو ہے مگر قوم کے دفاتر میں نافذ نہیں کی جائے گی سرکاری زبان ہمیشہ انگریزی ہی رہے گی اور دساتیرِ پاکستان میں (1956, 1962, 1973ء) سے جو ایک مستقل شق چلی آرہی ہے۔ اسے منسوخ سمجھنا چاہیے۔ آج تک کسی سخت گیر سے سخت گیر مارشل لاء حکومت کی بھی یہ ہمت نہیں ہوئی کہ قومی زبان کا نفاذ مستقل طور سے ناممکن یعنی ناقابلِ عمل قرار دیتے ہوئے انگریزی کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دے دے..... دو مارشل لاز نے پورے دستور کو منسوخ کر دیا۔ تیسرے مارشل لاء نے 1973ء کے دستور کی بہت سی شقیں معطل کر دیں۔ دستور 1973ء میں تادمِ تحریر گیارہ ترمیمات ہوئیں مگر قومی زبان کی شق کسی دستور سے خارج نہیں کی گئی۔ نفاذ کا وعدہ بھی مسلسل برقرار رکھا جاتا ہے مگر جب اس کے نفاذ کی مقررہ میعاد قریب آئے اس میں کبھی پانچ، کبھی دس برس کی توسیع کر دی جاتی ہے۔

دوسری طرف کوئی وفاقی حکومت ایسی نہیں آئی جس نے زبانی کلامی "اظہار ارادہ" اور کہیں کہیں مثلاً کسٹمز اور بچت سے متعلق بعض روزمرّہ استعمال میں آنے والی چند دستاویزات کے معاملے میں جزوی تعارف کے علاوہ وفاقی وزارتوں اور ان کے متعلقہ دفاتر میں قومی زبان بتدریج ہی نافذ کرنے پر کمر باندھی ہو۔ جب بھی نفاذ کا مسئلہ اُٹھتا ہے انھیں "گیسوئے اردو منت پذیرِ شانہ" نظر آنے لگتا ہے.... جب کہ

راقم نے بیرونی جامعات جا جا کر خود انگریزی، جرمن، فرنچ، روسی، جاپانی، چینی جیسی زبانوں کے بڑے بڑے ادیبوں اور ماہرین سے بھی یہی سنا اور ان کی سیکڑوں تحریریں اور مباحث گواہ ہیں کہ ابھی ان کی زبان ہمہ جہت کاملیت کے معاملے میں بڑے بڑے مسائل سے دوچار ہے۔ اس میں مزید انضباط، بڑی ترقی ضروری ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور یہ سب ان کی بہت سی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ چونکہ یہ بات سب واقفانِ کار کو معلوم ہے اور یہ تحریر السنۂ عالم کے مسائل پر کوئی تحقیقی مقالہ بھی نہیں۔ اس لیے ان کے حوالے نہیں دیے جا رہے ہیں۔ اگر کوئی راقم کے اس موقف کی کتابی تصدیق کرنی چاہے تو کسی بھی بڑی زبان کی ڈکشنری یا قاموس اٹھا کر اس کا مقدمہ دیکھ لے۔ بڑی زبان کے لغت نویس، مثال کے طور پر بڑی آکسفرڈ ڈکشنری کے مرتبین بھی.... آخر میں بہت سی ضرورتوں اور تشنگی کا اقرار کرتے ہیں۔

جیسا کہ پچھلے صفحات پر عرض کیا گیا آج کوئی بڑی سے بڑی زبان بھی "کامل" نہیں۔ پھر بھی ان قوموں کے سرکاری دفاتر میں ان کی قومی زبانیں ہی رائج ہیں۔ کاملیت دراصل کوئی تصور نہیں۔ نئے تقاضوں سے ہم آہنگی البتہ نئے نئے الفاظ کی تشکیل، نئی اصطلاحات سازی، نئے اظہاری پیرائے مانگتی ہے سو وہ جاری ہیں اس عمل میں بعض مشکلات پیدا ہوتی رہتی ہیں مگر کام سب خوب چلا رہے ہیں۔

برسبیل تذکرہ، انگریزی کب سے انگلستان میں رائج ہے؟ بہت پوچھ گچھ (اور مطالعہ کرنے) کے بعد راقم اس دعوے کا اعادہ کرتا ہے کہ انگلستان میں انگریزی کو بطور زبان دفتری رائج کرنے کے لیے کوئی بورڈ نہیں بنا تھا.... ضرورت کے ساتھ ساتھ لاطینی، یونانی یہاں تک کہ فرنچ اور جرمن سے بھی الفاظ آتے گئے کبھی "انگریزیا" کر امیز ہوئے۔ کبھی اپنی اصلی شکل میں مستعمل ہو گئے.... اب بھی سائنس کے ہر لمحہ نئے اظہاری تقاضے "جدید" اصطلاحات کو آسمان سے تو نہیں اُتارتے۔ کبھی کسی زبان سے استفادہ کبھی کسی زبان سے آمیزش، کبھی اپنے ہی نئے مرکبات.... اکثر کو اول اول غریب لگتے ہیں پھر رائج ہو جاتے ہیں (ہر شہری کو ہر رکن مقتدرہ کو ہر شعبے کی تمام اصطلاحات سے بھرپور واقفیت کی ضرورت بھی نہیں پڑتی) خود انہی اصطلاحاتِ بینکاری کی انگریزی اصطلاحات ملاحظہ کر لیجیے۔ نعوذ باللہ الماعی

نہیں۔ دو سو برس پہلے کی انگریزی میں بیشتر کے معانی وہ نہیں تھے جو آج مستعمل ہیں۔ کچھ لاطینی سے، کچھ یونانی سے، کچھ لفظ جوڑ لیے ہیں... رواج اور نفاذ کے عمل نے انھیں مستند اصطلاحی حیثیت دے دی ہے۔

وفاق پاکستان کے دفاتر میں نفاذ اردو کو کیوں اور کس طرح ٹالا جاتا رہا ہے۔ اس موضوع پر بہت سے مشاہیر و ماہرین کے بیانات، خطبات اور جائزے عام ہیں لیکن راقم اس باب کو اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی مدد سے رقم کرنے کی جرات کرے گا جس میں کوئی واقعاتی غلطی نہیں ہے۔ راقم الحروف قیام پاکستان سے ایک دن پہلے پاکستان پہنچا تھا۔ وہ اپنی کشمکش روزگار یا جہدِ بقا میں بھی مبتلا رہا لیکن کچھ شعوری اور کچھ غیر شعوری طور پر اس نے اپنی بساط بھر اس مسئلے سے متعلق تمام حالات کا مطالعہ و مشاہدہ کیا جو یادوں کے خانے میں خاصا محفوظ ہے۔ 1959ء سے 1961ء تک انجمن ترقی اردو پاکستان میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی زیرِ صدارت ایک مختصر سی سرکاری منتظمہ کا غیر سرکاری رکن بھی رہا جب ہم انجمن کا نیا دستور بنا رہے تھے اور 1962ء سے تادمِ تحریر انجمن کا معتمد اعزازی ہے۔ کبھی اس عہدے کے لحاظ سے، کچھ ذاتی حیثیت میں، ان تینوں سرکاری اداروں سے کسی کسی ہیئات میں بطور رکن منتظمہ بھی متعلق رہا جو مختلف اوقات میں مختلف وفاقی حکومتوں نے عوامی، سیاسی اور دستورِ پاکستان کے دباؤ میں قومی زبان کو سرکاری زبان بنانے کے نام پر قائم کیے اور آج بھی قائم ہیں۔

اردو بورڈ

(اب اردو سائنس بورڈ) لاہور

اردو لغت بورڈ، کراچی

مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

(اس کے علاوہ اسے مختلف اداروں میں وفاقی حکومت کی بہت سی ان مجلسوں میں شرکت کا موقع بھی ملتا رہا جو مسئلہ نفاذ پر غور کرنے کے لیے منعقد کی گئیں۔ ان میں 1970ء کی مرکزی کانفرنس جو ڈاکٹر آئی۔ ایچ عثمانی کی صدارت میں وزارت تعلیم نے بلائی تھی اہم ترین ہے)۔

راقم نے سب کی طرح یہ بھی دیکھا ہے کہ سب سے بڑے صوبے پنجاب کی سیاسی حکومتوں نے ہمیشہ نظری طور پر پوری سچائی کے ساتھ نفاذ اردو کی حمایت کی۔ وہاں انتظامیہ اور عدلیہ کی نچلی اور کئی دوسری سطحوں پر اردو قیام پاکستان سے پہلے ہی رائج ہو چکی تھی اور قیام پاکستان کے بعد سے ان سطحوں پر اس کا استعمال پھیلتا ہی گیا ہے۔ یہی صورتِ حال صوبہ جات سرحد و بلوچستان کی رہی اور ہے۔ سندھ میں جب سے لسانی فسادات کے بعد لسانی تنازعہ (1972ء) طے ہوا کئی انتظامی سطحوں پر سندھی کے ساتھ اردو رائج ہے۔ بہرحال اب اردو سندھی کا کوئی تنازعہ نہیں۔ مدارس میں بھی سندھی ایک زبان کے طور پر لازمی قرار دی جا چکی ہے اور سب کو قبول ہے۔

اس سال حکومت پنجاب کے وزیر اعلیٰ جناب غلام حیدر وائن کی ذاتی دلچسپی کے سبب ایک مجلسِ نفاذ بھی تشکیل دی گئی ہے جس میں موقر شخصیات، فضلا اور ادیب شامل ہیں۔ انھیں پنجاب کابینہ کی قرارداد کے مطابق یہ فرض سونپا گیا ہے کہ جلد سے جلد اردو کو تمام سرکاری سطحوں پر نافذ کرنے کی قابلِ عمل سفارشات پیش کرتے ہوئے صوبائی سکریٹریٹ میں باضابطہ نفاذ کے لیے جو تیاریاں باقی رہ گئی ہوں، پوری کرا دیں۔ ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق وزیر اعلیٰ اور کابینہ کو کم از کم تیس فیصد روداد یں (SUMMARIES) اردو میں بھیجنی پڑتی ہیں۔

اس تمام تناظر میں، وفاق کی سطح پر اس ضمن میں ایک حیرت انگیز اور ساتھ ہی بدیہی سست روی کا کسی قدر تجزیاتی اختصاریہ پیش ہے۔

ابتدائے پاکستان میں وفاقی حکومت کے آدھے سے زیادہ سکریٹری اور کئی جوائنٹ سکریٹری انگریز تھے۔ ایڈیشنل سکریٹری یوں بھی بہت کم ہوتے تھے۔ جوائنٹ سکریٹری ہی بڑی چیز سمجھا جاتا تھا (راقم پاکستان سیکریٹریٹ، وزارت تجارت میں 1947ء سے 1951ء تک اسسٹنٹ رہ چکا ہے) پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے بیشتر سینئر افسران بھی انڈین سِول سروس کے اراکین تھے جنھوں نے (اضلاعِ پنجاب و سرحد چھوڑ کر) کبھی اردو میں سرکاری کام ہی نہیں کیا تھا۔ (کچھ افسران جو حکومت عثمانیہ حیدرآباد دکن سے آئے تھے، البتہ تمام کام اردو میں کر سکتے تھے۔ کیوں کہ وہاں اردو ہی سرکاری زبان تھی لیکن چوں کہ "حیدرآباد سول

سروس" سے تعلق رکھتے تھے جو ایک اعلیٰ صوبائی سروس سے کچھ بہتر ہی تھی اس لیے انگریزی میں بھی خوب دست گاہ رکھتے تھے اور حکومت پاکستان کے ایک ہنگامی دستے (جنرل آفیسرز پُول G۔O۔P میں خوب کھپ گئے تھے۔ دیگر عمال بھی اردو میں سرکاری کام کرنے کی تربیت اور تجربے سے محروم تھے کیوں کہ اردو پسندی کے باجود حکومت ہندوستان یا گورنمنٹ آف انڈیا سے آئے تھے اور صرف انگریزی میں (گویا نہ پوچھیے کیسی انگریزی میں) نوٹنگ، ڈرافٹنگ اور کارسپانڈنس (یادداشت نویسی، مسّودہ سازی، خط و کتابت وغیرہ) کرتے تھے اور جو نئے بھرتی ہوتے انھیں بھی یہی رواں وراثت ملی۔ ساتھ ساتھ ہی ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ پاکستان سے تعلق رکھنے والے سرکاری ملازمین بھی (گو وہ تعداد میں بہت ہی کم تھے) اردو بولتے پڑھتے لکھتے تھے مگر نہ صرف دوسرے، مذکورہ بالاعمال حکومت کی طرح، اردو میں سرکاری کام نہیں کرسکتے تھے، بلکہ ان اُبھرنے یا اُبھاری جانے والی نئی سیاسی وجوہ سے (جن کی ایک پوری تاریخ ہے) زبان سے اظہارِ مخالفت نہ سہی دل سے اردو کے بارے میں تحفظات کے ساتھ سوچتے تھے۔ ان کو یہ ڈر تھا کہ اگر اردو مشرقی پاکستان میں نافذ نہ ہوئی اور ان کا تبادلہ وہاں ہوا تو وہ وہاں بڑی عملی مشکلات سے دوچار ہوں گے اور مشرقی پاکستان کے بعض عناصر نے جو دراصل تحریک پاکستان کے حق میں ہی نہیں تھے۔ پاکستان بنتے ہی ایک لسانی شورش شروع کرادی تھی ..... وہ بنگلہ کو عربی حروف میں لکھے جانے کی روایت کے بھی خلاف تھے (جب کہ پوتھی ادب یعنی مسلمانوں کا عربی حروف میں لکھا ہوا بنگلہ ادب مدتوں سے بڑی مقدار میں موجود تھا)۔ اپنے دوستوں کے یہ خیالات راقم کو ذاتی تعلقات کے سبب معلوم ہوتے رہتے تھے۔ وہ اردو مخالف نہیں تھے۔ مشرقی پاکستان کے سیاسی عناصر اور مبہم مستقبل سے ڈرتے تھے.....

اس موضوع کے بہت سے پہلوؤں پر بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کا شائع کردہ کتابچہ "اردو کا المیہ" موجود ہے۔ جو ان کی، ان کی زیر قیادت بہت سے اکابر اور دوسرے طرف دارانِ اردو کی کوششیں اور ان کی راہ میں پے در پے مشکلات بیان کرتا ہے۔ راقم اس وقت انھیں دُہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا..... لیکن

نہایت ادب کے ساتھ یہ تاثر ضرور ریکارڈ پر لائے گا کہ یا تو بابائے اردو اور ان کے ساتھی ماضی میں رہنی تصورت (آئیڈیالوجی) محنت، قربانی اور سچائی کے سبب مشرقی پاکستان کے ابھرتے ہوئے نئے سیاسی انتشار میں معروضی حالات سے پوری طرح واقف نہیں تھے یا بنگلہ جیسی پرانی اور عوامی زبان کو قرار واقعی اہمیت نہ دینے کی غلطی کے بھی مرتکب ہو رہے تھے۔ شاید یہ بہتر ہوتا کہ وہ مشرقی پاکستان کے مخصوص سیاسی حالات کے پیشِ نظر اور خود بنگلہ کی پوری توقیر ثابت کرتے ہوئے مشرقی پاکستان کے صوبائی دفاتر کے لیے اردو بنگلہ دونوں زبانوں کے نفاذ کی تائید کرتے ..... لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ماضی کے متعلق "پیش گوئی" کرنا آسان ہوتا ہے۔ جب وہ وقت گزر رہا ہو اس کی پیچیدگیوں سے نبرد آزما ہوتے وقت کون کیا کر سکتا تھا کیا نہیں کر سکتا تھا اور مجموعی حالات کے پیشِ نظر کیا ہونا چاہیے تھا یہ صرف مشاہدین نہیں بلکہ اسی دور کے مجاہدین و کارکنان ہی بہتر جانتے ہیں جن میں بد قسمتی سے راقم شامل نہیں ہو سکا کہ تقسیم ہند کے چند در چند تاثرات میں مبتلا، ایک بڑے خاندان اور رشتہ دار مہاجرین کا بوجھ سنبھالے معمولی سی سرکاری نوکری کرتے ہوئے جہد بقا میں مصروف محض ایک شاعر اور معمولی سا نریڈیو نینٹ نوجوان تھا (اور سچ کہ آج بھی اس روز بروز عجیب و غریب طور پر پیچیدہ، خاصی حد تک صوبائیت زدہ معاشرے، بطور خاص ایک مغرب زدہ سرکاری ماحول میں ایک معمولی کارکنِ ادب کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتا!)

1948ء میں بیماری اور بڑی سخت صعوبت کے باوجود قائداعظم کا مشرقی پاکستان جانا اور ڈھاکہ میں ایک بڑے اجتماع کے سامنے وہ مشہور تقریر فرمانا (21 مارچ 1948ء) ایک بڑا تاریخی واقعہ ہے۔ جس میں انھوں نے واشگاف اعلان کیا تھا:

> "میں آپ کو صاف طور پر بتا دوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور کوئی دوسری سرکاری زبان نہیں ..... جو کوئی آپ کو غلط راستے پر ڈالے وہ در حقیقت پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک سرکاری زبان کے بغیر نہ تو کوئی قوم مضبوط بنیادوں پر متحد و یکجا رہ

سکتی ہے اور نہ ہی بہ حیثیت قوم اپنا کردار ادا کر سکتی ہے۔
دوسرے ملکوں کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔ پس جہاں تک سرکاری زبان کا تعلق ہے پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی۔"

قائداعظم کے اس اعلان سے ان کے ناقابلِ شکست اقدام، کے سبب وقتی طور پر وہ اٹھتا ہوا طوفان تھم گیا۔ لیکن چوں کہ قیامِ پاکستان اور اردو کے خلاف قیامِ پاکستان سے پہلے ہی جو عناصر موجود تھے (جن میں تخریب کار بیرونی عناصر برابر بالواسطہ اور راست طور پر شامل تھے) ان کے رویّوں میں کیسے تبدیلی آ سکتی تھی؟ وہ برابر ڈھکے چھپے طور پر سرگرم رہے۔ دراصل سارا مسئلہ زبان کا نہیں سیاسی تھا سیاسی رہا اور اختلافِ زبان کو کبھی علمی انداز میں کبھی معاشرتی حوالوں سے اور جب جب موقع ملا ایک آگ بھڑکاتے رہنے والے عامل کے طور پر استعمال کیا گیا۔ چوں کہ بنگلہ دیش بن چکا ہے اور اب جنوبی ایشیا میں ایک قابلِ احترام حیثیت کا حامل اور ہمارا ایک محترم دوست ہے اس لیے زیرِ تحریر باب میں راقم اس کی باقی کہانی سنانی ضروری نہیں سمجھتا جس پر مختلف تحقیقی اور تجزیاتی کتابیں۔۔۔ دراصل ہماری شکست کی آوازیں۔۔۔ تاریخ کے ریکارڈ پر آ چکی ہیں۔

اتنا ضرور ریکارڈ پر لایا جائے گا کہ 1959ء جیسے زمانے سے کئی برس آگے تک بھی عام حلقوں میں تو اردو کے خلاف کوئی جذبہ تھا ہی نہیں۔ وہ اساتذہ، دانشور، ادیب جو سیاست میں اختلافی نقطۂ نظر کے سبب مغربی پاکستان یا وفاقی حکومت کے خفیہ شعبوں میں اینٹی پاکستان قرار دیے جاتے تھے قطعی طور پر "اردو بہ حیثیت ایک قومی زبان" کے خلاف نہیں تھے۔ ان کے طلبا کئی جانیں دے کر ایک غم انگیز قربانی دے چکے تھے۔ بنگلہ کی "مطلوبہ" اہمیت تسلیم کرائی جا چکی تھی۔ بنگلہ سیاست داں ہمارے پہلے دستور (1956ء) میں اس شق کو، بعض افسوسناک تحریکات سے منوا کر ہی سہی، دل سے قبول کر چکے تھے جس کی رو سے اردو۔ بنگلہ دو قومی زبانیں تسلیم کر لی گئی تھیں۔ راقم نے پاکستان رائٹرز گلڈ میں تقریباً سبھی مشاہیر بنگلہ ادیبوں کے رکنیت حاصل کرنے، صوبائی منتظمہ کے انتخابات میں امیدوار اور رائے دہندہ

ہونے کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ اپنے حقوق ضرور طلب کرتے تھے اردو کے خلاف کسی تحریر، کسی مہم، کسی فساد کے حامی نہ تھے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کنونشن کراچی (29 جنوری تا 31 جنوری 1959ء) میں بنگلہ زبان کے شرکاء کی فہرست (بعض تصاویر کے ساتھ) گلڈ کے ترجمان "ہم قلم" کی پہلی سالگرہ (1961ء) کی اشاعت میں بھی چھپی ہوئی ہے اور ان کے دستخط اس حاضری رجسٹر میں موجود ہیں جو گلڈ کے مرکزی دفتر (فی الوقت واقع لاہور) میں محفوظ ہے۔ زیادہ اخراجات کی استطاعت نہ ہونے کے سبب ہم آٹھ ابتدائی داعیانِ اجلاس بنگلہ ادیبوں کی کافی تعداد کو مدعو نہیں کر سکے تھے (ریل کا سفر ممکن نہ تھا اور نازک مزاج ادیب اتنے طویل سفر کے متحمل بھی کیوں ہوتے مغربی پاکستان سے پشاور، لاہور وغیرہ سے ٹرین کے ذریعے ضرور آ گئے تھے) لیکن جو آئے ان میں بابائے بنگلہ ڈاکٹر محمد شہید اللہ، کوی جسیم الدین، کوی غلام مصطفےٰ، بیگم شمس النہار، بیگم صوفیہ کمال جیسے معتدل مزاج سینئر مشاہیر سے لے کر بڑے بڑے آتش مزاج، انقلابی نوجوان ادیب وشاعر، نقاد آئے تھے اور انھوں نے پورے کنونشن (سہ روزہ)، میں، جہاں بعض دوسرے مسائل پر اتفاق رائے سے پہلے مباحث میں سخت نزاع بلکہ انتشار تک پیدا ہو جاتا تھا اردو کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ پھر راقم 1970ء تک گلڈ کے مرکزی دفتر سے مرکزی افسر رابطہ، مرکزی معتمدِ اعزازی اور سکریٹری جنرل کی حیثیتوں میں متعلق رہا۔ تقریباً تمام بنگلہ ادیبوں نے گلڈ کی رکنیت اختیار کر لی تھی (ریکارڈ موجود ہے) مرکزی منتظمہ کے انتخابات، میقات بعد میقات مرکزی مجلس منتظمہ، صوبائی مجالس منتظمہ، سالانہ دو سالہ اجلاس عام، دیگر ثقافتی تقریبات .... تمام اجتماعات میں کہیں بھی اردو بنگلہ کا ٹکراؤ پیدا نہیں ہوا کیوں کہ معاملہ اہلِ دل ادیبوں کے درمیان ہوتا تھا۔ ان میں بعض عناصر کمیونسٹ پارٹی کے کارڈ ہولڈر بھی کہلاتے تھے مثلاً شہید اللہ قیصر (ابتداً علاء الدین آزاد بھی) جن پر تخریب کاری کے ناجائز شبہات ظاہر کیے جاتے تھے۔ مگر راقم نے ان سے خاصے گہرے روز مرہ معاملاتی روابط میں بھی اردو کے خلاف کوئی جذبہ محسوس نہیں کیا۔ ہاں وہ سیاسی، اقتصادی، فوجی حوالوں سے ہم مغربی پاکستانیوں کے خلاف شکایات رکھتے تھے، جن کے ارتقا اور نتائج کی داستان الگ ہے۔ ہماری کئی کمیٹیوں کی

سفارشات میں جو شائع ہوتی رہی ہیں جن کا کنونیر کبھی راقم اور کبھی منیر چودھری مرحوم جیسا ایک وقت کا "باغی" مگر حقیقتاً وطن پرست ادیب، استاد، ڈرامہ نویس ہوتا تھا (1971ء کے المیے میں اس طرح کام آیا کہ آج تک اس کے قتل کا راز نہیں کھلتا) جذبہ تعاون میں وہ یہاں تک آ گئے تھے کہ بنگلہ کو صرف مشرقی پاکستان کی سرکاری اور اردو کو مغربی پاکستان اور وفاق کی سرکاری زبان کے طور پر نافذ کر دیا جائے (یہ سب گلڈ کے رجسٹروں میں محفوظ ہے) اس طرح کہ ایک مدت کے بعد ضروری تدریجی انتظامات کے ذریعے وفاق کے کام دونوں زبانوں میں بھی ممکن ہو سکیں۔ بنگلہ عوام سے تو روزمرّہ بول چال میں رابطہ دو صدیوں سے اردو کے ذریعے ہی تھا لہجے اور تلفظ کے طبعی اختلافات کے ساتھ جو ہر اس زبان کی حقیقت (اور ضرورت) ہیں جو مختلف جغرافیائی خِطّوں پر پھیلی ہوئی ہو (جیسے خود انگریزی کہ اس کا تلفظ اور لہجہ پاک۔ ہند۔ ویسٹ انڈیز۔ آسٹریلیا۔ نیوزی لینڈ یہاں تک کہ پورے شمالی امریکہ میں بھی آکسفرڈ، کیمرج .... کنگز انگلش یا کوئنز انگلش جیسا نہیں، بلکہ بہت بڑی حد تک مختلف ہے)

بہرحال وہ کہانی باقی تاریخ سے ایک علیحدہ گو راقم الحروف کے لیے اب بھی ایک دردناک باب ہے۔ باقی گفتگو اب مغربی پاکستان یعنی موجودہ پاکستان کے حوالے سے کی جائے گی۔ لیکن یاد رہے کہ 1956ء کا دستور آتے آتے جس میں اردو بنگلہ قومی زبانوں کے طور پر تسلیم کی گئی تھیں۔ انگریزی کے طرفدار عناصر نے دفاتر میں قومی زبان کے خلا کو وسیع تر اور خاصا ناقابلِ تقسیم بنا دیا تھا۔

اس موقع پر ایک بڑے عنصر یا عامل کو روشناس کرا دیا جائے جو پاکستان میں نفاذ اردو کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا اور جو نسل بعد نسل خواہ نادانستہ طور پر ہی سہی اعلیٰ درجے کے عمال حکومت کو اردو بطور سرکاری زبان قبول نہیں کرنے دیتا.... تقسیم کے وقت تو سرکاری کاروبار صرف انگریزی میں سرانجام دینے والے آئے ہی تھے، آزادی کے بعد 1949ء سے اعلیٰ وفاقی ملازمتوں (سینٹرل سپیریر سروسز) کے لیے مقابلے کے امتحان رائج ہوتے تو اظہار کی زبان۔ قومی زبان کے بجائے انگریزی رکھی گئی۔ بابائے اردو اور ان کے ساتھیوں نے اس وقت بھی آواز

بلند کی تھی کہ اظہار کو کم از کم اختیاری OPTIONAL کر دیا جائے۔ چونکہ اس امتحان کے مضامین میں سائنس کے پرچے بھی شامل تھے اور خیال یہ تھا (جو آج بھی گو غلط طور پر جاری ہے) کہ اردو میں معاشی اور سائنسی اصطلاحات موجود نہیں اس لیے نفاذ قومی زبان کے حامی اس امر پر تیار تھے کہ جو طلبا پرچے انگریزی میں حل کرنا چاہیں۔ انھیں اس کی اجازت ہو۔ (گو بہتر طریقہ یہ بتایا جاتا تھا کہ اصطلاحات بے شک انگریزی کی استعمال کریں، لیکن اظہار اردو یا بنگلہ میں ہو جو یقیناً ادائے مطالب کا بہترین ذریعہ تھا، ہو سکتا تھا اور ہے) بہرحال چونکہ قائداعظم انتقال کر چکے تھے، بنگلہ اردو، اردو سندھی (گو ایک مفروضہ) "آویزش" کو ہوا دی جا رہی تھی۔ صوبائیت زدگی، انصاف طلبی کے نام پر سر اٹھا رہی تھی (اور یہ کہ انصاف ہو بھی نہیں رہا تھا) اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایسی پالیسی ساری انھی آئی۔ سی۔ ایس افسران کے رحم و کرم پر تھی (گو نام کابینہ کا بھی لیا جا سکتا ہے) اس لیے ان امتحانوں میں ذریعہ اظہار انگریزی قرار پایا۔

اتفاق کہ راقم الحروف بھی اس مقابلے کے امتحان (1951ء) میں کامیاب ہو جانے والا ایک امیدوار ہے اس لیے ایک جھلک ذاتی تجربے کی پیش کر سکتا ہے۔ اس نے اختیاری مضامین میں سے ایک مضمون "اردو" لیا تھا۔ اس پرچے میں پورے بیس نمبر کا سوال (دو سو نمبر میں سے) دو اشعار کی نہایت آسان تقطیع پر آیا۔ جس کے بعد ان بحروں پر مختصر نوٹ بھی لکھنے تھے۔ امیدوار کی اہلیت فکر و اظہار جانچنے کے لیے مقالے کا ایک پرچہ جو لازمی تھا، معلومات عامہ کا ایک پرچہ جو لازمی تھا اور دوسرے تین پرچے کافی تھے۔ اردو کا پرچہ انگریزی میں حل کرنا اور اس میں بھی عربی بحور پر انگریزی میں "نوٹ" لکھنا دورِ غلامی کی کیسی ظالمانہ وراثت تھی (اور ہے) اس موضوع پر مختصر "نوٹ" میں کیا لکھا جا سکتا ہے اور کیا نہیں۔ یہ اپنے اپنے نقطۂ نظر کا مسئلہ ہے تقطیع تو ملوا تھی مگر راقم کو اس آزمائش میں لبنی نام نہاد کامیابی کے باوجود آج پورے چالیس برس بعد بھی یہ ایک سراسر غیر منطقی امر لگتا ہے کہ محض انگریزی میں اظہار سے امیدوار کی مضمون متعلقہ سے معقول واقفیت ثابت ہو سکتی ہوگی۔ آپ امیدوار کا یہ امتحان لے رہے ہیں کہ وہ آپ کے مطلوبہ معیار کے مطابق

اردو زبان و ادب سے واقف ہے یا نہیں۔ آپ یہ امتحان نہیں لے رہے کہ وہ انگریزی میں کیسا ادائے مطالب کرتا ہے۔ (جیسا کہ عرض کیا۔ اس امتحان کے لیے دوسرے لازمی پرچے موجود ہیں) افسوس کہ یہ سلسلہ جاری رہا (شاید آج بھی جاری ہے گو اس پر برابر احتجاج ہو رہا ہے)

کامیاب امیدواروں کو تربیت بھی انگریزی میں ہی دی گئی اور تربیت کے بعد جب انھیں ذریعۂ اظہار انگریزی ہی رکھنا پڑا تو ان کا مفاد پیوستہ انگریزی سے وابستہ ہو گیا اور یہی صورتِ حال آج بھی ہے۔۔۔ یہ بھی نہیں ہوا کہ جب وہ افسر بن جانے کے بعد مختلف مدارج طے کرنے کی شرائط کے تحت مزید تربیت کے لیے بھیجے جاتے تھے ان پر آہستہ آہستہ سہی اردو میں کام کرنے کی مشق بھی لازم کر دی جاتی۔۔۔ ان کے لیے جو اہم مقامی تربیت گاہیں بنائی اور مقرر کی گئیں۔ مختلف اکادمیاں، نیپا، ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج، نیشنل ڈیفنس کالج (جہاں بعض سویلین بھی جاتے ہیں) کسی میں بھی سرکاری سطح پر اردو اظہار کی یعنی نفاذ اردو کے کسی آئندہ امکان کے لیے تیاری کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی) جب کہ ہر دستور 1956ء، 1962ء، 1973ء (اور اس کی ترمیم شدہ موجودہ شکل) میں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ وفاقی دفاتر میں نفاذ اردو کی شق برقرار رکھی گئی ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ اردو کو اس مقصد کے لیے "اگلے" دس برس کے اندر اندر "تیار" کر دیا جائے گا۔۔۔۔۔ مشکل یہ ہے کہ کسی دستور میں ایسی شقوں کی خلاف ورزی پر قانونی چارہ جوئی کی گنجائش نہیں رکھی جاتی، بلکہ صراحتاً ہٹا دی جاتی ہے۔ جب کہ بہت سی شقوں کی خلاف ورزی پر کوئی بھی شہری حکومت کو عدالت کے کٹہرے میں کھینچ سکتا ہے (بشرطیکہ ہنگامی صورت حال یا مارشل لاء کے ضوابط حارج نہ ہوں) اس دس برس والی شق میں مزید دس برس کی توسیع بھی کر دی جاتی ہے۔ کبھی دستوری ترمیم کے ذریعے (عموماً مارشل لاء ضابطے کے بل پر) کبھی کسی انتظامی دائویچ کے ذریعے بھی۔

راقم نے بیوروکریسی، نوکر شاہی، اعلیٰ عمال حکومت (جس نام سے بھی یاد کیجیے) ان کے بعض رویوں کے خلاف برسوں اپنے اخباری اظہاریوں میں خاصے سخت موقف ہی اختیار نہیں کیے بلکہ بعض اوقات ایسے اندازِ اظہار اور الفاظ استعمال کر گیا جو

نہ کرتا تو اچھا تھا۔ مگر غالباً ٹینگ آکر کرتا تھا گو 1966ء تک یعنی پورے پندرہ برس انہی میں سے ایک تھا اور بعد میں بینکاری سے متعلق ہو کر بھی ایک سرکاری تجارتی بینک (نیشنل بینک آف پاکستان) میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے سبب ایک طرح انہی میں شمار ہوتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اردو نفاذ کی مخالفت میں جس کے حوالے سے بھی راقم نے ان کے خلاف بہت کچھ لکھا، بعض کے شعوری، بعض کے لاشعوری رویے اور مفادِ پیوستہ کا بھی بڑا دخل ہے جو انہیں ایک تسلسل کے ساتھ وراثت بعد آزادی میں ملا ہے۔ راقم کی یہی تحریر دیکھ لیجیے کہ گو کوئی ادب پارہ تخلیق کرنا مقصود نہ تھا مگر یہ کسی خوبصورت، معیاری، اظہار کی معمولی سی مثال بھی نہیں (نہ بے شمار دوسری یک نشستی تحریریں ہیں) اس میں شاید راقم کی کوئی بنیادی نا اہلی بھی ہوگی (جس کا کھوج راقم اس وقت لگا کر نشان دہی نہیں کر سکتا) لیکن سب سے بڑی وجہ یہ کہ راقم کو دورانِ ملازمت (عرصہ چالیس سال) تمام معاملاتی اظہار انگریزی زبان میں ہی کرنا پڑا ہے۔ جو حکومت اور شعبۂ بینکاری کی سرکاری زبان ہے۔ اردو میں کاروباری اظہار کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ راقم تو اردو ادب کے مطالعے کو ایک نسبتاً زیادہ وقت دینے کا شوقین اور بزعم خود ایک اردو ادیب بھی ہے۔ سب اعلیٰ افسران، سب سرکاری ملازمین نہ تو اردو ادب کے گہرے مطالعے کے پابند یا جُز وقتی ہی سہی اردو ادیب نہیں ہوتے۔ انگریزی میں پڑھنا، امتحان دینا، تربیت پانا، دن میں کم از کم آٹھ گھنٹے مسلسل انگریزی پڑھنا لکھنا، انگریزی میں بولنا، قومی زبان کی طرف سے فکری ساختیات کا رُخ بھی بری طرح موڑ دیتا ہے۔ وفاق میں اعلیٰ افسران بلکہ تمام سرکاری ملازمین کے اوقاتِ کار پر مسلسل معاملاتی اظہار کا جبر رہتا ہے۔ ایک دن میں بیسیوں مسلوں پر تقریباً فوری طور سے یادداشت لکھنی پڑتی ہے (نوٹنگ) مسودے، خلاصے (ڈرافٹ، سمری) تیار کرنے پڑتے ہیں (بعض عموماً افسران بالا کی ترمیمات کے بعد دوبارہ، سہ بارہ تیار ہوتے ہیں جن میں نکات متن کے علاوہ اظہار کو بھی بہتر سے بہتر شکل دینی پڑتی ہے ...) بعض انگریزی اظہار میں نہایت عمدہ دست گاہ بہم پہنچا لیتے ہیں۔ میں نے پانچویں دہائی کے ایک بڑے انگریزی پرست اور بہترین انگریزی لکھنے کی شہرت رکھنے والے پاکستانی افسر جناب جی۔ احمد مرحوم

(معتمد وزارتِ داخلہ) کے انگریزی اظہار کی تعریف وزارتِ تجارت کے برطانوی معتمد جناب (بعد میں سر) الیگزینڈر میک فار کرے سنی کیوں کہ راقم اس وقت وہاں بطور اسسٹنٹ کام کرتا تھا۔ (اس وقت جی۔ احمد صاحب ڈائریکٹر انٹے لیجینس بیورو کے عہدے سے ترقی پا کر معتمد وزارتِ داخلہ ہوئے تھے) جب کہ وہ آئی۔ سی۔ ایس بھی نہیں بلکہ آئی۔ پی۔ ایس یعنی انڈین پولیس سروس میں بھرتی ہوئے تھے اور میں اسی سروس کے ایک رکن اپنے بڑے بھائی نواب زادہ مرزا اعتزاز الدین مرحوم کے تعلق سے کبھی کبھی ان سے مل لیتا تھا۔ خود ان جی۔ احمد صاحب سے میں نے ایک بار پوچھا کہ آپ کی نسبت متوسط درجے کے عہدوں پر فائز افسروں یعنی ڈپٹی سکریٹری تا جوائنٹ سکریٹری حضرات میں آپ کے بعد سب سے بہتر انگریزی کون لکھتا ہے۔ تو انھوں نے کہا آئی۔ سی۔ ایس کے جونیئرز میں قدرت اللہ شہاب (جو اس وقت ڈپٹی سکریٹری وزارتِ اطلاعات) تھے۔ اور غیر آئی۔ سی۔ ایس میں تین (جن میں سے دو جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے اردو ذریعہ تعلیم کی پیداوار تھے)۔ میرے معاصرین میں بھی یعنی پاکستان بننے سے ذرا قبل اور پاکستان میں بھرتی ہونے والے افسران میں موجودہ صدرِ انجمن جناب نورالحسن جعفری، جناب مختار مسعود، جناب آفتاب احمد خان، جناب ایف۔ آر۔ خاں سمیت بہت سے اعلیٰ افسران کا انگریزی اظہار معروف رہا ہے اور بعض تو پاکستان سکریٹریٹ میں مثالی انگریزی لکھنے والے افسران کہلاتے رہے ہیں جب کہ عام بول چال میں (آفتاب احمد خاں سی۔ ایس۔ پی) ان کی اردو بھی کم جاذبِ توجہ نہیں رہی۔۔۔ محولہ بالا افراد میں مختار مسعود تو نہایت ہی سجی سجائی خوبصورت، فکر انگیز اردو لکھنے میں اپنی اردو کتابوں کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں (گو راقم کو ان کی کھلی مدّاحی کے باوجود ان کے بعض حالیہ تعصبات و معاملات سے خاصا اختلاف پیدا ہو چکا ہے) ڈاکٹر آفتاب احمد خان صاحبِ تصنیف بھی ہیں اسی زمرے میں آتے ہیں۔

بہر حال، محولہ بالا محترمین کی تعلیم تو انگریزی میڈیم میں ہوئی (بالترتیب جامعہ الہ آباد، جامعہ علی گڑھ اور جامعہ پنجاب) لیکن حیدر آباد سول سروس (ایچ۔ سی۔ ایس) کے جو حضرات جامعہ عثمانیہ سے ذریعہ تعلیم اردو اور انگریزی صرف ایک اختیاری

مضمون کے طور پر لے کر کامیاب ہوئے تھے (حکومتِ پاکستان کے ابتدائی دور میں ان کی تعداد خاصی تھی) ان میں سے بیشتر وفاقی ملازمت میں انگریزی کے عادی ہو کر کچھ ہی مدت میں ایسے ہو گئے کہ سماجی بات چیت میں بھی انگریزی الفاظ اور انگریزی ساخت کے قیدی نظر آتے تھے۔(ان کے اسمائے گرامی دانستہ طور پر درج نہیں کیے جا رہے کیوں کہ ان کی یا ان کے بچوں کی دل آزاری کا امکان ہے)

پی۔ سی۔ ایس یعنی پراونشل سول سروس کے لیے مقابلے کے امتحان بھی انگریزی میں لیے گئے (اور لیے جاتے ہیں) ان میں سے افسران کی ایک تعداد بھی ترقی پا کر یا کوٹہ طلسمات کے تحت وفاقی ذمہ داریاں سنبھالنے چلی جاتی ہے اور اسی مفادِ پیوستہ کے سائے میں پلتی ہے۔

اس تناظر میں ہی اس طبقے کا جو حقیقت میں پاکستان کا مستقل اور حقیقی حاکم ہے اردو نفاذ سے خوف کھانا قومی نقطۂ نظر سے درست نہ ہو خاصی حد تک سمجھ میں آجاتا ہے۔ کاش وہ وسیع تر قومی مفاد کے پیشِ نظر خود کو نفاذ اردو کے لیے تیار کرتے رہیں اور نفاذ میں مدد کریں۔ کوئی اپنی جائیداد، اپنے اثاثے، اپنے کمال کو ترک کر دینے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتا.... وفاق میں اردو نفاذ کی کبھی خاموش، کبھی بالجبر، اور مسلسل مخالفت یا اس کی منت پذیری نشانہ کا فسانہ اس مفادِ پیوستہ کا ایک شاخسانہ بھی ہے۔(راقم امید کرتا ہے کہ محبانِ اردو اس تجزیے کو افسر شاہی کے حق میں ایک معذرتیہ قرار دیتے ہوئے راقم کو ان کا ایجنٹ نہیں سمجھ لیں گے۔راقم کا یہ تجزیہ نفاذ اردو کی ناگزیریت کو کسی طرح کم نہیں کرتا۔)

ساتھ ہی دوسری جنگِ عظیم کے بعد انگریزی کا دنیا بھر میں پھیلاؤ، انگریزی بولنے والے امریکہ جیسے بڑے ملک کا عالمی معاملات پر غالب ہوتا ہوا کردار، سائنس، طب اور معاشیات جیسے علوم میں نئے نئے انکشافات، ایجادات، اصطلاحات کی نمو..... انگریزی کا بہترین علمی ادبی اظہاری خزانوں سے مسلسل مالا مال ہوتے رہنا .... پاکستان کا برطانوی غلامی سے آزاد ہو کر بھی دولت مشترکہ میں رہنا، مغربی، خاص طور پر امریکی امداد، قرض، مخصوص فوجی اور سیاسی تعلقات..... ہمارے طلبا اور افسران کا اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے ابتداً برطانوی اور پھر بیشتر تعداد میں امریکی وظائف،

سرپرستی اور امریکی جامعات کی عدیم النظیر مخصوص مہارتوں کی شہرت کی بنا پر وہاں جا کر برتر مناصب پر آنے سے پہلے کافی وقت گزارنا۔ انگریزی کا اقوامِ متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں میں ایک غالب زبان بن جانا... ایسی کئی بڑی مضبوط وجوہ نے جو انگریزی کی ناقابلِ تردید اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں ہمارے اعلیٰ مدارج کے بہت سے عمّال، اساتذہ، دانشوروں اور صحافیوں کے علاوہ ہمارے بہت سے سیاست دانوں کو بھی اس موقف کا حامی کر دیا کہ پاکستان کا سرکاری کاروبار انگریزی میں ہی ہونا چاہیے۔ ان کا یہ موقف یقیناً غلط ہے۔ گو ان کی "ذہنی سچائیِ"، نیت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن وہ نفاذ کی راہ میں ایک اہم مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔

ایک غضب یہ بھی ہوا کہ مرکز بمقابلہ صوبہ یا صوبہ بمقابلہ مرکز کے سیاسی مسائل و تضادات نے قومی یکجہتی اور اس کی ایک بڑی (بعض کے نزدیک اسلام کے بعد سب سے بڑی) علامت اردو کی سابقہ طور پر مسلّمہ حیثیت کو ایک متنازعہ فیہ حیثیت دے دی۔ چار قومیتوں کا غلغلہ بلند کیا گیا اور اس ضمن میں علاقائی زبانوں (جنھیں راقم پاکستانی زبانیں کہنا بہتر جانتا ہے) اور اردو کے مابین تضاد پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جو بعض اوقات ناگوار حدود کو چھو جاتی ہے۔ جب کہ اردو کا دیگر پاکستانی زبانوں سے کوئی تضاد ہی نہیں تھا (نہ اب ہے) چوں کہ معروضی حقائق کی طرف سے آنکھیں بالکل ہی بند نہیں کی جاسکتی تھیں اس لیے قومی زبان کی بجائے رابطے کی زبان کا خطاب بھی وضع کیا جو بعض حلقوں میں ایک مختصر سی مدت کے لیے رائج بھی رہا (اب اردو پھر بلا تکلف قومی زبان کہی جاتی ہے) یہ مسائل زیادہ تر 73-1972ء سے پیدا ہوئے جب مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا تھا اور پھر ڈاکٹر ہنری کے سنجر امریکی وزیر خارجہ نے لاہور آکر دعوت دی تھی کہ اب پاکستان اپنا کوئی نیا تشخص تلاش و متعین کرے..... اس زمانے میں بعض عناصر سرکاری ذرائع ابلاغ یعنی ریڈیو اور ٹیلی وژن تک پر چار قومیتی مباحث کو فروغ دیتے نظر آتے (راقم نے اپنی بساط بھر اس طوفان کا مقابلہ اپنے ناچیز اظہاریوں سے کرتے ہوئے پیش گوئی کی تھی کہ اگر ہم ایک پاکستانی قوم کی بجائے چار قومیتی عرفیت پر مُصر رہے تو اس کے منطقی نتیجے میں ایک پانچویں قومیت بھی پیدا ہو کر اپنے جداگانہ تشخص پر اصرار

کرے گی.... راقم کی یہ پیشن گوئی کس حد تک پوری ہوئی اور اس کے جلو میں کن کن پیچیدگیوں نے جنم لیا یہ اس وقت ایک دوسرا موضوع بن جائے گا مگر اتنا حوالہ دینا ضرور ناگزیر نظر آیا) بعض مخالف پاکستان بیرونی طاقتوں اور سامراج کو تو ہماری یک جائی اور حقیقی ترقی روکنی ہی تھی۔ ان کے حربے ایک الگ کہانی ہیں۔

اغلب کہ انھی "وجوہ" سے وفاقی دفاتر میں دستوری شق کا موعودہ نفاذ دھند لکے میں چلا گیا ہے۔

ماضی میں قومی زبان اردو کی ترقی میں موجودہ پاکستانی صوبوں نے کیسا شاندار کردار ادا کیا ہے۔ اس کی چند، محض چند، مثالیں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے ایک مجموعہ مقالات مرتبہ ڈاکٹر اعجاز راہی (مطبوعہ 1985ء) میں ملتی ہیں۔ یہ ایک مذاکرے کے چار مقالوں، ایک خطبۂ صدارت اور ایک ابتدائیہ قسم کے خلاصے پر مشتمل چھ مضامین ہیں (از جناب غلام ربانی اگرو، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، سید رضا ہمدانی اور ڈاکٹر انور سدید، جب کہ مقدمہ ڈاکٹر شفیق الرحمن، صدر نشین اکادمی ادبیات پاکستان اور خطبہ صدارت سابق وزیر قانون جناب اقبال احمد خاں کا ہے) نہایت مفید نکات سے معمور ہیں مگر مذاکراتی محدودات کی وجہ سے نئے قارئین کے لیے ایک تاریخی اور تحریکِ پاکستان کے حوالے سے اردو تحریک اور ہر صوبے میں اس کی ترقیات پر مقامی عوام و خواص کی جدو جہد کی پوری کہانیاں بیان نہیں کرتے (بعض تاریخی تحقیق بہت معلومات افزا ہے) ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اردو، سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب میں) ابتدا سے ہی ایک اہم زبان (بول چال) اور مقامی حضرات کے لیے بھی تخلیقی ادب کی زبان اور اطرافِ پاکستان سے رابطے کا واحد ذریعہ رہی ہے۔ یہ پرانے مباحث بھی زیر گفتگو آئے ہیں کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی یا سندھ میں۔ (نامور محققین کے حوالوں کے ساتھ) اور یہ بالکل بجا دعوے بھی کہ دلی لکھنؤ میں "اہلِ زبان" کا پرانا اقتدار اور محاورہ پاکستان کی توانا، رنگ برنگی، پھیلتی ہوئی اردو کی موجودگی میں کتنا فرسودہ بلکہ ساقط ہو چکا ہے اور یہ موقف بھی کہ اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہونے کے ناتے پاکستان کی سرکاری زبان کے طور پر استعمال ہونے کی حقدار ہے۔

ایک مخصوص موقع پر اس مذاکراتی مجموعے میں ان بے شمار کوششوں کا پورا احاطہ نہیں کیا جاسکتا تھا جو سرکاری سطح پر اردو نافذ کرنے کے سلسلے میں پچھلے چوالیس سال میں بڑی رفتار اور معیار کے ساتھ کی گئی ہیں..... گو مقتدرہ قومی زبان نے ایک خاص سرکاری ادارہ ہونے اور بہت سے قابلِ اعتراض رویوں، کمزوریوں، انتظامی بے بسی اور حکومتوں کی بے توجہی کے باوجود نفاذ اردو کی راہ میں (جس کے لیے وہ بظاہر یعنی سرکاری اعلان کے مطابق قائم کی گئی تھی) مقداری اور معیاری لحاظ سے نہایت بیش قیمت کام کیا ہے..... اس کے متعلق ایک خلاصہ آگے آئے گا.....

کراچی میں انجمن کی شاخ پیر حسام الدین مرحوم اور رفقا نے 1935ء میں ہی قائم کردی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد انجمن کا صدر دفتر بھی پاکستان (صدر مقام کراچی) آگیا اور بابائے اردو نے قائداعظم کے ارشاد کے مطابق اردو کو سرکاری زبان بنانے کی کوششیں شروع کردیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا۔ جن حالات و مشکلات سے انھیں اور ہم خیالوں کو گزرنا پڑا۔ اس کی ایک داستان ان کے کتابچے "اردو کا المیہ" میں موجود ہے (جس کا حوالہ پہلے بھی دیا جاچکا ہے) رفتہ رفتہ خود انجمن کو بھی بعض عجیب وغریب اور حیرت انگیز بیرونی اور داخلی مسائل سے دوچار کردیا گیا۔ جس کی کہانی ان کا دوسرا کتابچہ "انجمن کا المیہ" سناتا ہے۔ نظما اور بعض عمال اردو کالج نے بابائے اردو ایسے جاں نثار اردو کا یہ حال کردیا تھا کہ انجمن کو پانی کی فراہمی تک منقطع کردی جاتی تھی۔ وہ فون پر بار بار بلائے جاتے تھے، چوتھی منزل سے اتر کر دوسری منزل پر فون سننے آتے تھے تو بیہودہ باتیں کہہ کر فون بند کردیا جاتا تھا..... کتب خانہ خاص کو بند کرنا پڑا۔ مالیاتی مشکلات نے فاضل کارکنوں اور عملے میں ناقابل تصور تخفیف کرادی۔ ان کے خلاف شہر میں پوسٹر بازی بھی ہوئی..... انجمن تقریباً معطل ہوکر رہ گئی..... پھر اکتوبر 1959ء میں تنظیم تو شروع ہوئی مگر مولوی صاحب کی برائے نام صدارت اور کمشنر کراچی کی عملی یا بے عمل قیادت میں..... نتیجتاً ان کے انتقال 16 اگست 1961ء تک تنظیم تو نہیں ہوسکی۔ پھر نئے کمشنر جناب جی۔ اے۔ مدنی مرحوم کے تعاون سے نیا دستور بن کر صدر مملکت تک پہنچا اور منظور اور رجسٹر ہوا اور جناب اختر حسین صدر انجمن ہوئے (راقم معتمد اعزازی) ہم نے بعض نئے اور بعض پرانے نظما

تلاش کیے جن کی فضیلت، وجاہت اور اردو دوستی انجمن کے بہت کام آئی اور ہم دوسری سمتوں میں پیش قدمی کے ساتھ ساتھ "اقامتی جامعہ اردو منصوبہ" شروع کر کے اس کے پہلے مرحلے (نیا اردو سائنس کالج کے قیام) سے گزرنے کے قابل بھی ہوگئے مگر وہ وقت آتے آتے انجمن کا بہت سا کام ناچیز کی رائے میں، جس سے بعض محترمین کو اختلاف رہا بجا اور طبعی طور پر کئی اداروں میں بٹ گیا تھا (مثلاً اردو لغت بورڈ بنا دیا گیا تھا) آخر انجمن اردو کی اجارہ دار تو تھی نہیں اور اردو دوست اس انتشار کے ختم ہونے کا جس کا کسی قدر حوالہ اوپر آیا بہت دیر تک انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے اپنے طور پر جس حد تک بھی ممکن تھا ترقی اردو ہی نہیں نفاذ اردو کے لیے خوب کام کیا اور پھیلایا جو یقیناً اردو کے بہترین سرمایوں میں شامل ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر عملی جہاد ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم، مولانا صلاح الدین احمد اور پروفیسر حمید احمد خاں نے کیا۔ ممتاز حسن صاحب، پیر حسام الدین راشدی اور مولانا عبدالقادر مرحومین تو ہماری مجلس نظما میں تھے ہی....

جب اختر حسین صاحب کی صدارت میں کام شروع ہوا راقم کی استدعا پر نظما کی تائید اور اختر حسین صاحب کی منظوری سے یہ طے ہوگیا کہ سندھ کے مخصوص حالات اور مشرقی و مغربی پاکستان کی عمومی سیاسی آویزشوں کے پیشِ نظر کھل کر ایسے "تحریکی کردار" پر زور نہیں دے گی۔ جو اسے تحریکِ پاکستان کے دور میں تفویض کیا گیا تھا اور اس نے پاکستان بننے کے بعد بابائے اردو مرحوم کے زمانے میں بعض محترم بانیانِ پاکستان مثلاً شہیدِ ملت نواب زادہ لیاقت علی خاں، سردار عبدالرب نشتر، پیر الٰہی بخش کئی وزرائے وفاق از پنجاب اور وفاقی وزیر تعلیم جناب فضل الرحمان (از مشرقی پاکستان) کی ہمت افزائی سے برقرار رکھنا چاہا تھا۔ مگر سیاسی تنازعات کی وجہ سے آگے نہ بڑھا سکی.... ہم نے طے کیا کہ اردو کو زیادہ سے زیادہ خزانوں سے مالامال کرنے کی کوشش کریں گے، دوسرے اداروں سے تعاون کریں گے اور ایک اقامتی جامعہ اردو کی تعمیر تک اردو کالجوں کے ذریعے اردو میں تمام علوم کی تدریس کا تجربہ کامیاب کرتے ہوئے ثابت کریں گے کہ اردو تمام جدید تقاضے پورے کرنے کی اہل ہے.... طب میں اردو ذریعہ تعلیم کے لیے ایک طبیہ کالج کا قیام (معہ معمل) بھی ضروری تھا۔ جس کی ہم میں اس وقت سکت نہ تھی.... وہ ملتوی رکھا گیا۔ نیا اردو سائنس کالج البتہ تعمیر

ہوگیا(اس وسیع، نئی عمارت کے لیے بائیس ایکڑ زمین کا حصول اور اس کی تعمیر ایک دلچسپ تاریخ ہے)

اس دوران میں جامعات پنجاب و کراچی کے اشاعت گھروں نے بڑے بڑے منصوبے شروع کر دیے تھے۔ مجلس ترقی ادب، لاہور قائم ہو چکی تھی اور دوسری کاروائیوں کے علاوہ کلاسیکی اشاعتوں کو دوبارہ چھاپ رہی تھی۔ کراچی میں اردو لغت بورڈ قائم ہو چکا تھا(مدیر اوّل خود بابائے اردو تھے) جو لغت کبیر کے منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ 1961ء میں شریف کمیشن کی نامقبول رپورٹ تک نے اردو کالج کے سلسلے میں یونیسکو کا یہ موقف تسلیم کر لیا تھا کہ تعلیم بشمول اعلیٰ تعلیم اپنی زبان میں ہی بہتر ہوتی ہے اور اردو کالجوں (فنون، سائنس، قانون، تجارت) کی امداد کا "تجربہ" جاری رکھنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی (ابتدا میں جامعہ کراچی تک کالج کو سند قبول دینے پر بھی تیار نہیں تھی) اردو میں سائنسی اور دیگر اصطلاحات وضع کرنے کے لیے لاہور میں ایک سرکاری ادارہ "اردو ترقی بورڈ" قائم کر دیا گیا (اب وہ اردو سائنس بورڈ کہلاتا ہے) حکومت پنجاب کی مجلسِ دفتری اصطلاحات نے جو کام بعد میں منضبط کیا وہ شروع ہو چکا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ نفاذ اردو کے حوالے سے سب سے زیادہ علمی ہی نہیں عملی کام بھی بڑے صوبے پنجاب میں ہی ہوا اور ہو رہا ہے۔

مولوی صاحب کے بعد ہم نے جو دوسرے منصوبے شروع اور پورے کیے اور کر رہے ہیں ان کی روداد ایک الگ باب مانگتی ہے۔ جس کے کچھ حصے راقم کتب انجمن کے مقدمات میں سناتا رہتا ہے.... یہ سب دہرانے کا موقع نہیں نفاذ کے چند متعلقات کے حوالے سے کچھ مختصرات پیش کیے جا رہے ہیں:

(1) بائیس ایکڑ زمین لے کر نیا سائنس کالج تعمیر کیا گیا (اسے آگے جا کر مسلم جامعہ علی گڑھ کی طرح اقامتی جامعہ اردو میں تبدیل ہونا تھا تا کہ ملک بھر سے طلبا اور اساتذہ ایک جگہ جمع ہو کر اردو میں اعلیٰ تدریس و تعلیم کے ساتھ قومی یکجہتی کی راہ میں مثالیں بن جائیں۔ ایک زمانے تک اس کالج کے نتائج اچھے رہے۔ طلبا و طالبات اوّل درجہ اوّل بھی آئے تعداد سو دو سو سے بڑھ کر ساڑھے چار ہزار تک پہنچ گئی۔ راقم کی معتمدی تک یعنی جب تک تعلیم قومیائی گئی (1973ء) پانچ مضامین

میں جامعہ کراچی سے اردو میں ایم۔ایس۔سی تک تدریس اور امتحان دینے کی اجازت لی گئی تھی۔ اگر تعلیم (1973ء میں) نہ قومیائی جاتی تو ہم یا ہمارے جانشین اقامتی جامعہ اردو مکمل کر چکے ہوتے جو قومی یکجہتی کی راہ میں بھی ایک بڑا وسیلہ ثابت ہوتی (آج بھی کوئی مکمل پاکستان اقامتی جامعہ اُردو موجود نہیں ہے)

(2) اردو کالج قانون (پرانی عمارت) میں ایل۔ایل۔ایم تدریس کی تیاری مکمل ہو گئی تھی۔ ان اردو کالجوں کے شعبہ ہائے اشاعت مالی اسباب سے زیادہ کام نہ کر سکے مگر بہت سی نصابی کتابیں (فہرست خاصی طویل ہے) مرتب و شائع ہو کر رواج پا چکی تھیں۔

(3) ایک اردو انگلش ڈکشنری جسے بابائے اردو شروع کر گئے تھے بعض فضلا کی مدد سے مکمل ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری جو بابائے اردو کی ادارت میں 1939ء میں چھپی اور پھر مالی بدحالی کے سبب ان کی حیات میں نہ چھپ سکی۔ ہم نے 1968ء سے اب تک چار مرتبہ بڑی تعداد میں شائع کی ہے (کل پانچ اشاعتیں) اس طرح کہ اس میں تقریباً ساڑھے تین ہزار الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور اب پندرہ ہزار نئے الفاظ شامل کیے جا رہے ہیں۔

(4) اسّی ہزار اصطلاحات جو مولوی صاحب کی نگرانی میں تیار ہو چکی تھیں اور سائنس بورڈ لاہور کو کوئی معاوضہ لیے بغیر پیش کر دی گئیں۔ (اس وقت ہمارے مالی حالات اس قابل نہ تھے کہ ہم انھیں چھاپتے اور ہم نے انھیں بے استفادہ رہنے دینا مناسب نہ جانا گو بہت سے ادارے ایسے اثاثوں کو اپنے ہی اجارے میں رکھتے ہیں) ..... اردو سائنس بورڈ نے ان سے بیشتر اصطلاحات کو اپنی سہ جلدی اشاعت میں شامل کیا۔

(5) یونیسکو کے تعاون سے ایک منصوبہ کبھی شروع ہو کر معطل پڑا تھا۔ یہ قاموس الکتب کا منصوبہ تھا۔ جس کی صرف پہلی جلد مولوی صاحب کے زمانے میں شائع ہو چکی تھی۔ یونیسکو کا تعاون تو وفاقی وزارت تعلیم کی بے توجہی سے کبھی کا ختم ہو گیا لیکن منصوبہ جاری ہے اور اب تک مندرجہ ذیل جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

(1) پہلی جلد "مذہبیات" مولوی صاحب کی زندگی میں شائع ہوئی تقریباً بارہ

ہزار اندراجات

(2) دوسری جلد، "تاریخیات" چار ہزار اندراجات

(3) تیسری جلد، "عمرانیات" ساڑھے چار ہزار اندراجات

(4) چوتھی جلد "سائنس" (زیر طبع)

(5) پانچویں جلد "ادبیات" (زیر تالیف)

یوں اردو میں جو بھی ٹھوس کام کیا جائے وہ نہ صرف ترقی اردو بلکہ نفاذ اردو کے اقدامات میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ مخطوطے، تحقیقی کتابیں، کتب خانۂ خاص کی فہرستیں، مخطوطات کی فہرستیں... بعض پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے۔ یہ ہماری تقریباً دو سو کتابیں ہیں۔ ہمارا ماہنامہ "قومی زبان" اور سہ ماہی "اردو" آج اردو دنیا میں معلوماتی اور علمی لحاظ سے دو بہت وقیع اشاعتیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ "قومی زبان" میں نئے خزانے کے عنوان سے ایک مستقل اشاریہ شائع ہوتا ہے جو پچھلے مہینوں کے تمام مقالوں، مصنفوں اور جرائد کے نام درج کرتا جاتا ہے۔ اس طرح اردو میں ایک جاریہ فہرست تحقیقات مرتب ہوتی جاتی ہے۔

اسی ہزار اصطلاحوں کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ جو ہم نے اردو سائنس بورڈ کی خدمت میں ہدیتاً پیش کر دی تھیں۔ اب ملاحظہ کیجیے "مقتدرہ قومی زبان" کی جھلکیاں جو خاص اس دستوری شق کے حوالے سے سرکاری دفاتر میں نفاذ کے لیے قائم ہوئی (1979ء) یہ ماشاءاللہ ایک "امیر کبیر" سرکاری ادارہ ہے۔ اس کے صدر نشین سب سے بڑے سرکاری گریڈ 22 کے عہدہ دار ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ عملہ بھی ماشاءاللہ تعداد میں کافی اور شمولیت فضلا کے اعتبار سے خاصا موثر ہو گیا ہے۔ اس کے نظما میں بطور عہدہ ہی کئی وفاقی معتمدین، صدر نشین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن۔ کئی شیوخ الجامعات، ماہرین، مستشرقین اور فضلا شامل ہیں۔ ان میں سے چند پر مشتمل ایک مستقل کمیٹی بھی ہے۔ اس کا ایک ماہنامہ "اخبار اردو" بھی جاری ہوتا ہے۔ اس نے مختلف شہروں میں ٹائپ کاروں اور مختصر نویسوں کو تربیت دی ہے، اردو ٹائپ مشینیں تو کبھی کی تیار ہو چکی تھیں ہزارہ کی فیکٹری اور اب دوسری بیرونی کمپنیوں نے بھی کئی ٹائپ مشینیں بنائی ہیں جو "ورڈ پروسیسر" جیسی استعداد اور تیزی کے

ساتھ اردو میں بھی کام کر سکتی ہیں اور کر رہی ہیں۔

لیکن ان بہت سی مطبوعات کو چھوڑ کر جو راقم کی رائے میں نہ تو اس ادارے کی ترجیحات میں شامل ہونی تھیں سرکاری دفاتر میں نفاذِ اردو کے مخصوص منصوبے کے لیے ضروری، صرف دفتری استعمال کے لیے ہی مندرجہ ذیل موضوعات پر (موضوعات کے عنوان مقتدرہ کے ہی قائم کردہ ہیں) کتنی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔ یہ فہرست ان کے "اخبار اردو" شمارہ بابت ماہ جولائی 1991ء سے لی گئی ہے۔

دفتری اردو	26
عدالتی اردو	10
حوالہ جاتی امور	43
تعلیمی اردو	42
تکنیکی و ترقیاتی امور	13
امور ترجمہ	7
لغات اصطلاحات سازی	34
کل	175

راقم ایک میقات میں اپنے سابق شریک کار۔ اب متولی انجمن اور مہربان دوست مشہور محقق جناب مشفق خواجہ کے اصرار پر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے دور صدر نشینی میں مجلسِ نظما کا رکن رہا۔ (کچھ مصلحت ڈاکٹر صاحب کی بھی تھی تقریباً زبردستی رکنیت دلوا دی) اور جس حد تک ممکن تھا اس ادارے کو سمجھنا چاہا۔ کافی کام ڈاکٹر وحید قریشی کے زمانے میں بھی مکمل اور شروع ہو گیا تھا۔ اردو سائنس بورڈ کی کتابیں پہلے دوسرے موضوعات پر بھی آتی تھیں اب ان میں بیشتر سائنس، تدریس و تحقیق سے متعلق ہیں۔ مجلسِ دفتری زبان لاہور کا ذکر آ ہی چکا ہے۔ اُس وقت (چار برس پہلے) مقتدرہ کا وہ بجٹ جو راقم نے بنوایا اور ڈاکٹر صاحب نے منظور کرایا ساٹھ لاکھ روپے سالانہ سے زیادہ کا یاد ہے۔ بعد میں گرانی اور نئی کتابوں کے سبب بڑھتا ہی رہا ہوگا (شاید کروڑ سے زیادہ) سب کچھ تھا۔ مگر بیشتر نشستیں ڈاکٹر سید عبداللہ اور

بریگیڈیئر گلزار احمد جیسے مجاہدین کو چھوڑ کر ایک بے اختیار، بے بس، کام چلاؤ قسم کی "شے" لگتی تھیں۔ ایجنڈا بڑا اچھا پیش ہوتا۔ منصوبوں کی سفارش ایک ذیلی منتظمہ کر ہی چکی ہوتی جو سرکاری اداروں میں دراصل "آزاد" لفظ سے بچنے کی ایک حکمت عملی ہوتی ہے (ہم عملاً صرف توثیق ہی کر سکتے ہیں) یہ ایک پرانی ترکیب ہے جو ڈاکٹر شریف مرحوم معتمد وزارت تعلیم نے رائج کی تھی) لفظائے کرام کے مناصب اور فضیلت کا تو کیا کہنا ہے، صدر نشین صاحب کے خلوص، دردمندی اور بے تابی کا بھی اعتراف ہے مگر پوری مجلس کی فضا کچھ ایسی ہوتی تھی جیسے ہم کسی کے حکم پر مجبوراً صورت دکھانے، حاضری پوری کرنے آ گئے ہوں۔ نفاذ ہو جائے تو اچھا ہے۔ نہ ہو تب بھی اپنا وقت پورا کرنا ہے کہ سرکار دولت مدار نے نامزد کیا ہے۔ عموماً تنخواہ دار اہلِ مناصب، اراکین کا یہی رویّہ ہوتا ہے۔ جب پورا اطمینان ہو کہ بالآخر کوئی "نقصان" نہیں ہوگا مختصراً "اپنی بات" کہہ دیتے ہیں اصرار سرکار کی آنکھ دیکھ کر ہی کر سکتے ہیں اور بعد میں اپنی نہایت قیمتی سفارشات بلکہ فیصلوں تک پر عمل درآمد کے لیے ایسی کوئی بات نہیں کرتے جیسی کہ رضا کار، دردمند "تحریکئے" کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ تحریکیوں کا تو بنیادی مقصد ہی اس کام کی تیاری اور تکمیل یقینی بنانا ہوتا ہے جس کے لیے وہ اپنا وقت دیتے ہیں۔ انھیں سرکار دربار کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔

"مقتدرہ قومی زبان" کابینہ ڈویژن سے منسلک کر کے خاص وزیراعظم کے تحت رکھی گئی ہے۔ دوسرے وفاقی لسانی اداروں (اردو سائنس بورڈ۔ لاہور، اردو لغت بورڈ، کراچی) کی طرح وزارتِ تعلیم سے ماتحتانہ رشتہ نہیں رکھتی۔ یعنی اس کے ذمہ دار وزیر خود وزیراعظم (اور صدارتی دور میں صدر) ہوتے ہیں۔ اس طرح دنیا کے سامنے اسے ایک اہم ادارہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے... آج سے کئی برس پہلے بھی اس کی تیار کردہ مخصوص کتابیں، مجوزہ فوری طور پر قابلِ عمل انتظامات (ٹائپ کاری، مختصر نویسی، ٹائپ مشینوں کی موجودگی) اور ملک بھر میں انجمن، اردو بورڈ، مجلس دفتری اصطلاحات اور کئی جامعات کے فراہم کردہ مواد اور اشاعتوں کے ذخائر اس قابل ہو چکے تھے کہ ایک آدھ سائنسی شعبہ مثلاً ایٹمی توانائی کا مرکز (کانوپ) پینس ٹیک، سپارکو وغیرہ کو چھوڑ کر، جہاں جدید ترین انگریزی جرمن فرنچ اصطلاحوں کا ناگزیر غلبہ

اور استعمال جاری تھا، عام سرکاری دفاتر، مثلاً اسلام آباد سکرٹریٹ اور اس کے بے شمار غیر تکنیکی محکموں بطور خاص ان شعبوں میں جن سے عام آدمی کا واسطہ روز پڑتا ہے اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کیا جا سکتا تھا (جی۔ ایچ۔ کیو نے اپنی سرکاری زبان انگریزی کے باوجود ہمارے سپاہیوں کے لیے قواعد کے علاوہ ابتدائی تدریسی زبان، جس میں بہت سی اصطلاحات و مخففات سے واقف ہونا پڑتا ہے قومی زبان ہی کو رکھا ہے بلکہ شخصی حیثیت میں راقم سے اس کی موسیقی کمیٹی نے تمام فوجی بگل کالز کا اردو ترجمہ بھی کرالیا ہے) ایک بار "نفاذ" ہو جاتا۔ جہاں اردو اصطلاح آسانی سے نہ ملتی انگریزی اصطلاح استعمال کرنے کی اجازت ہوتی۔ اب بھی ہم انگریزی لفظ استعمال کر جاتے ہیں۔ دفتری زبان میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کی تعداد نسبتاً محدود ہے وہ طب اور نئی نئی سائنسی فتوحات کی دنیا نہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، وہاں بھی روز نئی اصطلاحات کبھی رواں استعمال سے وجود میں آجاتی ہیں کبھی دوسری پرانی زبانوں (لاطینی، یونانی) کے آمیزے سے وضع کر کے رائج کر دی جاتی ہیں۔ دفتری زبان میں تو قومی زبان کا استعمال بہت آسان ہے۔ وہاں بہتر ادائے اظہار کے لیے مشق اور اہلیت میں افزونی شرط ہے۔ سو وہ کوئی مشکل مسائل نہیں اور جب ایک مرتبہ نفاذ کا عمل شروع ہو جاتا ضرورت خود ہی بے شمار مراحل آسان کر دیتی۔ اس مقدمے میں یہ شعر نقل کرنا خود راقم الحروف کو غیر ثقہ لگتا ہے۔ مگر اس وقت اس سے بہتر کوئی اظہار سوجھ بھی نہیں رہا۔ اللہ بخشے فیض صاحب ایسے مواقع کے لیے نہ جانے کس کا شعر پڑھا کرتے تھے:

جو دل کے لگانے کے ڈھب جانتے ہیں
وہ ترکیب ورکیب سب جانتے ہیں

اصل سوال دل لگانے کا تھا اور ہے اور راقم کا موقف جیسا کہ مشاہدے کی بنا پر عرض کیا گیا یہ ہے کہ ہماری اصل مقتدرہ (اسٹیبلشمنٹ) (نہ کہ ہماری مقتدرہ قومی زبان، واقع اسلام آباد) تا حال اردو کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کے حق میں ہی نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے سیاسی ظلمات کے کرداروں نے بھی پچھلے تیس چالیس برس میں کسی بھی قومی یکجہتی اور اعلیٰ تر نصب العینی مقاصد ہی نہیں کاروبار

ریاست آسان طور پر چلانے، عوام کو ناگزیر سہولتیں دینے کے حق میں پوری سنجیدگی کے ساتھ نہیں سوچا۔ بس تحریک پاکستان کے تاریخی گومدھم ہوتے ہوئے دباؤ میں دستور پاکستان میں ایک شق داخل کر کے اس پر عمل درآمد کی (بہت ہی تھوڑی) قیمت مختلف اداروں کی امداد اور پھر مقتدرہ قومی زبان کے قیام کی صورت میں دیتے رہے ہیں (جتنی گرانٹ ان سب اداروں، مع مقتدرہ کو اب تک ملی ہوگی (بیس پچیس کروڑ روپے پچھلے بیس تیس برس میں) اتنی رقم ایک بڑے سیاسی جلسہ جلوس پر خرچ ہو جاتی ہے ....) اعلیٰ عمال حکومت کا نفسیاتی مسئلہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

اس ضمن میں دو اور باتیں ریکارڈ پر لے آئی جائیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی سے پہلے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم صدر نشین مقتدرہ مقرر ہوئے تھے۔ وہ استادالاساتذہ بھی تھے اور ابتدائے پاکستان میں ہی وزیر مملکت کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ مارشل لاء حکومت کو اپنے سیاسی مصالح کے تحت نفاذ اسلام کی کوششوں میں ایک پر تو نفاذ قومی زبان کا بھی دکھانا تھا اور "مقتدرہ" کو قوم کے سامنے پوری اہمیت کے ساتھ پیش کرنا بھی، چنانچہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب مرحوم کا عہدہ وزیر مملکت کے برابر رکھا گیا مگر صرف اپنی ذات سے انھی کی میقات تک محدود .... ڈاکٹر صاحب بیمار بھی رہے اور ہر ادارے کو ابتدائے قیام میں بہت سے ایسے دفتری مسائل سے گزرنا پڑتا ہے جن کی روایت میں تاخیر شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا دورِ صدر نشینی ان کے انتقال کے سبب مختصر بھی رہا۔ چنانچہ مقتدرہ مطلوبہ رفتار کے ساتھ کام شروع بھی نہ کر سکی۔ اس کا دفتر کراچی رکھا گیا تھا جو پوری طرح جمنے بھی نہیں دیا گیا ان کے بعد غیر ضروری طور پر مگر بوجوہ ظاہر اس کا صدر دفتر اسلام آباد تبدیل کر دیا گیا (بہرحال اسلام آباد ہمارا صدر مقام ہے) اور برادرم ڈاکٹر وحید قریشی کی صدر نشینی میں نہ صرف خاصا کام شروع ہوا بلکہ بہت سے منصوبے مکمل بھی ہو گئے۔ جیسا کہ عرض کیا راقم ان کے اس دور میں رکن نظما بنایا گیا۔ (گو اصل مقتدرہ میں نہیں رکھا گیا جو فیصلوں کی ابتدا .... اور عملاً انتہا بھی .... کرتی تھی) اب کو راقم سے اور راقم کو ان سے پاکستان رائٹرز گلڈ کے اس دور میں سبب وہ ہم ..

پاکستان شاخ کے رکن منتظمہ اور راقم مرکز میں معتمد اعزازی تھے۔ چند در چند معاملاتی اختلافات پیدا ہو جاتے تھے جن کا تاثر کسی قدر نجی (ذہنی) تحفظات کی صورت میں بعد میں بھی قائم رہا (شاید اب بھی ہمارے ذہنوں کے کسی کونے کھدرے میں چھپا ہوا ہو گو کھل کر ظاہر نہیں ہوتا) مگر راقم یہ لکھنے میں ذرا باک محسوس نہیں کرتا کہ وہ اپنی پوری سچائی کے ساتھ، اپنے منصب کی مقرر کردہ ذمہ داری کے علاوہ، سرکاری دفاتر میں نفاذ اردو کے لیے بے چین رہتے تھے۔ چوں کہ پاکستان سکریٹریٹ ہی کیا پوری اسلام آبادی معاشرتی اقدار میں گریڈوں کا فرق ایک بڑی قدر توقیر و تحقیر ہے اس لیے ڈاکٹر صاحب یہ بھی چاہتے تھے کہ انھیں اعلیٰ حکومتی طلقوں میں موثر توقیر کے ساتھ سنا جائے اور انھیں غیر ضروری طور پر نچلے مراحل سے نہ گزرنا پڑے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے چند بار حکومت کو مخلصانہ مشورہ دیا بلکہ مطالبہ بھی کیا کہ انھیں ہی نہیں صدر نشین مقتدرہ کو بلحاظ منصب وزیر مملکت کے برابر قرار دیا جائے۔ کچھ لوگ اسے ذاتی وجاہت طلبی سمجھے جب کہ یہ ایسے نظام حکومت میں جو ہمارے ہاں رائج ہے نہ صرف ایک جائز بات تھی اور ہے۔ بڑا منصب دار بڑے منصب داروں سے آنکھ ملا کر بات کرتا ہے اور دوسری سطحوں کے چالاک اور اصل طاقت قسم کے صاحبان بھی اسے نسبتاً زیادہ سنجیدگی سے سننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ افسوس کہ ان کی بات نہیں مانی گئی یعنی قومی زبان نافذ کرنے کے ادارے کا سربراہ، گریڈ 22 (سکریٹری صاحبان اور مساوی الدرجہ افسران کا گریڈ ــــ چند برس سے سرکاری ملازمت کا آخری گریڈ) سے زیادہ اہمیت کا مستحق نہیں سمجھا گیا جب کہ وہ پی۔ ایچ۔ ڈی تھے، ڈی لٹ تھے، کئی کتابوں کے مصنف، پنجابی، اُردو، فارسی کے بہت سینئر اُستاد اور صدر نشین مقتدرہ قومی زبان۔ وفاقی حکومتوں میں محکمہ اقتصادیات، مالیات، داخلہ تک کے بعض سکریٹری بعض مرتبہ سکریٹری جنرل بھی بنائے گئے ہیں۔ وزیر اعظم کے بعض مشیروں کو وزیر مملکت کا درجہ بھی دیا جاتا رہا ہے۔ یہ نہیں کہ پچھلی کوئی نظیر نہیں تھی، یہ بھی نہیں کہ یہ منصب اس لائق نہیں تھا کہ اسے وزیر مملکت کا درجہ دیا جائے۔ حکومتوں میں بڑے بڑے چپڑقنات خواتین و حضرات جو منتخب اراکین یا پارلیمان بھی نہیں تھے اس درجے کے عہدوں پر فائز رہے اور رہتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید

قریشی یہ درجہ صرف اپنے لیے نہیں بلکہ منصب کے لیے طلب کر رہے تھے تاکہ متعلقہ بیورو کریسی اور بالائی حلقوں میں مقتدرہ کے خطوط اور ان کے مکالے مطلوبہ وقعت کے ساتھ لیے جائیں۔ اس منصب کو یہ درجہ نہ دینے کے لیے جن سرکاری عناصر نے پورا زور لگا دیا راقم ان کے اسمائے گرامی بھی جانتا ہے اور اس معاملے میں ڈاکٹر قریشی کا کھلا ساتھ دینے پر ان کے ہاتھوں خفیہ طور پر دی گئی کچھ سزا بھی بھگت چکا ہے (کبھی ممکن ہوا تو سوانح عمری میں ذکر آجائے گا) لیکن فیصلہ تو حکومت کی ذمہ داری تھا۔ اس نے غلط سفارشات تسلیم کیں تو الزام اس پر ہی لگے گا.... افسوس کہ اس منصب کو یہ درجہ نہیں دیا گیا... پالیسی سطح پر وجہ وہی نظر آتی ہے کہ پچھلی وفاقی حکومتیں نفاذ قومی زبان کو مطلوبہ اہمیت نہیں دیتی رہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی اس سبب اور کئی دیگر اسباب سے اعلیٰ ترین سطحوں تک بار بار جا بھی نہ سکے، نچلی سطحوں والے کام کو ٹالتے اور ٹلواتے بھی رہے گو نفاذ کی بیشتر تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ جب نفاذ کی ابتدا بھی نہیں ہوئی تو مقتدرہ نے کچھ دیگر علمی، ادبی سرگرمیاں اور اشاعتیں بھی شروع کر دیں جن کا راقم کی ناچیز رائے میں نفاذ سے کوئی راست تعلق نہ تھا۔ لیکن یہ ہمارے سرکاری اداروں کی روایت بھی ہے جب اصل کام نہ کرنے دیا جائے تو اپنے اور بجٹ کو برقرار اور وجود کو نمایاں رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی سلسلہ تو جاری رکھنا ہی پڑتا ہے۔ افسوس کہ ڈاکٹر قریشی کے دور میں مقتدرہ کا موقف، تیاریاں، عملی تجاویز ایوانِ اقتدار میں بار نہ پا سکیں..... جب ان کی میعاد ختم ہونے لگی تو ان کی فضیلت اور مصالح مرسلہ کے سبب اس میں کسی قدر توسیع بھی کی گئی (ان کے کچھ شاگرد قربِ اقتدار بھی رکھتے تھے) مگر اسے عملاً صرف ایک سینیئر اور محترم سرکاری منصب دار کے لیے توسیع ملازمت کی رعایت ہی قرار دیا گیا۔ اس توسیع کو بھی حکومت نے نفاذ کی راہ میں ذرا استعمال نہیں کیا جب کہ ان کی پالیسی مدد کی جاتی تو ڈاکٹر قریشی اس توسیع کے زمانے میں بھی بہت کچھ کر سکتے تھے...

جب توسیعات کے بعد ان کی سبکدوشی کا وقت قریب آیا تو اس وقت کے اسٹیبلیشمنٹ سکریٹری جناب آفتاب احمد خاں اور کابینہ سکریٹری جناب مسعود الزماں

نے روایتی احتیاطوں کے ساتھ راقم الحروف کو یہ مژدہ سنایا کہ سرکاری روایت کے مطابق صدر نشینی کے لیے اوپر بھیجے جانے والے تین ناموں میں سے ایک نام راقم الحروف کا بھی ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ پیشگی آمادگی ظاہر کر دے .... راقم الحروف اس وقت نیشنل بینک آف پاکستان سے ڈیپوٹیشن پر پاکستان بینکنگ کونسل میں مشیر منصوبہ بندی، ترقیات و تشہیر تھا۔ اگلے چند ماہ میں اس کی پچھلی توسیع ملازمت ختم ہونے والی تھی۔ اگلی توسیع یقینی تو نہیں متوقع ضرور تھی۔ کیوں کہ بہ تقاضائے کار کونسل کی سفارش پر پچھلے سے پچھلے وزیر خزانہ (حال صدر مملکت) جناب غلام اسحاق خاں نے ترقی دی تھی اور پچھلے وزیر خزانہ ڈاکٹر محبوب الحق کے زمانے میں تو بینکوں کے ذریعے خصوصی سرکاری بانڈز کی فروخت سرکاری اہداف سے کہیں زیادہ کرانے پر راقم کو سب سے زیادہ نقد انعام بھی ملا تھا (دو لاکھ روپے جب کہ کئی دوسرے ہم رتبہ شرکائے کار کو ایک لاکھ روپے بلکہ کسی قدر کم رقوم کے نقد انعامات ملے تھے) اور دو سال توسیع ملازمت بھی۔ تیسرے وزیر خزانہ جو اس وقت وزیر خزانہ تھے .... میاں محمد یٰسین خاں وٹو .... انھوں نے بھی شعبہ بینکاری کی تیسری سفارش پر وزیر اعظم سے مزید دو سالہ توسیع دلوانے کا عندیہ دے رکھا تھا (اس شعبے میں اعلیٰ مناصب کی مراعات سرکاری مراعات سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں)

راقم اس "امکان" پر، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر، کراچی کا چھپن سالہ قیام ترک کرنے کے لیے تیار ہو گیا مگر ایک شرط رکھی۔ یہ کہ اس تجویز کے ساتھ راقم کی ایک معلوماتی ملاقات اس وقت کے وزیر اعظم (جناب محمد خاں جونیجو) سے کرا دی جائے، وجہ پوچھی گئی تو عرض کیا کہ راقم نے انجمن اور دیگر اداروں میں جو بُری بھلی خدمات انجام دی ہیں رضاکارانہ رہی ہیں۔ بینکاری وغیرہ سے متعلق ملازمت میں دماغ بیچا جاتا ہے دل اور عقیدہ نہیں بیچا جاتا۔ راقم الحروف ایک "بڑے نام" والے عہدے پر فائز ہونے کے لیے دل اور عقیدہ بیچنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اگر وزیر اعظم صاحب سے ملاقات میں راقم کی اتنی تسلی بھی ہو جائے کہ وہ تدریجی طور پر ہی سہی وفاقی دفاتر میں قومی زبان نافذ کرانے کی نیت اور ہمت رکھتے ہیں تو راقم نہ صرف یہ عہدہ قبول کر سکتا ہے بلکہ وہ یہ عہدہ کسی اور کو بھی عطا کر دیں تب بھی محض ایک معمان، بے

تنخواہ، حاصل مثلاً مشیر کی حیثیت میں کام کرنے کے لیے اسلام آباد آجائے گا گھر کراچی میں رہ سکتا تھا۔ خود کسی دوست کے ہاں ٹھرا رہے گا اور مفت کام کرے گا۔ یہ سکریٹری صاحبان اس ضمانت کے ساتھ وزیر اعظم صاحب سے ملاقات نہیں کرا سکے ..... دونوں بفضل تعالیٰ حیات ہیں۔ اس کتاب کی ایک ایک جلد ان کی خدمت میں بھی بھیجی جائے گی۔ آفتاب احمد خاں تو ریٹائر ہو کر کراچی میں مقیم اور انجمن کے متولی یعنی مجلس نظما کے رکن بھی ہیں۔ (راقم کو شعبہ بینکاری میں مزید ایک سال کی توسیع مل ہی گئی)

ڈاکٹر وحید قریشی کی جگہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا تقرر ہوا اور ان کے دور میں بھی کام ہو رہا ہے مگر نفاذ کے مدارج شروع نہیں ہوئے۔ اس وقت سے دو حکومتیں بدل چکی ہیں۔ جونیجو صاحب جبراً "سبکدوش" ہوئے۔ ایک مختصر مدت افراتفری کی کسی منتخب حکومت کے بغیر گزری۔ پھر عام انتخابات ہوئے (1988ء) محترمہ بے نظیر بھٹو نے حکومت بنائی وہ بیس مہینے قائم رہی۔ اس سمت میں کوئی نظر آنے والا اقدام نہیں کیا گیا بلکہ ان کے وزیر تعلیم کی پرانی اردو دشمنی کچھ زیادہ ہی ظاہر ہوتی رہی جبکہ محترمہ اس وقت ایسا یعنی خلاف اردو کوئی ریکارڈ نہیں رکھتی تھیں۔ بہرحال اگست 1990ء میں وہ بھی سبک دوش ہوئیں۔ جتوئی صاحب کی عبوری حکومت دو ڈھائی مہینے رہی۔ وہ اس طرف کیا توجہ دیتی۔ پھر اکتوبر 1990ء کے انتخابات ہوئے اور جناب محمد نواز شریف نے حکومت بنائی۔ اسے بے تادم تحریر ڈیڑھ سال بھی پورا نہیں ہوا۔ اب وہ زیر آزمائش ہے۔ مگر جیسا کہ ابتدا ہی میں عرض کیا گیا صوبہ پنجاب میں ضرور نفاذ کے ابتدائی احکامات جاری ہو چکے ہیں۔ کسی حد تک صدر معتمدی (پاکستان سکریٹریٹ) میں عمل بھی ہو رہا ہے مگر تناسب سے اس کی ترقی کار کی رفتار سست ہے کیوں کہ راقم کی رائے میں اصل مسئلہ وفاق میں فوری یا مخلصانہ تیز رفتار تدریجی نفاذ کا ہے۔ بہرحال ہماری رائے میں ان دو ڈھائی تکنیکی شعبوں کو چھوڑ کر جہاں ترجمے اور متبادلات ہمیشہ ہی ضروری رہیں گے روزمرہ دفتری کاروبار کے لیے تیاری، فوری نفاذ کے لیے بھی تقریباً مکمل ہے (یوں یہ ایک جاریہ عمل ہے) ساتھ ہی جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے، تدریجی نفاذ کا حکم ہوتے ہی بہت سے ایسے عناصرِ نفاذ خود بخود

پوری قوت کے ساتھ متحرک ہو جائیں گے، جن کی مکمل پیش بینی بھی آج ممکن نہیں۔ (سیکڑوں نجی اور سرکاری عناصر) لیکن چونکہ یہ حکومت ابھی کئی مشکلات میں پھنسی ہوئی ہے، نئی بھی ہے اس لیے اسے آزمائش کے لیے چند مہینے اور دینے پڑیں گے۔ اس دوران میں کم از کم اس کی نیّت یقینی طور پر ظاہر ہو جائے گی۔ ہاں اس میں نافذ کرنے کی قانونی قوت صاف نظر آتی ہے کیوں کہ آج تک کسی حکومت کو اتنی بڑی پارلیمانی تائید حاصل نہیں ہوئی جتنی اسے ہے اور دستور کی وہی شق آج بھی برقرار رکھی گئی ہے گو دستور میں ایک اور موضوع پر ترمیم آ چکی ہے یعنی اگر یہ حکومت چاہتی تو دستور سے اردو نفاذ کی شق نکال سکتی تھی مگر نہیں نکالی..... اس کے مصالح مرسلہ اپنی جگہ، عوامی دباؤ کا یہ پہلو واضح ہے کہ کوئی مائی کا لال کھل کر اس دستوری شق کو خارج از دستور کرانے کی بات نہیں کرتا، سبھی اس کے حق میں بولتے ہیں (خواہ مخلصانہ خواہ منافقانہ) اور بات ٹلنے کے ساتھ ساتھ تیاریاں بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ جب تک موجودہ حکومت بالاعلان اس دستوری شق کی مخالفت نہ کرے ہمیں اس کی طرف سے خوش گمانی ہی رکھنی پڑے گی۔ بہرحال.....

دل کا ہر داغ مسکراتا ہے
دیکھیے کیا پیام آتا ہے

باب سوم

(چند گزارشات وضع اصطلاحات کے حوالے سے)

وضع اصطلاحات پر راقم کی معلومات کے مطابق اردو میں اب تک سب سے زیادہ رہنما اور جامع کتاب مولوی وحید الدین سلیم مرحوم کی کتاب "وضع اصطلاحات" ہی ہے اس کی اوّل اشاعت 1929ء میں آئی۔ دوسری اشاعت 1952ء میں، تیسری اشاعت 1960ء میں (تینوں مطبوعاتِ انجمن ہیں) پہلی اشاعت پر بابائے اردو مرحوم نے ایک بسیط مقالہ تحریر کیا تھا جو انجمن شائع کر چکی ہے۔ اس میں بابائے اردو نے اس وقت تک اصطلاح سازی کی پوری تاریخ جمع کر دی تھی۔ کئی اور کتب حوالہ زیر گفتگو آ سکتی ہیں مثلاً "اصطلاحات عدلیہ و مالگزاری" از ایچ ایچ ولسن، اشاعت

اوّل لندن 1855ء، طبعِ نو از مقتدرہ قومی زبان۔ 1985ء۔ یہ ایک نادر کتاب ہے جو نایاب تھی۔ اس کا مقدمہ نہایت فاضلانہ ہے۔ اشاریہ بے مثال طور پر تفصیلی اور سائنٹفک ۔۔۔ اور ایک موقف کی روشن (اور سائنٹفک تائید ۔۔۔۔ یہ کہ "معاملات" کسی ملک کی قومی زبان میں ہی طے کرنے چاہئیں ۔۔۔ انگریز جو 1855ء میں حاکم تھا بزور شمشیر انگریزی اصطلاحات بھی رائج کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ کام نہیں چل سکتا تھا۔ 732 صفحے (بڑے سائز) کی یہ کتاب (انگریزی کے آگے دیوناگری اور عربی یا اردو دونوں رسم الخط استعمال کیے گئے ہیں) جب کہ اصطلاحات یعنی انگریزی کے مترادفات جو اس وقت جنوبی ایشیا میں رائج تھے عربی، فارسی، ہندوستانی (ہندی۔ اردو) سنسکرت، ہندی (۹) بنگلہ، اڑیا، مراٹھی، گجراتی، تیلگو کرناٹا، (کنڑی) تامل، ملیالم اور "دوسری" زبانوں سے لیے گئے ہیں ۔۔۔ آخر پورے ملک پر حکومت کا خواب اور منصوبہ تھا جو پورا بھی ہوا۔

لیکن! اس وقت دو نسبتاً جدید مطبوعات کا ذکر ضروری ہے۔ جب ڈاکٹر وحید قریشی صدر نشین مقتدرہ تھے، مقتدرہ نے دو مذاکرے منعقد کیے جن کے منتخب مقالات جون 1980ء میں مقتدرہ ہی نے شائع کیے۔ اس مجموعہ کا نام ہے "تحقیق اور اصول وضع اصطلاحات پر منتخب مقالات" اسے ڈاکٹر اعجاز راہی (مقتدرہ) نے مرتب کیا ہے۔ اس میں اصول وضع اصطلاحات پر سات مقالے ہیں۔ ان کے موضوعات اور صاحبان مقالات کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ قانونی اصطلاحات کے مسائل۔ مسٹر جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن

2۔ وضع اصطلاحات کے اصولی مباحث۔ جناب شان الحق حقی

3۔ معاشی علوم کی اصطلاحات کے مسائل۔ جناب ڈاکٹر سی۔ اے۔ قادر

4۔ دفتری اصطلاحات کے مسائل۔ جناب ڈاکٹر انعام الحق کوثر

5۔ فطری سائنس کی اصطلاحات کے مسائل۔ جناب ڈاکٹر معین الدین عقیل

6۔ اُردو میں وضع اصطلاحات کا عمومی جائزہ۔ جناب ڈاکٹر انور سدید

7۔ وضع اصطلاحات کے عمومی مسائل۔ جناب ڈاکٹر سلیم اختر

ان مقالوں پر ان مذاکروں میں جو بحث ہوئی شاید تمام و کمال قلم بند بھی ہوئی ہو گو راقم

کو اس پر مشتمل کوئی اشاعت نظر نہیں آتی لیکن انھیں ہی پڑھا جائے تو یہ مقالے اس امر کے گواہ ہیں کہ وضع اصطلاحات کے بہت سے اہم پہلو زیر بحث آئے تھے۔ علمی معاملات میں ہر مسئلے پر تمام متعلقہ فضلا میں کامل اتفاق نہ ممکن ہے نہ ضروری ورنہ فیصلے کبھی نہ ہوں اور مزید علم جوئی کی ضرورت ہی نہیں رہے۔ اس وقت جتانا یہ ہے کہ اصطلاحات وضع کرنی ہوں یا ترجمہ، سارے کام کی حیثیت علمی ہوتی ہے جس کے لیے اس فن سے ناواقف محض کسی اقتدار کے نشے سے سرشار یا قومی زبان سے بیزار یا ایسے موضوعات پر گفتگو میں عموماً غیر ذمہ دار اصحاب میں فوری قبولیت حاصل ہونا یا فوراً ہی عام و خاص کی زبانوں پر چڑھ جانا ضروری نہیں۔ ہر علمی اصطلاح کے لیے عوام تو کجا خود متعلقہ شعبے کے اچھے سے اچھے طالب علموں ہی میں نہیں اساتذہ میں بھی رائج ہونے میں وقت لگتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اصطلاح (وضع کردہ یا ترجمہ شدہ) درست مفہوم ادا کرتی ہے اور ممکنہ حد تک مختصر ہوتی ہے یا نہیں (یوں پورے کے پورے فقرے بھی ناکافی کہے جا سکتے ہیں)۔

اردو سائنس بورڈ نے ہماری ہدیہ کردہ اسی ہزار اصطلاحوں میں سے بڑی تعداد منتخب کر کے اور بہت سی وضع و ترجمہ کردہ مترادفات پر مشتمل "فرہنگ اصطلاحات" تین ضخیم جلدوں میں (1984 سے 1986ء) تک چھاپ دی تھی۔

پہلی جلد کے مرتبین میں دو اصحاب کے نام چھپے ہیں۔

(1) جناب اشفاق احمد

(2) جناب محمد اکرام چغتائی

یہ جلد اے تا ڈی (A-D) کو محیط کرتی ہے۔

اصل متن کے پانچ سو پچانوے صفحے ہیں۔ ہر صفحے پر اوسطاً ساٹھ انگریزی الفاظ / اصطلاحات یعنی کل پینتیس ہزار سات سو ترجمے او وضع کردہ اصطلاحات ہیں۔

دوسری جلد (1985ء) ای تا او (E-O) پر مشتمل ہے۔

یہ چھ سو تریپن صفحات میں نسبتاً پتلے حروف کی وجہ سے الفاظ کا اوسط چھیاسٹھ فی صفحہ پڑتا ہے یعنی کل 26049۔

تیسری جلد پی سے زیڈ (P-Z) پر محیط ہے۔ (اشاعت نومبر 1985ء) یہ چھ

سو چھپن صفحات اور 34 لفظ فی صفحہ کی اوسط سے 22304 الفاظ ہیں۔ گویا ان تین جلدوں میں ہی 84053 اُردو الفاظ، مترادفات، متبادلات، اصطلاحات موجود ہیں۔

بقول ناشرین "اس فرہنگ کی ترتیب وتہذیب میں سائنسی اور فنی مضامین لکھنے والے، مترجموں، مولفوں اور مصنفوں کے تقاضوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ ان کو اپنے خصوصی مضمون کے علاوہ ان موضوعات کی اصطلاحیں بھی یہیں مل جائیں جو ان کے خصوصی مضمون کے ساتھ خط مماس بن کر گزرتے ہیں۔ مثلاً زرعی معیشت پر لکھنے والوں کو زراعت کی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ معاشیات کی اصطلاحیں بھی اسی ایک فرہنگ میں ملیں۔"

اب اُردو سائنس بورڈ کی دوسری مطبوعات کی وہ فہرست بھی ملاحظہ کرلیجیے جو راقم نے ان کی طویل فہرستِ مطبوعات سے منتخب کی ہے۔ یہ صرف سائنس کی کتابیں ہیں (ورنہ دوسری اہم کتابوں کی تعداد بھی خاصی ہے) اس کا مقصد صرف یہ نمونے دکھا کر ثابت کرنا ہے کہ اردو میں سائنسی علوم سما سکتے ہیں، سما گئے ہیں اور اگر کام بڑے پیمانے پر جاری رکھا جائے تو نئے سے نئے سائنسی علوم بھی سما سکتے ہیں۔ کبھی بورڈ بعض دوسرے علوم کی کتابیں بھی چھاپتا تھا مثلاً "بلوغ الارب فی لسان العرب"، "پنچ نامہ" بہت سی موثر اور دلچسپ کتابیں مگر ایک دور میں راقم الحروف اور جناب اشفاق احمد نے منتظمہ کے بزرگوں سے منوالیا اور حکومت سے بھی واضح ہدایت آگئیں کہ صرف سائنسی کتابیں ہی چھپیں گی۔ اس بورڈ کی مجموعی کارکردگی یقیناً قابلِ فخر ہو چکی ہے۔

حیوانیات

1۔ کرہ ارض کا حیوانی جغرافیہ، 2۔ میمیلیا، 3۔ پوری فیرا، 4۔ فائیلم آرتھرو 5۔ حائلہ آرتھرو پوڈا (اوناٹیکوفورا، ٹرائی لوبائیٹا، میریا پوڈا اور عنکبوتیے)، 6۔ نڈی کا ہضمی نظام (SYSTEM OF DESERT LOCUST (DIGF)، 7۔ پروٹوزوا، 8۔ جانوروں کے متعدی امراض، 9۔ جدید افزائش مویشیاں و دیہی معیشت، 10۔ پاکستان میں بھیڑ بکریوں کی

افزائش، 11۔ نظریہ جینیات، 12۔ پاکستان میں جنگلی حیات، 13۔ پاکستان میں تازہ پانی کی مچھلیاں، 14۔ جانوروں کی دلچسپ خصوصیات،

طبیعیات / کیمیا

15۔ مادے کی موجی نوعیت (WAVE NATURE OF MATTER)، 16۔ جدید طبیعیات (MODERN PHVSICS)، 17۔ طبیعی روشنی (PHYSICAL OPTICS)، 18۔ تابکاری، 19۔ کلیاتی توانائی، 20۔ تخلیقی رویے، 21۔ میکینکس، 22۔ موجیں اور اہتزازات (WAVES AND OSCILLATIONS)، 23۔ کوانٹم شماریات (QUANTUM STATISTICS)، 24۔ گیسوں میں سے برق کا ڈسچارج (DISCHARGE OF ELECTRICITY THROUGH GASES)، 25۔ مثبت شعائیں اور ایکسریز (POSITIVE X- RAYS AND X- RAYS)، 26۔ تھرموڈائنامکس (حرکیات) (THERMODYNAMICS) 27۔ طبیعی کیمیا (PHYSICAL CHEMISTRY)، 28۔ غیر نامیاتی کیمیا (INORGANIC CHEMISTRY)، 29۔ نامیاتی کیمیا (ORGANIC CHEMISTRY)، 30۔ عملی کیمیا، 31۔ عناصر، 32 برق و مقناطیسیت (ELECTRICITY AND MAGNETISM)، 33۔ سطحی کیمیا (SURFACE CHEMISTRY)، 34۔ طبیعیات کا ارتقاء (از آئن اسٹائن)، 35۔ دسٹی طبیعیات کے بنیادی تصورات، 36۔ نیوکلیائی طبیعیات کے بنیادی تصورات، 37۔ نگارش رنگیں کے طریقے، 38۔ آواز کے کرشمے،

ریاضی / شماریات

39۔ ابتدائی قیاسیات (TOPOLOGY)، 40۔ جدید مستوی محددی ہندسہ (MODERN PLANE COORDINATE GEOMETRY)، 41۔ ڈیٹرمنٹس اور میٹری سوں کا نظریہ (DETERMINENT AND MATRICS THEORY)، 42۔ علم الاحصاء تحلیلی ہندسہ،

نباتیات

43۔ برائیو فائٹا (BRYOPHYTA)، 44۔ ٹریڈو فائٹا (PTERIDOPHYTA)، 45۔ فنجائی اور مشابہ پودے، 46۔ معدومی نباتیات، 47۔ پاکستان کے درخت، جھاڑیاں اور بیلیں، 48۔ پودوں کی دنیا، 49۔ ادویات میں کام آنے والے پودے، 50۔ پاکستان کے درختوں کی اقسام

خرد حیاتیات

51۔ بنیادی خرد حیاتیات، 52۔ امراضی خرد حیاتیات، 53۔ خامرے، 54۔ انسانی جسم کا کنٹرول سسٹم کیا ہے،

فنی کتب

55۔ بنیادی ریڈیو الیکٹرانکس، 56۔ فن آہن گری، 57۔ نور تیگ موسیقی، 58۔ فولاد پر عمل حرارت، 59۔ ماڈل کمپیوٹر بنایئے، 60۔ رہنمائے تشریحات ریڈیو، 61۔ جدول برقیات، 62۔ کمپیوٹر کی بیسک پروگرامنگ، 63۔ الیکٹرونکس، 64۔ کمپیوٹر سائنس،

ہوم اکنامکس

65۔ پرورش اطفال اور خاندانی تعلقات، 66۔ غذا اور غذائیت، 67۔ مشروم اور غذائیت، 68۔ ذیابیطس کا علاج بذریعہ غذا،

نفسیات / عمرانیات

69۔ نفسیات (بنیادی موضوعات اور اطلاقی موضوعات)، 70۔ علم الانسانیات،

لغات / انسائیکلوپیڈیا

71۔ فرہنگ اصطلاحات (جلد اوّل) اے تا ڈی)، 72۔ فرہنگ اصطلاحات (جلد دوم) (ای تا او)، 73۔ فرہنگ اصطلاحات (جلد سوم) (پی تا زیڈ)، 74۔ قاموس مترادفات، 75۔ کمپیوٹر ڈکشنری، 76۔ اصطلاحات سیاسیات، 77۔ اُردو مترادفات، 78۔ اُردو کے خوابیدہ الفاظ، 79۔ اُردو بلوچی لغت، 80۔ اصطلاحات زراعت، 81۔ طبی

لغت اے تا بی، 82۔ فرہنگ بیطاری، 83۔ ابتدائی انسائیکلو پیڈیا، 84۔ انسائیکلو پیڈیا برائے کیمیا (جلد اوّل)، 85۔ انسائیکلو پیڈیا برائے کیمیا (جلد دوم)، 86۔ زرعی انسائیکلو پیڈیا، 87۔ گھریلو انسائیکلو پیڈیا، 88۔ جامع اللغات (دو جلد)، 89۔ جانوروں کا انسائیکلو پیڈیا (بچوں کے لیے)،

بنیادی سائنسی کتب

90۔ سوال یہ ہے نمبر 1، 91۔ سوال یہ ہے. نمبر 2، 92۔ پیسہ کیوں ایجاد ہوا (25 دلچسپ سوالات)

معلوماتی سائنسی کتابچے (باتصویر)

93۔ فن اور دستکاریاں، 94۔ ذرائع آمد و رفت، 95۔ صحت و صفائی، 96۔ ہمارا جسم کیسے کام کرتا ہے، 97۔ خلا میں سفر کے چھ سو سال، 98۔ عام لگنی بیماریاں، 99۔ نباتیات سے خوراک کا حصول، 100۔ ہماری ضرورت ہوا، خوراک اور خون، 101۔ مشہور ایجادیں، 102۔ نباتات، 103۔ خوراک کی حفاظت، 104۔ ہمارا نظام شمسی، 105۔ کائنات کو دوربین سے دیکھیے، 106۔ مقناطیس، 107۔ ایٹم، 108۔ خلائی سفر، 109۔ شہد کی مکھی، 111۔ پالتو جانور، 112۔ قسم قسم کی بطخیں، 113۔ بیکٹیریا ہمارے دوست ہمارے دشمن، 114۔ ہوا، 115۔ حرارت کیا ہے، 116۔ بجلی کیا ہے، 117۔ کشش ثقل کیا ہے، 118۔ سمندر کی دنیا، 119۔ ہوا کیا ہے، 120۔ ابتدائی طبی امداد، 121۔ زمین کیسے بنی،

تدریسی اسباق کے مختصر کتابچے

طبیعیات

122۔ حرکت اور قوت، 123۔ موجیں، 124۔ توانائی، 125۔ روشنی کا انعکاس (مستوی آئینے)، 126۔ ٹرگنومیٹری، 127۔ روشنی کا انعطاف (حصہ اوّل)، 128۔ روشنی کا انعطاف (حصہ دوم)، 129۔ روشنی کا انعکاس (کروی آئینے)، 130۔ روشنی (نوعیت و ترکیب)، 131۔ الیکٹرونیات (حصہ اوّل)، 132۔ الیکٹرونیات (حصہ دوم)

حیاتیات

133۔ بیکٹریا اور وائرس، 134۔ دورانِ خون، 135۔ سیل کی ساخت اور فعل، 136۔ زندگی اور اس کی ابتداء، 137۔ پیرا میشیم کی ساخت، 139۔ گردے کی ساخت اور فعل، 140۔ جاندار اور ان کے ماحول کا باہمی ربط، 141۔ ضیائی تالیف، 142۔ مائی ٹوسس، 143۔ فائیلم آرتھروپوڈا، 144۔ امیبا، 145۔ فائیلم پروٹوزوا، 146۔ مینڈک کا نظامِ تولید، 147۔ جانداروں میں خوراک کا حصول، 148۔ مینڈک کا نظام انہضام، 149۔ الجی اور فنجائی، 150۔ سرسوں کی جڑ کی اندرونی ساخت، 151۔ جانوروں کے افعال میں ربط، 152۔ پرندوں کی خصوصیات، 153۔ نیورون، 154۔ ٹرانسپریشن، 155۔ ارنڈ کے بیج کا اگاؤ 156۔ سیکس کروموسومز 157۔ می اوس، 158۔ ریفلیکس ایکشن اور ریفلیکس آرک،

کیمیا

159۔ پی ایچ سکیل، 160۔ عمل تحلیل، 161۔ کیمیائی بانڈ 162۔ تیزابوں اور اساسوں کی شناخت، 163۔ تیزابوں اور اساسوں کی طاقت، 164۔ نامیاتی کیمیا، 165۔ مدارچوں کی اقسام اور اشکال، 166۔ تیزابوں اور اساسوں کی تعدیل اور نمکیات، 167۔ محلولات کی ترکیب (مول کا تصور مولیریٹی)، 168۔ نائیٹروجن کا دور، 169۔ نائیٹروجن اور امونیا، 170۔ شورے کا تیزاب، 171۔ موصل اور غیر موصل اشیاء، 172۔ برق پاشیدوں کے آبی محلول، 173۔ آب پاشیدگی، 174۔ قلمیں اور قلمی ساخت، 175۔ مادے کی ذراتی نوعیت، 176۔ گیسوں کا حرکی نظریہ، 177۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ، 178۔ آگ بجھانے کے آلات، 179۔ ردرفورڈ کا جوہری ماڈل، 180۔ بوہر کا جوہری ماڈل، 181۔ برق پاشیدگی، 182۔ برق پاشیدے اور غیر برق پاشیدے، 182۔ بناسپتی گھی، 183۔ عنصر آمیزہ اور مرکب، 184۔ کیمیائی توازن، 185۔ طبیعی مقداریں ناپنے کے آلات، 186۔ شرح تعامل پر اثر انداز ہونے والے عوامل، 187۔ حل پذیری، 188۔ گندھک استخراج، خواص استعمالات، 189۔ تیزاب اور اس کے متعلق نظریات، 190۔ دوری جدول، 191۔ نمکیات کی تیاری،

192۔ ہائیڈروجن۔ تیاری، خواص، استعمالات، 193۔ ملمع کاری، 194۔ سلفر ڈائی آکسائیڈ تیاری خواص، استعمالات، 195۔ کلورین۔ تیاری، خواص، استعمالات، 196۔ چینی، 197۔ دو طرفہ تعامل، 198۔ آکسیجن۔ تیاری، خواص، استعمالات، 199۔ فاسفورس۔ استخراج، خواص، استعمالات، 200۔ عمل قلماؤ سے خالص اشیاء کی تیاری، 201۔ کیمیائی طریقے سے پانی کی صفائی،

ریاضی

202۔ کارتیسی حاصل ضرب، 203۔ قالبوں کی ضرب، 204۔ مثلثوں کا تماثل، 205۔ دو مثلثوں کا تماثل، 206۔ قالبوں کی جمع، 206۔ مستوی کی تحویلات، 208۔ لوگرتھم، 209۔ ثنائی ربط، 210۔ سمتیات، 211۔ یک درجی ہم زاد مساواتوں کا حل، 212۔ قائمۃ الزاویہ مثلث کا حل، 213۔ ترقیم سیٹ ساز، 314۔ حقیقی اعداد کا تصور، 215۔ قوت نما کے قوانین (حصہ اول)، 216۔ قوت نما کے قوانین (حصہ دوم)، 217۔ تناسب، 218۔ حقیقی اعداد کی برابری کے خواص، 219۔ غیر مساوات، 220۔ قوت سیٹ کا تصور، 221۔ زاویہ، 222۔ جیومیٹری کے چند اصول موضوعہ، 223۔ تغیر اور اس کی اقسام، 224۔ جیومیٹری کے بنیادی عناصر، 225۔ زاویوں کی اقسام، 226۔ یونین اور تقاطع کی وضاحت بذریعہ وین اشکال۔

انتخاب کے باوجود یہ فہرست طویل ہو گئی مگر اس سے راقم کا موقف جو قومی مفاد میں ہے تقویت پاتا ہے۔ اس تمام اصطلاحات امتیادالات سازی میں مختلف ماہرین کی محنت شامل ہے جنھوں نے اکثر و بیشتر ان اصولوں کو سامنے رکھا ہے جن پر وضع اصطلاحات کے باب میں کئی مکاتبِ فکر کا اتفاق ہے لیکن ہم سبھی کے لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ آسان زبان میں ہیں۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ اکثر اصطلاحات انگریزی بھی انگلستان، امریکہ، آسٹریلیا، کہیں کے بھی نہ صرف عام آدمی بلکہ علوم متعلقہ سے ناوابستہ خاص آدمی کے لیے اجنبی اور غریب ہوتی ہیں۔ انھیں صرف متعلقہ شعبے کے طالب علم، اساتذہ اور ماہرین ہی سمجھ سکتے ہیں اور وہی استعمال کرتے ہیں۔

اُردو سائنس بورڈ کے محولہ بالا ترجمے اور وضع کردہ اصطلاحات تو بہرحال ایک ایسے ادارے کے زیر اہتمام چھپے ہیں جو سرکاری ہوتے ہوئے بھی سرکاری استناد دہی کا درجہ نہیں رکھتا۔ (سرکاری استناد قانون کے مطابق مقتدرہ قومی زبان ہی کے زیر اہتمام حاصل ہوگا) مقتدرہ قومی زبان کی ایک اپنی اشاعت ملاحظہ ہو "اصطلاحات ریاضی" (مطبوعہ 1984ء) (افسوس کہ اردو سائنس بورڈ کے ناشرین یا مقتدرہ کے ناشرین ایسی مطبوعات میں الفاظ کی تعداد نہیں بتایا کرتے، راقم نے خود اوسط سے جمع نکالی ہے (یہ دو سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ الفاظ کا اوسط فی صفحہ 28 اور اس طرح اس میں کل 6160 اصطلاحات کے ترجمے امتبادلات/اصطلاحات ہیں۔ ان پر خود مقتدرہ کی ذیلی مجلس نے 1982ء سے 1983ء تک کام کیا۔ عرضِ ناشرین میں جن ماہرین کا ذکر کیا گیا ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ ڈاکٹر ناظم حسین زیدی، صدر شعبۂ ریاضی، جامعہ کراچی

2۔ ڈاکٹر آصف قریشی، استاد شعبۂ ریاضی، جامعہ کراچی

3۔ جناب راشد کمال انصاری، استاد شعبۂ ریاضی، اُردو سائنس کالج، کراچی

مسودے پر نظر ثانی کے لیے ان حضرات نے کام کیا۔

1۔ جناب محمد انور بھٹی، صدر شعبۂ فلکیات، جامعہ کراچی

2۔ پروفیسر خادم علی ہاشمی، مرکزی تحقیق و ترقی نصاب، لاہور

3۔ پروفیسر ڈاکٹر خالد لطیف میر، شعبۂ ریاضی، جامعہ پنجاب

بقول ناشر حتمی نظر کے لیے مسودہ (ہمارے نامور بزرگ اور سابق شیخ الجامعہ سندھ) جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (کنوینر مجلسِ اصطلاحات) کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ انھوں نے بعض مقامات پر ترامیم کیں اور بعض مقامات پر ترجمے سے اختلاف کیا۔ جہاں اختلاف واضح شکل اختیار کر گیا ہے وہاں صدیقی صاحب کا مجوزہ ترجمہ متبادل ترجمہ نشان (الف) کے بعد دے دیا گیا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب نے مسودے پر تکمیلی نظر ڈالی اور اصطلاحات ریاضی طباعت کے لیے تیار ہو گئیں۔

مانا کہ مقتدرہ نے انھیں سرکاری درجہ استناد نہیں دیا نہ اس مسئلے پر عرض

ناشر میں کوئی گفتگو ہے لیکن کیا اب استاد کے لیے ہم کہیں باہر سے اُردو والے درآمد کرنے کے انتظار میں رہیں گے۔ استاد بھی تو انہی اور ایسے ہی ماہرین سے ملے گا۔ راقم تو اسی کتاب کو ایک "کوشش" نہیں، فوری استعمال کے لیے ایک "منظور شدہ" دستاویز قرار دینے پر تیار ہے۔ لفاظ کے بعد وقت اور استعمال کے مختلف مدارج کچھ تبدیلیاں اور ترقیاں ضرور کریں گے (اضافے تو ہوتے ہی رہتے ہیں) لیکن ان کے نفاذ میں آج کیا سدِ راہ ہے؟ وہی رویّہ، رویّے، حالات، جن کا ذکر باب اوّل میں کچھ تفصیل کچھ اجمال کے ساتھ ہوا ہے۔

واضح رہے کہ ان اصطلاحات میں سے بیشتر راقم کے لیے بالکل اجنبی ہیں؟ اس لیے کہ راقم ریاضی کا خصوصی طالب علم نہیں گو ایک تعداد کا مفہوم فوراً سمجھ میں بھی آتا ہے کیوں کہ انگریزی میں ان کا روزمرّہ استعمال ہے اور جونہی وہ مفہوم اُردو میں جھلکے فوراً ذہن میں آ رہا ہے۔

مثلاً ملاحظہ ہوں، "آسان" حرف A سے

مطلق	ABSOLUTE
مخفف	ABRIDGED
مہمل	ABSURD
شریک	ADJUCGATE
اجتماع۔ مجموعہ	AGGREFATION
الجبرا تو ہمارا ہی لفظ ہے	
ادل بدل	ALTER NATION
زاویہ	ANGLE
حساب پیما	ARITHMOMETER
قوس	ARC
اوسط کرنے کا عمل (شاید عمل اوسط بہتر رہتا)	AVERAGING

محور AXIS

امدادی AUXILIARY

ان اصطلاحات کے لیے دونوں باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ "آیئے استعمال کی عادت ڈالیں"، "سمجھ میں نہیں آتیں" یہ وہ مکتب کہے گا جو تحتِ شعوری طور پر انگریزی زدہ ہو چکا ہے قومی زبان میں علم قبول کرنے پر تیار ہی نہیں اس مکتب کے سامنے ایک نہایت معروف قانونی اصطلاح پیش کر دی جائے جو کوئی سو برس سے زیرِ استعمال ہے تو وہ اسے بھی غریب اور ناقابلِ فہم قرار دے گا۔ وہ اصطلاح ہے "ازالہ حیثیتِ عرفی" یہ قانون فوجداری و دیوانی میں شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد کا ترجمہ ہے۔ انگریزی لفظ DEFAMATION تھا۔ اگر آج اس کا ترجمہ از سرِ نو زیرِ بحث لایا جائے تو دو چار نہیں سیکڑوں مکاتبِ فکر پیدا ہو کر مجوزہ ترجمے کو مشکل، نا مکمل، ناقابلِ تفہیم، نہ جانے کیا کچھ قرار دے سکتے ہیں مگر یہ ترجمہ لوہا لاٹ بن کر کھڑا رہا اور آج بھی عدالتوں اور صحافیانہ تحریروں میں استعمال ہو رہا ہے۔

سارا قصہ یہ ہے کہ پوری طرح غور کر کے نافذ اور استعمال کی جائیں تو بہت جلد "غیر علمی" اصطلاحیں روزمرہ بن جاتی ہیں اور علمی، فنی اصطلاحیں متعلقہ حلقوں میں مستعمل..... ہمارے اراکینِ مقتدرہ یہ چاہیں کہ ہر اُردو اصطلاح انھیں "آسان" لگے تو وہ ناممکن ہے کیوں کہ وہ یا دوسرے بہت اچھے انگریزی داں ان انگریزی اصطلاحوں کو بھی نہیں سمجھ سکتے جو مخصوص شعبوں مثلاً طب، کمپیوٹر ٹیکنالوجی، فلکیات، خلائیات، جینیات میں رائج ہیں۔ علمی اصطلاحات کی تشکیل و تعبیر سمجھنے کے لیے کسی متعلقہ شعبے سے متعلق نہ صرف پہلے دوسرے بلکہ تیسرے چوتھے اور اعلیٰ تر مدارج کا علم ضروری ہوتا ہے۔ میں پچھلے چالیس برس سے دیکھ رہا ہوں کہ انگریزی پسند اراکینِ مقتدرہ متعلقہ علم سے ذرا بھی واقفیت رکھے بغیر اس کی اُردو اصطلاحات کو HEAVY اور ناقابلِ فہم کہہ کر مذاق اُڑاتے رہے ہیں۔ اسی ذہنیت نے عام ہو کر روزمرہ کے نہایت آسان متبادلات کو بھی راندۂ درگاہ کر رکھا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس ذہنیت نے عام کاروبارِ زندگی میں بھی قومی زبان کا رواج مجروح کر دیا ہے۔

اکثر لوگ، بطورِ خاص اراکینِ مقتدرہ، اس بات سے واقف نہیں کہ اُردو زبان

میں معاشیات کی سب سے پہلی طبعزاد تصنیف علامہ اقبال نے کی تھی (گو ان سے پہلے بعض ترجمے ہو چکے تھے) اور معاشیات کی اُردو اصطلاحیں خود وضع کی تھیں گو وہ عدم استعمال اور جدید تقاضے بدل جانے کے سبب آج متروک ہیں۔ حیدر آباد (دکن) میں مجلس وضعِ اصطلاحات کے اچھے خاصے کارنامے بھی عدم استعمال اور معاشی تغیرات کی نئی اظہار طلبی سے تقریباً متروک ہو گئے۔ (اگر استعمال میں رہتے تو معاشی تغیرات ان میں ترمیمیں بھی لاتے رہتے۔ خلا میں کچھ نہیں ہوتا) خود ہماری اپنی ابتدائی کوشش "اصطلاحات بینکاری" جس کا ذکر آ رہا ہے آج کے حالات میں جدید خطوط پر آسان فہم ترجمانی نہیں کرتی۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ اُردو کی اصطلاحات نہ غیر متناسب طور پر معرّب ہوں نہ مفرّس ..... مغرب کی وہ اصطلاحات جو مدتوں سے ہمارے ہاں عوامی سطح پر رائج ہو چکی ہیں۔ مثلاً:

بینک

ٹینڈر

چیک

فنڈ

سنڈیکیٹ

نوٹ

ڈرافٹ

ان کو فی الحال (یا مستقلاً بھی) ایسے ہی رہنے دیا جائے۔ لیکن ایسی اصطلاحات اور الفاظ کم ہیں جب کہ شعبۂ بینکاری ایک برّ "گو مسلسل پھیلتا ہوا" مجموعہ لُغات و اصطلاحات، مترادفات، متبادلات طلب کرتا ہے۔ ہماری یہ گیارہ ہزار کے قریب اصطلاحات اسی ضرورت کے پیشِ نظر وضع و جمع کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں محولہ بالا ماخذات بطور استفادہ سامنے رکھتے ہوئے پانچ کتابیں بھی سامنے رکھی گئیں۔

"بینک ہائے عوام"

"دیہاتی بینک"

(انھیں اس صدی کی تیسری دہائی میں پنجاب کوآپریٹو یونین نے شائع کیا تھا

اور یہ امداد باہمی انجمنوں کو فروغ دینے کے لیے شائع کی گئی تھیں۔

"ہمارے بینک"

از

جناب محمد احمد سبزواری

مطبوعہ 1942ء

"اسلام اور سود" (1947ء)

از

ڈاکٹر انور اقبال قریشی (مرحوم)

(موصوف اس اشاعت کے مؤلف جناب محمد احمد سبزواری کے استاد بھی تھے)

(یہ کتاب ایک ہمہ گیر تصنیف تھی اور بہت مقبول بھی ہوئی۔ اس کے ترجمے انگریزی، عربی، ترکی میں بھی شائع ہوئے تھے کیوں کہ اس میں سود اور بیت المال کے اسلامی تصورات پر بحث کی گئی تھی)

1943ء میں انجمن ترقی اُردو ہند نے بابائے اُردو کی نگرانی میں "اصطلاحاتِ پیشہ وراں" کی جو ساتویں جلد شائع کی اس میں بینکاری سے متعلق کئی ایسی اصطلاحات جمع و وضع کردی گئی تھیں جن میں سے بعض آج بھی اسی شعبے کے کھاتہ داروں میں مروج ہیں مثلاً: آڑھت، بیوپار، بیجک، دیوالا، چالو مہلت، حوالہ، گھاٹا، گروی، صراف، بٹہ، بکری، مجرائی، ہُنڈی، ٹوٹ پھوٹ، لین دین، معافی.....

1951ء میں ہماری پہلی "اصطلاحاتِ بینکاری" شائع ہوئی جس کی تجویز بینک دولت پاکستان کے پہلے گورنر جناب زاہد حسین (مرحوم) نے کی تھی دراصل وہ بینک دولت پاکستان کی سالانہ رپورٹیں اُردو میں شائع کرنے کے حامی تھے تاکہ اس کے مندرجات کو پاکستانی عوام بھی سمجھ سکیں جن کا یہ حق بھی تھا (اور آج بھی ہے) اور ان کا ذہن معیشت پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہوتا رہے لیکن بوجوہ نہ پوچھیں ان وجوہ میں فرہنگ اصطلاحات کی عدم موجودگی بڑی وجہ بتائی جاتی ہے ......

جب کہ کم از کم اس رپورٹ کی زبان اُردو ہو سکتی تھی اور جہاں جہاں ممکن تھا انگریزی الفاظ کے ساتھ کچھ نہ کچھ اُردو مترادفات سے ابتدا کی جاسکتی تھی جیسا کہ برسوں سے

وفاقی بجٹ کے معاملے میں ہو رہا ہے) بہر حال زاہد حسین صاحب مرحوم کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے انھوں نے اپنی تجویز بابائے اُردو کے سامنے رکھی اور انھی کی ہمت افزائی سے بابائے اُردو نے انجمن کے اس کٹھن دور میں بھی (جس کا ذکر "اُردو کا المیہ" اور "انجمن کا المیہ") ان کے دو کتابچوں میں موجود ہے یہ منصوبہ قبول کر کے مذکورہ بالا کتاب مرتب کرائی۔ جناب محمد احمد سبزواری اس وقت انجمن کے سہ ماہی جریدے ("معاشیات") کے مدیر تھے۔ انھوں نے کام کیا اور مولوی صاحب نے نگرانی اور نظرِ ثانی ...... اس کے ایک برس بعد زاہد حسین صاحب کی سربراہی میں ہی بینک دولتِ پاکستان کی سالانہ رپورٹ اُردو میں پیش کی، اس کا ترجمہ بھی سبزواری صاحب نے کیا تھا۔

بہر حال 88۔ 1951ء کے دوران کچھ کتابیں نجی شعبے نے پیش کیں جو اضافی ضروریات میں بھی کام آئیں۔ ان میں شیخ عطا اللہ صاحب کی دو کتابیں "زر" اور "بینک داری" تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔

78۔ 1980ء میں بلا سود بینکاری پر مباحثے اور مذاکرے شروع ہوئے۔ وزارت خزانہ میں کئی مہینے تک سرکاری مالیاتی اداروں اور قومیائے ہوئے بینکوں کی کانفرنسیں منعقد ہوتی رہیں۔ اتفاق کہ منصبی ذمہ داریوں کے سبب راقم کو بیشتر کانفرنسوں میں شریک ہونے کا موقع ملتا رہا اور اسی دوران وفاقی بجٹ تقریر اردو میں ہونے لگی۔ (راقم اس کی اُردو اصطلاحوں سے کم کم متفق ہوتا تھا کیوں کہ محترم وزیر خزانہ (موجودہ صدر مملکت عزت مآب جناب غلام اسحاق خان) بیشتر اصطلاحوں کے لیے عربی سے اشتقاق پر مُصر رہتے تھے اور چونکہ خود ایک فاضل شخصیت اور قدیم مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے وہ بہت آسانی مشکل سے مشکل انگریزی اصطلاحات کے متبادلات وضع کر لیتے تھے جب کہ راقم فارسی مترادفات کی تلاش بہتر جانتا تھا اور انگریزی الفاظ تک استعمال کرنے کے خلاف نہ تھا۔ بہر حال ان کے میزانیہ خطبات نے مالیاتی شعبے کو بہت سے جامع متبادلات، مترادفات اور اصطلاحات فراہم کیے ہیں۔

اسی دوران راقم نے زرعی ترقیاتی بینک، حبیب بینک اور نیشنل بینک سے

کچھ معلوماتی کتابچے شائع کرائے۔ کئی بینکوں کے اپنے گھریلو جرائد بھی پابندی سے شائع ہونے لگے۔ (گو ان میں بینکاری سے متعلق اصطلاحات کم آتی ہیں مگر آتی ہیں اور عملے میں رواج پاتی ہیں۔) نیشنل بینک کے ایک سابق سینیئر ایگزیکٹیو وائس پریذیڈنٹ جناب عبدالعلیم شیر کوٹی کی سرپرستی میں ایک نجی ماہنامہ "بینکاری" بڑے زور و شور سے جاری ہوا اس میں بینکاری کی نظری اور عملی تعلیم تھی اُردو میں نہایت مفید مضامین تسلسل سے آتے تھے۔ اسی میں راقم کی مدت ملازمت تک نیشنل بینک کے ایک فاضل شریک کار (حال وائس پریذیڈنٹ) جناب ہارون احمد زبان اور اصطلاحات کے معاملے میں مسلسل رضاکارانہ اور نہایت محنت کے ساتھ توجہ دیتے رہے۔ یہ جریدہ اب بھی شائع ہوتا ہے۔ تقریباً سبھی بڑے بینکوں کے اپنے اپنے اسٹاف کالجوں کے ساتھ پاکستان بینکرز ایسوسی ایشن ("ادارہ بینکاران پاکستان") کی مدد سے بینکاروں کو جو لیکچر دیے جاتے ہیں وہ انگریزی کے ساتھ اُردو میں بھی ہوتے ہیں۔ اس ادارے کا جریدہ تا حال صرف انگریزی میں شائع ہوتا ہے لیکن اُردو میں "پاسبانِ بینکاری" کے عنوان سے ایک نہایت مفید کتاب شائع کی ہے جس میں ممکنہ جعل سازی اور فریب کاری کے حوالے اور حفاظتی اقدامات پر بڑا دلچسپ مواد موجود ہے۔

مگر ان تمام کوششوں میں علامات و متبادلات کی یکسانیت نہیں، ہر ادارہ، ہر مضمون نگار، اپنی اپنی صوابدید سے کام لیتا ہے کیوں کہ تا حال اصطلاحات بینکاری کا کوئی جدید خطوط پر مرتب مجموعہ موجود نہ تھا۔ ہماری پہلی کتاب مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ اب متروکات میں شمار ہونے لگی تھی۔

اس تناظر میں موجودہ صدر انجمن جناب نورالحسن جعفری نے تحریک کی کہ انجمن کی اوّلین کوشش کو جدید خطوط پر تازہ کیا جائے اور از سرِ نو ایک فرہنگ اصطلاحات مرتب ہو۔ وہ خود ایک پیشہ ور ماہرِ مالیات رہ چکے ہیں اور بینکاری کے ایک مخصوص شعبہ سرمایہ کاری میں مشہور سرکاری ادارے "این آئی ٹی" کے سربراہ کی حیثیت سے نئے تقاضوں، مشکلات اور امکانات کا بھرپور احساس رکھتے ہیں۔ یہ اشاعت دراصل انہی کی تشویق و ترغیب کا ثمر ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے بینک

دولتِ پاکستان کے گورنر جناب آئی۔ اے۔ حنفی، پاکستان بینکنگ کونسل اور تجارتی بینکوں کے سربراہوں سے مذاکرات بھی کیے۔ سب نے ان کی تحریک کی تائید کی ہے عملی تائید کس حد تک کریں گے یا کر سکیں گے یہ وقت بتائے گا۔ توقع ہمیں مثبت ہی رکھنی پڑے گی.....

ہماری خوش قسمتی کہ ہمیں اس مضمون کے مستند ترین اور اولین کارکن جناب محمد احمد سبزواری کا تعاون حاصل ہوگیا۔ یہ ہماری خوش قسمتی کے علاوہ ایک اتفاق اور تاریخ بھی ہے کہ یہ سہرا بھی جناب سبزواری کے سر بندھا ہے۔

اب اس لائحہ عمل کا اختصاریہ جسے اس تالیف کے لیے اختیار کیا گیا اور جس میں دیگر معاونین کے حوالے بتائیں گے کہ سبزواری صاحب نے یہ کام تمام ممکنہ تبادلۂ خیال کرتے ہوئے پورا کیا ہے جس کے سبب اسے راقم کی ناچیز رائے میں زیادہ سے زیادہ درجہ استناد حاصل ہو چکا ہے۔ یہ اختصاریہ خود سبزواری صاحب کی ان کوششوں کے تفصیلی بیان سے مستفید ہوا ہے جن کا راقم نے درجہ بدرجہ خود بھی مشاہدہ کیا.....

اس ذیل میں سب سے پہلا کام اصطلاحاتِ بینکاری کی یک جائی تھی۔ جدید بینک کاری کا علم اس قدر وسیع اور اس کا دائرہ کار اس قدر پھیل گیا ہے کہ اس میں معاشیات، مالیات، تجارت، صنعت، زراعت، حساب داری، بیمہ کاری، قانون وغیرہ کی کثیر اصطلاحیں مروج ہیں۔ اگر ان سب کو موجودہ فرہنگ میں شامل کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس کی ضخامت بہت بڑھ جاتی لہٰذا صرف ایسی اصطلاحات پر اکتفا کیا گیا جو بینکاری میں بالعموم مروج اور بینکاری کی فرہنگوں میں درج ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ملک کے تمام اہم بینکوں اور مالی اداروں سے رابطہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ بینک دولت پاکستان کے شعبہ تحقیق اور تعلقات عامہ اور چیف لائبریرین نیشنل بینک آف پاکستان کے فنانس ڈویژن کے سینیئر وائس پریذیڈنٹ، اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ لائبریری، قومی بینکار کے مدیر، یونائیٹڈ بینک کے سینیئر وائس پریذیڈنٹ فنانس، ادارہ بینک کاران پاکستان کے مجلّہ کے مدیر اور دیگر بینکوں کے تجربہ کار افسران سے تبادلہ خیال کیا گیا۔ ان حضرات نے نہ

صرف اپنی قیمتی آرا سے نوازا بلکہ اپنے اپنے اداروں کی منتخبہ مطبوعات اور بینکاری کے عوامی شعبوں میں مروجہ فارم بھی فراہم کیے تاکہ ان سے اصطلاحات کو یکجا کرنے میں آسانی ہو جائے نیز انھوں نے اپنی لائبریریوں میں تحقیق کی سہولتیں بھی فراہم کیں۔ تمام اہم اصطلاحات کو کارڈوں پر لکھ لیا گیا اور انتخاب کا طریقہ کار یہ قرار پایا:

1۔ خاصی حد تک انجمن کی پہلی فرہنگ کو بھی بنیاد بنایا گیا اور اس کی کم و بیش ساری اصطلاحات (ماسوائے ان چند کے جن کا یا تو بینکاری سے بظاہر کوئی تعلق نہ تھا جیسے "پلنگ" (ڈاٹ یا پیر) یا جو آسان تھیں جیسے "کارڈ" یا "کلرک" لیکن ان کی بھی مرکب اصطلاحیں لے لی گئیں جیسے "کارڈ انڈیکس" یا "کلریکل اسٹاف" وغیرہ)

2۔ بینک دولت پاکستان کی سالانہ انگریزی رپورٹوں کی جملہ رواں اصطلاحات (خصوصاً 82۔81ء سے 87۔1986ء تک)

3۔ A Dictionary of Banking by F.E.Perry, 1987

کی عام اصطلاحات ماسوائے ان کے جن کا تعلق مقامی تھا۔

4۔ Banking in India by Khaja Shoeb Hasan edited by L.N. Blythe, Macdonald & Evens, Estover, Plymouth

5۔ The Penguin Dictionary of Economics by Graham Bancock et ail (Second adition)

6۔ Dictionary of Banking and Finance by Derrick G.Harson, Pitman

7۔ Banking and Financial Service by Jerry M.Rosenberg, Second edition John Willey & Sons, New York

8۔ Monthly Economic Letter, National Bank of Pakistan Karachi (various issues)

(4 سے 8 تک منتخبہ اصطلاحات)

اصطلاحات منتخب کرنے کے بعد ان کے مترادفات کی تلاش تھی، اولاً مندرجہ ذیل سے استفادہ کیا گیا:

1۔ فرہنگِ اصطلاحات بینکاری، شائع کردہ انجمن ترقی اُردو

2۔ بینک دولت پاکستان کی سالانہ اُردو رپورٹوں کا متن اور فرہنگ 1984ء تا 85ء تک)

3۔ فرہنگِ اصطلاحات، معاشیات، تجارت، بینکاری۔ جامعہ کراچی، 1972ء

4۔ دفتری اصطلاحات و محاورات کی لغت۔ مجلس زبان دفتری پنجاب۔ 1976ء

5۔ پاسبان بینکاری۔ ادارہ بینک کاران پاکستان 1983ء

6۔ ماہ نامہ "بینکار" کراچی (ابتدائی ڈھائی سال کے جریدے) اور قومی بینکار کی ایک سال کی مجموعی مسل

مترادفات منتخب کرتے وقت مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھا گیا:

(الف) مترادفات زیادہ ثقیل اور بھاری بھرکم نہ ہوں۔

(ب) جہاں تک ممکن ہو مترادفات سادہ ہوں چنانچہ ہم نے قلیل المیعاد کے بجائے قلیل میعاد یا کم مدتی، طویل المیعاد کے بجائے طویل مدتی، عندالضرورت کے بجائے حسب ضرورت، پرچہ ادخال رقم (جمع پرچی)، ھبوط (سرد بازاری)، کرگیری (سائز)، صیرفی (صراف)، تقلیل حاصل (گھٹتی پیداوار) جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

(ج) ایسے الفاظ جن کا عام مفہوم اور اصطلاح تقریباً ہم معنی ہے اس کے لیے وہی لفظ یا الفاظ استعمال کیے ہیں جو عام طور پر مروج ہیں۔

(د) بعض مرکب اصطلاحیں ہمارے ہاں پہلے سے موجود ہیں جیسے متروکہ جائداد اسی طرح متروکہ ذخائر، متروکہ اراضی، متروکہ عطیہ اصطلاحیں بنائی ہیں۔

(ہ) CALCULUS کا ترجمہ بعض لوگوں نے "حساب التکامل و التفاضل" کیا حالانکہ اس کا بہت پرانا ترجمہ "احصا" موجود ہے۔ ہم نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور ایسی ہی دوسری قدیم اصطلاحات کو قبول کرلیا ہے۔

(و) بہت سی جدید اصطلاحوں کے مترادفات کہیں نہیں ملتے وہ ان ہی اصولوں کی روشنی میں وضع کیے گئے ہیں۔ لیکن کوشش کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ جملہ مترادفات آسان ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں بھارت کے ترقی اُردو بیورو کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ یہ ادارہ چند سال قبل ہی اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ مختلف علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرے اور اصطلاحات وضع کرے مجھے ان کی نباتیات کی فرہنگ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں انھوں نے CELL کا ترجمہ "خلیہ" کیا ہے اور اس سے 40 اصطلاحیں بنائی ہیں جن میں خلوی امتیاز، خلوی افتراق، خلوی استخراج، خلوی اصناف، خلوی نواۃ، خلقی تکسید جیسے مرکبات شامل ہیں۔ اسی طرح (CANDEX) کا ترجمہ "ساق" کیا ہے اور اس سے ساقوی، ساق دار، ساقچہ، ساق پاش، ساق نما، ساقرم جیسے 22 الفاظ بنائے ہیں۔ (اسی بیوریو نے فرہنگ معاشیات بھی شائع کی ہے جو مجھے نہ مل سکی)۔ ایسی صورت میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ "جب ہم بدیسی زبان کی مشکل اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں تو اُردو کی مشکل اصطلاحوں کے استعمال میں کیوں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔"

یہ فرہنگ تین سال پہلے مکمل ہو گئی تھی مگر صدر انجمن کی خواہش تھی کہ اس پر کوئی بینکار نظر ڈال لے۔ متعدد حضرات سے رجوع کرنے کے بعد جناب خادم حسین صدیقی سابق صدر الائیڈ بینک آف پاکستان نے (جو فی الوقت ادارہ بینک کاران سے منسلک ہیں) اس خدمت کو قبول فرمالیا۔ آپ نے بڑی ذمہ داری اور دیدہ ریزی سے اے سے ایم تک کی اصطلاحات پر نظرثانی فرمائی۔ ان کی یہ کاوش اس وجہ سے اور قابلِ تحسین ہے کہ وہ عملی بینک کار رہ چکے تھے۔ اور اصطلاحات کی باریکیوں اور رموز سے واقف تھے، مگر چند ماہ بعد ادارے نے کچھ مزید ذمہ داریاں ان کے سپرد کردیں اور وہ اس کام کو مکمل نہ کرسکے، تاہم انجمن ان کی ممنون ہے۔

"نظرثانی" تو راقم کا منصب نہیں تھی مگر راقم نے اپنی بساط کے مطابق تمام اندراجات پر، گو وقفے وقفے سے، نظر ڈالی اور ان بہت سے پیشہ ور سابق و حاضر شرکائے کار سے تفصیلی مشورے کیے ہیں جن کی فہرست اسماء خاصی طویل ہو سکتی

ہے۔ جزا انھیں اللہ دے گا ہم صرف شکریہ ادا کر سکتے ہیں۔

متفقہ رائے یہ ہے کہ جس طرح انگریزی اصطلاحاتِ بینکاری مرکب ہیں ان الفاظ سے جو مغرب (اور مشرق) میں باقاعدہ شعبہ بینکاری قائم نہ ہونے سے قبل رائج تھے، جو دوسرے معاشی شعبوں ہی میں نہیں سماجی زندگی میں، علمی زندگی میں بھی رائج تھے لیکن بینکاری کے فروغ اور ضرورت نے انھیں ایک دوسرے سے آمیز کر کے اس طرح اصطلاحات میں ڈھال دیا کہ آج وہ صرف اسی شعبے سے مختص ہو کر رہ گئے ہیں اس طرح سبزواری صاحب کی وضع و جمع کردہ اصطلاحات (جن کے باب میں انھوں نے ممکنہ مشورے بھی کیے) موجودہ حالات میں ایک قابلِ آزمائش ہی نہیں لائق قبول اظہار ہیں۔ وہ کہیں کہیں تو اجنبی یا مشکل لگیں گی کیوں کہ ہمیں انگریزی کی عادت ہو چکی ہے لیکن ایک تو اس وقت ان سے بہتر اصطلاحات نہ موجود ہیں نہ شاید وضع کی جا سکتی ہیں۔ ان کی غالب اکثریت آسان آمیزوں پر مشتمل ہے۔ عربی سے مشکل اشتقاق کی مشق بہت کم کی گئی ہے۔ انگریزی کو مفرس کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ انگریزی کے بعض اُردو میں مروجہ الفاظ بے تکلف لیے گئے ہیں۔ مثلاً ABSENTIA FEE (فیس عدم حاضری) (یہاں غیر حاضری سامنے آتا ہے مگر غیر حاضری اور عدم حاضری کا فرق اس پیشہ ورانہ تناظر میں بڑا اہم ہے اس لیے لفظ عدم استعمال کیا گیا ہے۔ فیس بلا تکلف انگریزی سے لیا گیا ہے) CHEQUEING ACCOUNTS

چیک دار حسابات

(یہاں چیک کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ "چیک والے" غیر علمی بھی ہے اور غلط نشاندہی کر سکتا ہے۔ اس لیے چیک دار رکھا گیا جو فوراً بہ آسانی سمجھ میں آ جاتا ہے)

بیشتر اصطلاحیں نہایت خوبصورت تخلیقی سطحوں کو چھو لیتی ہیں جب کہ مضمون انگریزی میں بھی مشکل ہے۔ مثلاً EQUILIBRIUM LEVEL OF NATIONAL INCOME قومی آمدنی کی توازنی سطح

بیشتر اصطلاحات ایسے رواں دواں دریاؤں کی طرح ہیں جن میں سفینۂ ذہن کسی الجھن، کسی رکاوٹ کے بغیر بہتا ہے اور مفاہیم میں ذرا گنجلک نہیں آنے دیتا۔

پاکستان میں شرح خواندگی کبھی 26 فی صد کبھی 34 فی صد کبھی 18 فی صد اور حقیقی خواندگی دس فی صد کہلاتی ہے۔ اگلی صدی آتے آتے بہترین سرکاری کوششوں کے باوجود محکم اندازے یہ ہیں کہ بہت بڑھی تو چھیالیس فی صد ہو جائے گی۔ جب صرف بنیادی خواندگی کا معاملہ یہ ہے تو عام آدمی کا غیر زبان انگریزی تک پہنچنا اور اس کے بعد انگریزی اصطلاحاتِ بینکاری کو سمجھنا شاید پچاس برس اور لے جب کہ بینکاری کا ناگزیر پھیلاؤ زیادہ سے زیادہ عوام کو اس سے وابستہ کر رہا ہے اور کرتا رہے گا تو کیا اصطلاحاتِ بینکاری کو اگلے ساٹھ برس تک کسی مخصوص طبقے کا اجارہ رکھا جائے جو عام آدمی کو اس شعبے سے متعلق بنیادی معلومات اور تفہیم سے محروم رکھے؟ ایسا کرنا تو قومی اقتصادی ترقی میں سخت حارج ہوگا...

بہرحال یہ نادر گو انتہائی ضروری مجموعۂ معلومات، "فرہنگِ اصطلاحاتِ بینکاری" اب اس اُمید کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ متعلقہ حلقے اس پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے اور بینک جس حد تک ممکن ہے اپنے طور پر انہیں اپنی تربیت گاہوں، دفاتر اور کھاتہ داروں کے لیے عام کر کے دیکھیں گے کہ کیا ردِ عمل اور کیا عملی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

رہی حکومت تو موجودہ حالات میں اس کے افسران سے بھی توقع ہے اور وزراء سے بھی کہ کم از کم ایک آزمائش کا موقع ضرور دیا جائے گا کہ اس کے سامنے ایک مسئلہ عام نفاذِ اُردو تو ہے ہی، قومی اقتصادی ترقی کا بھی ہے۔ قومی اقتصادی ترقی مالیاتی پھیلاؤ سے بھی وابستہ ہے اور مالیاتی پھیلاؤ کے لیے عام خواندہ پاکستانی کی مالیاتی معاملات بشمول بینکاری کی راست تفہیم ایک لازمہ ہے۔ بینک افسران کی تفہیم عام آدمی کی تفہیم میں معاون ثابت ہوگی۔ آہستہ آہستہ اُردو اصطلاحیں بینک افسر اور کھاتہ دار کا روزمرہ بن سکتی ہیں اور کاروبار میں نہایت آسانی کے ساتھ سوچنے سمجھنے کے ساتھ ایک تخلیقی عمل بھی شروع ہو سکتا ہے۔

انجمن جناب محمد احمد سبزواری کا شکریہ کیسے ادا کرے؟ وہ تو اس شعبے میں خود ہی انجمن رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں تا دیر سلامت رکھے۔ وہ نہ صرف انجمن، نہ صرف قومی زبان بلکہ پاکستان میں قومی یکجہتی اور اس کی معاشی ترقی کی تاریخ میں ابھی سے

ایک ناقابلِ فراموش مقام حاصل کر چکے ہیں۔

1991ء

مرقع اقوال وامثال

عربی، فارسی، اردو، سندھی، پنجابی، پشتو

مرتب

سید یوسف بخاری دہلوی

پہلا ایڈیشن


MAAB 1431
maablib.org

شاید یہ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی اور سب سے زیادہ ضخیم کتاب ہے۔

فاضل مؤلف سید یوسف بخاری دہلوی مرحوم نے جتنا کام کیا وہ اصل متن سے بھی ثابت ہے۔ اوسطاً ۲۷ سطر فی صفحہ کے حساب سے ۹۵۴ صفحات پر تقریباً پچیس ہزار اندراجات..... پھر ۷ صفحات کا حرفِ گفتنی اور ۱۴ صفحات کا ایک نہایت فاضلانہ مقدمہ جن سے ان کی محنت اور جستجو کی جہتیں معلوم ہوتی ہیں۔ سید صاحب موصوف اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جسے قومی روایات کے مطابق شاہجہاں نے شاہجہاں آباد تعمیر کرتے وقت جامع مسجد دہلی میں امامت و تبلیغ کے لیے بخارا سے بلا کر دہلی میں آباد کیا تھا۔ یہ امامت آج بھی اسی خاندان کے پاس ہے۔ سید یوسف بخاری مرحوم شمس العلماء علامہ سید احمد بخاری کے قریبی عزیز تھے (وہ بڑے امام کہلاتے تھے ان کے صاحبزادے حمید میاں نے ان کی حیات میں ہی ان کی پیرانہ سالی کے سبب امامت شروع کر دی تھی۔ اب یہ منصب حمید میاں کے صاحبزادے سید عبداللہ بخاری کے پاس ہے۔ وہ شاہی امام کہلاتے ہیں اور آزادی کے بعد سے ہندوستان میں مسلم سیاست میں اپنے انداز کا ایک فعال کردار ادا کرنے میں معروف) انھوں نے درسی علم کے علاوہ بڑے بڑے بزرگان دہلی کی آنکھیں دیکھیں تھیں۔ جوانی سے ہی تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ محاورے پر تو کامل عبور رکھتے تھے۔ خوش حال تھے۔ پاکستان بنا اور دلی کے مسلمانوں پر ابتلا آیا تو انھیں بھی ہجرت کرنی پڑی۔ یہاں آکر ان پر جو گزری وہ ایک داستان ہے۔ کسی وقت اردو لغت بورڈ میں ملازم ہو گئے لیکن (غلط) ضوابط کے مطابق ساٹھ برس کی عمر میں ریٹائر بھی کر دیے گئے۔ برسبیل تذکرہ اردو لغت بورڈ نیم سرکاری ادارہ سہی ایک علمی ادارہ ہے۔ وہاں فضلا پر

ریٹائرمنٹ کے سرکاری ضوابط نافذ کرنا اور انھیں توسیع بھی نہ دینا ایک ظالمانہ پابندی ہے (جب بابائے اردو اس کے اعزازی مدیرِ اول مقرر ہوئے۔ ان کی عمر اسی سے زیادہ تھی) افسوس کہ بورڈ کے نظار مرکزی حکومت سے یہ ضابطہ بدلوانے میں ناکام رہے (ایک میقات کے لیے راقم بھی شامل نظما تھا) ڈاکٹر شوکت سبزواری جیسے فاضل اجل کو بھی اسی وجہ سے بورڈ سے رخصت ہونا پڑا تھا۔ بس حضرت جوش ملیح آبادی کے سلسلے میں شروع سے ہی استثنیٰ دیا گیا تھا۔ ان کی سبکدوشی کی وجوہ دوسری ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سید صاحب مرحوم نے سخت وقت گزارا، مگر بچے جوان ہو گئے تھے بہت سختی نہیں اٹھائی پڑی اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔

اس کتاب کی تیاری میں جتنا وقت لگا ہے۔ اس کا کچھ احوال "حرفِ گفتنی" میں موجود ہے۔ اشاعت میں جو تاخیر ہوئی اس کی ذمہ داری چند در چند حالات پر ہے، ہمارے حالات بہتر ہونے کے بعد ایک مرتبہ پھر دگرگوں ہو گئے۔ متن کی پہلی کتابت مثالی نہیں تھی۔ اغلاط سے پر تھا اور تقریباً ایک ہزار صفحے کی کتاب چھاپنا بجائے خود ایک مرحلہ تھا۔ اسی دوران سید صاحب نے انتقال کیا۔ ہم ان کی روح سے شرمندہ ہیں مگر وہ اس یقین کے ساتھ گئے کہ ان کی یہ کتاب چھپ کر رہے گی اور ان کی محنت اور فضیلت کا فیض مدت العمر کے لیے عام ہو کر رہے گا۔

جہاں تک راقم کی معلومات ہیں اردو میں اب تک کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی جس میں اردو کے اتنے محاورے، اقوال اور امثال دوسری زبانوں کے اتنے مترادفات کے ساتھ جمع کر دیے گئے ہوں اور یہ صرف ایک عددی یا مقداری امتیاز نہیں۔ انتخاب بھی خاصے کڑے معیار کا ہے (متن سے مثالیں دہرانے کی ضرورت نہیں ہر صفحہ خود منہ سے بولتا ہے)

اس اشاعت میں ایک اور بڑی خاص صفت یہ ہے کہ فاضل مرتب نے بہت سے ایسے مترادفات، ہم معانی ہم مطالب اقوال و امثال تلاش کیے جو تین دوسری پاکستانی زبانوں سندھی، پنجابی اور پشتو میں موجود ہیں (افسوس کہ وہ بلوچی پر اتنی توجہ نہ کر

سکے اور ایک لحاظ سے تو گجراتی بھی اب ایک پاکستانی زبان ہے کیوں کہ اس کے بولنے لکھنے اور پڑھنے والے کراچی میں ہی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں) ..... ہندی، فارسی، عربی تو اردو کی بنیادیں تھیں ..... مؤلف مرحوم فارسی عربی خاصی جانتے تھے مگر چونکہ خالص دہلوی تھے، پاکستان کے قیام سے قبل کسی پاکستانی صوبے میں کسی معقول مدت تک اس طرح رہائش کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ مقامی زبان سے گہری واقفیت ہو جاتی مگر بوقت تالیف طے انھوں نے یہ کر لیا تھا کہ مقامی یعنی پاکستانی زبانوں سے بھی استفادہ کریں گے اس لیے انھیں اپنی آرزو پوری کرنے کے لیے بڑی جستجو کرنی پڑی۔ ان زبانوں کے فضلا سے ملے اور ان کے ذخائر و رہنمائی سے بڑی محنت کے ساتھ استفادہ کیا (ان کاوشوں کا اشارہ صفحہ ۳۵۔ ۳۴ پر موجود ہے) انھوں نے ان محترمین کا ذکر بھی پورے تشکر و امتنان کے ساتھ کیا ہے جنھوں نے انھیں ان زبانوں کے محاوروں اور اقوال و امثال سے استفادہ کرنے کے لیے ترجمے اور رہنمائی کے ذریعے مدد دی۔

مغرب کے اقوال و امثال ایک بڑا مضمون ہیں۔ مؤلف مرحوم مقدمے اور متن میں تفصیلی ماخذات نہیں دے سکے مگر سچ یہ ہے کہ عموماً پرانے محاوروں، اقوال و امثال کا کوئی ایک ماخذ ہوتا بھی نہیں۔ وہ تو بیشتر (استثنا چھوڑ کر) جامع البیان اور سریع التاثیر مختصرات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو ہر کوئی اپنا لیتا ہے اور جو صدیوں صدیوں زندہ رہتے ہیں۔ برٹے نی کا (مائیکرو۔ ۱۹۸۰ء ایڈیشن) جلد آٹھ کے صفحہ نمبر ۲۵۸ پر PROVERB کے زیرِ عنوان بڑی دلچسپ، گو نامکمل، معلومات ایسے سفر در سفر میں کسی قدر تبدّل الفاظ اور مترادفات سے متعلق خاصا مطالعاتی مواد فراہم کرتی ہیں مگر اس کے مدیران بھی اس امر پر متفق ہیں کہ وہ بے شمار ذرائع سے آتی ہیں۔ غالب اکثریت کے "خلاق" گمنام ہوتے ہیں اور ان کے اصل ماخذات کا سراغ لگانا بہت ہی مشکل ہے۔ ہمارے علم کے مطابق ایسے تمام نہ سہی بیشتر ماخذات کی تلاش پر کہیں کچھ کام ہوا ہو تو اردو میں کسی کتاب کا حوالہ قدیم و جدید فہارسِ کتب اور کتب خانوں میں ملتا نہیں ہے۔ البتہ جامعہ آکسفرڈ اور جامعہ ہائیڈل برگ جرمنی میں دیکھا کہ

اپنے محاوروں، اقوال اور امثال کی عمر اور اصل ماخذات پر کام کے منصوبے زیر ترتیب تھے (ابھی ان کی تکمیل تو کیا ہوئی ہو گی شاید ابتدائی کام بھی اشاعت پذیر نہیں ہوا) البتہ جامعہ آکسفرڈ PROVERS کے طویل اور مختصر ایڈیشن شائع کرتی رہتی ہے جو ایک علیحدہ منصوبہ ہے۔ وہ پاکستان میں بھی عام ملتے ہیں۔ ان کی مشکل بھی وہی تھی جو صاحب تالیف نے مغرب سے گہری واقفیت کے بغیر درست طور پر بیان کر دی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان باتوں نے زبان در زبان، تہذیب در تہذیب، علاقہ در علاقہ سفر اتنا کیا ہے کہ سب نہیں بہتوں کے بارے میں کچھ بھی متعین نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں علم السنہ کے ماہرین جن مکمل زبانوں کی عمر اور پھیلاؤ کا تعین کرتے رہتے ہیں۔ ان کی قدامت کے حوالے سے ایک ہی برِاعظم یا علاقے میں مختلف زبانوں کے محاوروں، اقوال اور امثال کا کھوج خاصی حد تک لگایا جا سکتا ہے۔ بہرحال وہ ایک علیحدہ علمی مشن ہے۔ برٹے نی کا محولہ بالا مضمون بھی اس طرف نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے نزدیک بعض مصری دستاویزات (۲۵۰۰ قبل مسیح)، عہد نامہ عتیق اور سمیری کتبے قدیم ترین ماخذات لگتے ہیں ساتھ ہی قدیم چینی فرامین اخلاق، مقدس ویدوں کے بہت سے فلسفیانہ افکار بھی اس صف میں شامل ہیں بعض مغالطوں کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً عہد نامہ عتیق کے حوالے سے یہ کہا گیا ہے کہ "کتاب اقوال و امثال" جو روایتاً کلی طور پر حضرت سلیمان علیہ السلام سے منسوب ہے بعض قدیم تر تالیفات سے بھی ماخوذ ہے..... اس وقت ہم زیادہ دور نہیں جاتے مولف مرحوم نے خود اس موضوع پر کافی سیر حاصل بحث کی ہے جن قارئین کو ماخذات اور سفر در سفر میں متبادلات و مترادفات سے زیادہ دلچسپی ہو وہ برٹے نی کا یہ باب، متعلقات اور دیگر حوالہ جات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ اتفاق سے مؤلف مرحوم اس طرف توجہ نہیں دے سکے تھے ورنہ شاید خود بھی اس کی، اور چاہتے تو بہت سے متعلقات اور حوالہ کتب کی، نشاندہی کر سکتے تھے۔

جیسا کہ "حرف گفتنی" سے ظاہر ہے مؤلف مرحوم نے اس موضوع پر اس صدی کی تیسری دہائی سے کام شروع کر دیا تھا۔ ان کی پہلی تالیف "موتی" تھی جو

۱۹۳۲ء میں دہلی سے شائع ہوئی (دوسرا ایڈیشن بھی ۱۹۳۸ء میں دہلی سے ہی شائع ہوا) "موتی" پر خواجہ حسن نظامی مرحوم کا تبصرہ جو مؤلف نے نقل کیا ایک بلیغ سند ہے جو یوں بھی ایک نہایت خوبصورت نثر پارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ "حرف گفتنی" اس موضوع سے مؤلف مرحوم کے مسلسل شغف کی ایک حیرت انگیز اور لائق تقلید داستان سناتا ہے۔ ایسی لگن آج نایاب نہ سہی بہت ہی کمیاب ہو چکی ہے۔ بہرحال اس داستان سے ہم یہ بات اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ان کے تسلسل شغف نے انہیں نہ صرف زیادہ سے زیادہ تعداد بخشی بلکہ وہ مسلسل چھان پھٹک بھی کرتے رہے اور اپنے معیار کے مطابق اتنا ضخیم مجموعہ تیار کر لیا (مختصر ضخامت کی کتابیں تو مل ہی جاتی ہیں جن کی افادیت ابتدائی نصاب کی حیثیت سے زیادہ نہیں گو آج اتنی افادیت بھی نہایت قابل قدر ہے۔)

مؤلف کی دیانت اور علم دوستی دیکھیے کہ مولوی ظفر الرحمن دہلوی کے ایسے مسودے "ہماری کہاوتیں" کا ذکر کرتے ہیں.... "حرف گفتنی"۔ جو زیر ترتیب ہی رہا (گو چار جلدوں تک پہنچ گیا تھا) ہم نے بابائے اردو مرحوم کے انتقال کے بعد مولوی ظفر الرحمن دہلوی کا مقدمہ انجمن کے جریدے "قومی زبان" (جون ۱۹۶۲ء) میں شائع کر دیا تھا (جب کہ وہ بہت پہلے انتقال کر چکے تھے) لیکن وہ مسودہ تاحال اشاعت پذیر نہیں ہوا اور اب اس زیر نظر مجموعے کی اشاعت کے بعد اس کی اشاعت اتنی ضروری بھی نہیں رہی۔ گو اس کی ایک اپنی تاریخی اہمیت ہے اور جب ہمارے ذرائع نے اجازت دی تو ہم انشاء اللہ اس کی چند سو جلدیں چھاپنی چاہیں گے۔

دراصل وہ یوسف بخاری مرحوم کی اس تالیف کے سلسلے سے ان کے چند بنیادی مطالعات میں شامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اپنی صوابدید کے مطابق اخذ و اضافہ سے کام لیا ہے اور دوسری زبانوں کے حوالے خاص سیّد صاحب مرحوم کا اپنا کارنامہ ہیں۔

بر سبیل تذکرہ ذرا مولانا ظفر الرحمن دہلوی مرحوم کی محنت پر تحسین و آفرین کہتے چلیے۔ چار جلدیں۔ ۲۲۹۶ صفحات۔ ان میں ایک حسن ترتیب اور نظر ثانی بھی۔

(بخاری صاحب نے خود تفصیلی ذکر کیا ہے) کیا لوگ تھے .... اور ساتھ ہی بابائے اردو مرحوم کے کریڈٹ میں ایک اور اضافہ کرتے چلیے کیوں کہ یہ تالیف بھی مولانا مرحوم انھی کی فرمائش پر انھی کی رہنمائی میں کرتے رہے تھے (یوں بھی جب انجمن کا صدر دفتر اورنگ آباد سے دہلی منتقل ہوا، ۱۹۳۹ء) بابائے اردو نے انجمن کے منصوبوں میں نئی جہتیں پیدا کرتے ہوئے کئی مستند اہلِ دہلی کو اعزازی اور بالمعاوضہ شریکِ کار کر لیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد انجمن ابتدائی دور میں جن حالات سے گزری ان کا اجمال بابائے اردو کے کتابچے "انجمن کا المیہ" میں موجود ہے۔ اگر حالات سازگار رہتے تو خود مولانا ظفر الرحمٰن مرحوم یا ان کے فوراً بعد کوئی اور فاضل "ہماری کہاوتیں" میں بخاری صاحب کی طرح مقامی یعنی دوسری پاکستانی زبانوں سے استفادہ کرتے ہوئے "ہماری کہاوتیں" کو جدید خطوط پر مکمل کر سکتا تھا۔

بہر حال یہ افتخار سید یوسف بخاری مرحوم کے حصے میں آیا۔

مقدمہ اس لحاظ سے خاصے کی چیز ہے کہ ایک دہلوی بزرگ نے (گو کسی قدر پرانے انداز میں) اس موضوع کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیا ہے۔ بعض دلائل جو انھوں نے قائم کیے ایک فاضل قاری کو غیر ضروری لگیں گے کیوں کہ وہ کلیات و مسلمات میں شامل ہیں۔ مثلاً "زبان و ادب کی اہمیت" میں جن کا جتانا آج ضروری نہیں رہا (شاید ایک لحاظ سے اب بھی ضروری ہو کیوں کہ اہلِ اقتدار کا ایک بڑا طبقہ آج بھی زبان و ادب کو قرار واقعی اہمیت نہیں دیتا) "امثال کا تقابلی جائزہ اور اعداد و شمار" امثال کی حد تک تو بہت خوبصورت ہے مگر اس میں اعداد و شمار نہیں ملتے۔ شاید کوئی سہو و تسامح ہے یعنی وہ درج کرنا بھول گئے ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ محاورے، اقوال و امثال شمار میں آ ہی نہیں سکتے۔ ایک وجہ ان کی فراوانی ہے دوسری وجہ ان کے انتخاب میں اختلافِ معیار، تیسری وجہ ان میں سے بہتوں کا ہر بڑی زبان میں مشترک ہونا.... یوں انھوں نے مقدمے میں "مشترک ہم معانی و ہم محل" کے زیر عنوان (صفحہ ۳۹) "محبوب الامثال" کے حوالے سے (اور اسی کے حوالے وہ بار بار دیتے ہیں) کل یورپین امثال کی تعداد تقریباً بیس ہزار بتائی ہے اور ممالک ایشیا میں

امثال کی تعداد دس بارہ ہزار قیاس کی ہے۔ تمام ادب کے ساتھ عرض ہے کہ یہ دونوں محلِ نظر ہیں اور کسی طرح مستند نہیں۔ جیسا کہ راقم نے عرض کیا ان کا متفقہ طور پر شمار ممکن ہی نہیں ہے اور حیرت ہے کہ مولف مرحوم نے ممالک ایشیا میں زبانوں کی کثرت اور قدامت سے واقف ہوتے ہوئے بھی جو یونانی اور لاطینی سمیت ممالک یورپ سے کہیں زیادہ قدیم تر تھیں اور ہیں اتنی کم تعداد قیاس کی۔ ممالک ایشیا میں قدیم عربی ہی نہیں سنسکرت، چینی اور جاپانی کے علاوہ ہندوستان کی کئی شمالی اور دراوڑی زبانیں لاکھوں محاوروں اور اقوال و امثال سے پُر ہوں گی (ہیں) اس وقت راقم صرف ایک عربی کتاب کا حوالہ دے گا اس کا نام ہے "بلوغ الارب فی لسان العرب" یہ علامہ شکری آلوسی (ایک وقت کے شیخ الجامعہ بغداد) کا مقالہ ہے جو انھوں نے اسٹاک ہوم کی کانفرنس ۱۸۹۸ء میں پیش کیا تھا۔ اس عنوان کا ترجمہ کچھ یوں بنتا ہے۔ "عربی تہذیب کا ارتقا عربی زبان میں" اسے لاہور کے اردو بورڈ (اب اردو سائنس بورڈ) نے پیر حسام الدین راشدی اور ممتاز حسن مرحومین کی تحریک پر عربی سے ترجمہ کرا کے چار جلدوں میں شائع کیا تھا (اب نایاب ہے صرف مستند کُتب خانوں اور اردو بورڈ کے دفتر میں موجود) اسی میں کئی ہزار محاورے یا محاورہ نما اقوال، امثال اور اقوال موجود ہیں۔ چینی کی قدامت اور وسعت پر راقم کیا سند دے سکتا ہے کم از کم تین ہزار برس کی تہذیب و زبان ہے۔ ہندوستانی زبانوں کا ذکر آ ہی چکا ہے (جو زبانیں متروک ہوئیں ان کی تعداد الگ ان کی بہت سی باقیات ضرور دوسری زبانوں میں کھپ گئی ہوں گی۔ سنسکرت کے بہت سے آثار ہندی اور اردو میں منتقل ہو چکے ہیں) سندھی بھی کم از کم ہزار سالہ زبان کہی جاتی ہے اور پنجابی، پشتو، بلوچی بھی ..... خود اردو نسبتاً بہت نو عمر ہوتے ہوئے ایک بحرِ ذخار بن چکی ہے۔ انڈونیشیا کی سیکڑوں چھوٹی بڑی بولیاں جو ڈاکٹر احمد سویکار نو مرحوم نے بڑی حد تک ایک زبان میں ڈھال دیں۔ ملیشیا کی مقامی زبان (ملیشیائی چینی کے علاوہ) کمبوڈین تھائی، ویت نامی، برمی ..... کئی زبانیں دعاویٔ قدامت رکھتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ راقم اس وقت ان کے محاوروں، اقوال، امثال کے حوالے نہیں دے سکتا..... شاید اس

کی ضرورت بھی نہیں ہے......

لیکن اس گزارش سے خدانخواستہ اس تالیف کے اصل اور بے شمار محاسن پر کوئی حرف گیری منظور نہیں۔ صرف اعداد و شمار کے حوالے سے ایک سخن گسترانہ گزارش ضروری سمجھی گئی۔

معانی و مطالب کا مسئلہ یوں تو صاف ہے (عموماً ایسے ایک محاورے، ایک قول، ایک مثل کے ایک ہی معنی نکلتے ہیں جبھی وہ نسلاً بعد نسل ذہنوں میں پیوست اور زبان و بیان میں رواں چلا آتا ہے) لیکن بعض پرانی باتوں کے معنی و مطالب میں تہذیبوں کے ارتقا اور ان میں تبدیلیوں سے جو اضافہ ہوا ہے وہ بھی ایک دلچسپ موضوع ہے۔ مؤلف مرحوم نے اس طرف اشارے کیے ہیں۔ اگر کافی مثالیں دی جا سکتیں تو قاری زیادہ مستفید ہوتا۔ صفحہ نمبر ۲۸ پر انھوں نے ماحصل کی شق نمبر ۲ میں ایک بڑے کام کی بات بتادی ہے۔ "وہ امثال جن کا مطلب اور محل استعمال اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار سے اکثر ممالک و اقوام پر یکساں منطبق ہوتا ہے۔ ان کو بین الاقوامی مشترکہ ملکیت سمجھا جائے گا۔" لیکن بعض گو بہت ہی کم صورتیں اس کے برعکس پیش آ سکتی ہیں جب کہ ثقافتوں میں کوئی بنیادی فرق بھی ہو۔

ایک آدھ مقام پر فاضل مؤلف سے روانیٔ تحریر میں جو سہو ہوا ہے اس کی نشاندہی بھی پورے ادب کے ساتھ ضروری ہے تاکہ عام قاری بھٹک نہ جائے صفحہ نمبر ۲۷ پر مثال نمبر ۶ میں کہا گیا ہے۔ "ناروے کو سمور لے جانا (ڈنمارک) .... ناروے میں سمور بکثرت ملتا تھا" ..... ناروے کئی سو برس سے ایک علیحدہ ملک ہے اور ڈنمارک علیحدہ ملک۔ یہ الگ بات کہ دونوں اسکینڈی نیویائی اور سخت سرد ہیں۔ ناروے کافی پہاڑی علاقہ بھی ہے۔ سمور والے جانور وہاں ڈنمارک کی نسبت زیادہ ملتے ہیں.... اسی طرح "ایتھنز کو الّو لے جانا" (نمبر ۴) اس کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ "یونان کے اس شہر میں کبھی الّو بکثرت ہوتے تھے۔" ..... راقم نے مؤلف کی طرح اس موضوع پر کام نہیں کیا اور یوں بھی ایسے فاضل بزرگ کی خاک پا ہونے کا ادعا بھی نہیں رکھتا مگر کسی مغربی استاد کی غیر موجودگی میں اس تشریح کو

قبول کرنے پر آمادہ ہونے میں بڑی مشکل سے دوچار ہے۔ شاید تشریح وہی ہو جو فاضل مؤلف نے کی لیکن اُلّو کے بارے میں خیال آتا ہے کہ قدیم یوروپین روایات کی رو سے اُلّو ایک عقل مند پرندہ ہے (ہماری مشرقی تفہیم سے بالکل مختلف) ایتھینز ایک زمانے میں مدینتہ الحکما کہلاتا تھا۔ ممکن ہے اس کی تشریح یوں ہو کہ ایتھینز کو دانشور بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

مقدمے کے دیگر ابواب میں مؤلف مرحوم نے جو تلاش، محنت اور فضیلت سموئی ہے وہ کتاب کے موضوع پر اس حرفے چند میں کسی توسیع کی گنجائش کم چھوڑتی ہے۔ ان کی زبان آج کے معیار سے "پرانی" سہی ..... مگر وہ تھے ہی پرانے آدمی (ایک طرح سرسید احمد خان کی زبان بھی پرانی ہے) ..... مگر تقریباً تمام متعلقہ لغات و رموز کا ایسا فاضلانہ احاطہ کیا ہے جو قاری کی رہنمائی دور دور تک کرتا ہے اور ایک بڑی فکری رہنمائی سے معمور بھی ہے۔ اس وقت صرف دو مزید گزارشات کرنی ہیں ؟ شاید آئندہ کام کرنے والوں کو دعوتِ فکر دیں۔

(۱) تہذیب کے ان ذخائر میں جنھیں محاورے، اقوال و امثال کہا جاتا ہے جو متروکات آجاتے ہیں۔ ایک دن کسی کو ان کی نشاندہی بھی کرنی ہوگی۔ قریب ترین مثال وہ خطوط ہیں جو "اردو کے خوابیدہ الفاظ" میں اختیار کیے گئے ہیں اور اس کوشش میں تبدیلی زماں کے ساتھ تبدیلی مکاں کی وجہ سے متروک ہونے کی کسی قدر تفصیل بھی بتانی ہوگی۔ جیسے بعض باتیں تقسیم ہند کی وجہ سے صرف پاکستان اور صرف ہندوستان میں مستعمل رہ گئی ہیں۔ دوسرے ملک میں تاریخی حیثیت ضرور رکھتی ہیں مگر استعمال میں متروک ہو چکی ہیں۔ انجمن ایسی کسی بھی باقاعدہ تفصیلی کوشش کا خیر مقدم کرے گی۔

(۲) آج کی اردو میں خود اردو، کسی قدر فارسی اور نسبتاً زیادہ تعداد میں ایسے انگریزی اقوال اور اشعار نے محاوروں، اقوال و امثال کی حیثیت اختیار کرلی ہے جو کسی حد تک اٹھارویں اور بیشتر انیسویں اور بیسویں صدی میں پیدا یا متعارف ہوئے۔ فاضل مؤلف نے ذوق

کے اشعار اس قبیل میں شامل بھی کیے ہیں۔ راقم کی ناچیز رائے میں کسی حد تک میر، مومن اور داغ کے علاوہ غالب اور اقبال یہاں تک فیض (گلشن کا کاروبار) اردو کو ایسے مصرعے اور فقرے دیے گئے ہیں جو پورے کے پورے اور اپنے ٹکڑوں کے حوالوں سے بھی ضرب الامثالی درجے تک پہنچ کر اسی طرح مستعمل ہو چکے کہ عام بولنے والا ان کے ماخذ سے واقف نہیں رہا۔

مؤلف مرحوم سے تو ان کی عمر اور مصروفیات دیکھتے ہوئے توقع نہیں کی جا سکتی تھی، نئے کام کرنے والوں کی توجہ اس طرف ضرور دلائی جا سکتی ہے کہ اردو میں ایسے اضافوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک مجموعہ مرتب کر دیں۔ اس منصوبے کی ایک نئی خصوصیت یہ ہوگی کہ صاحبِ قول کا تشخص بھی ہو جائے گا۔ جو بے شمار پرانے محاوروں، اقوال اور امثال کے مصنفوں کا نہیں ہو سکا ہے۔ انجمن ایسے مجموعے کا بھی مجتہدانہ خیر مقدم کرے گی۔ اتنا طے ہے کہ چند برس میں یہ منصوبہ کسی کو ضرور سوجھے گا اور کوئی نہ کوئی یہ بیڑا بھی اٹھا ہی لے گا۔

انجمن سید یوسف بخاری مرحوم کی ممنون ہی نہیں مقروض بھی ہے کہ ایسی اہم کتاب دے گئے۔ یہ تقریباً پچیس ہزار اندراجات ہیں۔ نہایت جامع، رنگا رنگ اور محاورتاً ہفت زبان، کئی زبانوں سے استفادے، لسانی مترادفات کا نہایت دلچسپ نقشہ، تہذیبی وحدت کی جھلکیاں بھی، فطرت انسانی کا ارتقا جس طرح ہوا اور ہو رہا ہے۔ اس کے بہت سے گوشوں کی نہایت فکر انگیز نشاندہی......

سید یوسف بخاری مرحوم بہت بڑا کام کر گئے ہیں۔ صدر انجمن جناب نورالحسن جعفری نے بطورِ خاص یہ کتاب جلد تر چھاپنے کا فیصلہ کیا تھا مگر کچھ بیان کردہ وجوہ اور راقم کی یہ خواہش سدِ راہ رہی کہ اس پر جو حرفے چند ہو وہ مؤلف مرحوم اور کتاب کے شایانِ شان ہو اور وہ معذرت طلب ہے کہ ناگزیر وجوہ سے جلد تر ایسا نہ ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے۔ ہمیں اور ہمارے ذریعے قومی زبان کو ایک بڑا

ذخیرہ دے گئے ہیں۔

اور جیسا کہ عرض کیا اردو میں ایسی کوئی اور کتاب آج تک نہیں چھپی ہے۔ ا بد ہے کہ اردو ہی نہیں۔ تہذیب انسانی کے طالب علم بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

۹۱-۱۹۹۲ء

مضامین غلام ربّانی

غلام ربّانی (مرحوم)

پہلا ایڈیشن

یہ ایک نہایت دلچسپ تاریخی اور مفید مجموعہ مقالات ہے جس کے مصنف انجمن اور بابائے اردو کے فاضل دوست اور عالم مولانا غلام ربانی مرحوم ہیں۔

انجمن اسے شائع کرنے پر کسی حد تک مطمئن اور کسی حد تک غیر مطمئن ہے۔ مطمئن اس لیے کہ یہ ۲۶ مقالوں پر مشتمل ایک ایسے نامور بزرگ کا نثری مجموعہ شائع ہو رہا ہے جو ایک مدت تک بابائے اردو مرحوم کے رفیق کار رہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو جناب غلام یزدانی کا پیش لفظ جو اگلے صفحات پر آتا ہے اور خود مصنف کے بہت سے بیانات) علاوہ ان کی مولوی صاحب سے قربت کے۔ زیر نظر مقالے اپنے متنوع موضوعات، سادہ انداز بیان اور ان معلومات کے لحاظ سے جو آج نایاب ہیں بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ نامطمئن اس لیے کہ انجمن پر مولانا غلام ربانی مرحوم کا جو حق تھا وہ ادا نہیں کر پائی: وہ ایک کثیر التحریر بزرگ ہیں، لیکن بہت سے مقالے ستر اسی برس پہلے کے ہندوستانی جرائد میں شائع ہوئے اور نایاب ہوگئے (دراصل انھیں جمع کرنے کی پوری پوری کوشش بھی نہیں کی جاسکی)۔ پاکستان میں بھی خاصا کچھ چھپا جو تاحال محتاج جمع و ترتیب ہے۔ یہ مقالے بھی اتفاق سے ہاتھ آگئے جن پر ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب نے ایک مختصر مگر جامع مقدمہ بھی لکھا۔ وہ پیش لفظ کے عنوان سے شامل اشاعت ہے۔

علمی انداز سے معلوماتی مقالوں کی کتابی اشاعت ایک خوب صورت روایت ہے جسے بابائے اردو نے خصوصی طور سے فروغ دیا۔ ہماری تازہ ترین مطبوعات میں "مقالات برنی" (دو جلد) شامل ہیں جن میں سید حسن برنی مرحوم جیسے فاضل اہل علم کے اکیاون مقالات شائع کیے گئے ہیں۔ مگر ان میں اکثر پاک و ہند تاریخ کے بعض ادوار پر تحقیقی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں بھی اختصاص "عہد سلطنت" کو حاصل ہے۔ بر سبیل تذکرہ، انجمن نے ان مرحوم کی اولین گو نہایت معرکتہ الارا تصنیف

"البیرونی" بھی شائع کردی ہے جس کی فرمائش بہت سے حلقے کرتے رہتے تھے۔ "البیرونی" سید حسن برنی نے ۱۹۱۷ء میں تحریر کی جبکہ اس پر (ساتویں دہائی تک) پاکستان میں نہ صرف کئی بڑے مقالے شائع ہوئے بلکہ ایک بڑا بین الاقوامی مذاکرہ بھی منعقد ہوا (کراچی ۱۹۷۹ء بہ تعاون ہمدرد فاؤنڈیشن)۔

زیرِ نظر اشاعت کے ۳۶ مقالوں میں جو موضوعاتی تنوع ہے اس کا اندازہ تو فہرستِ مضامین میں ایک نظر ڈالنے سے ہی ہوجائے گا۔ ان میں کسی مشکل بیانی کے بغیر جو معلومات، واقعات اور بعض جگہ لطائف آجاتے ہیں ان کا مزا صرف مقالے پڑھنے سے ہی آسکتا ہے۔ مثلاً بابائے اردو مرحوم سے متعلق ان کے اورنگ آبادی دور کا ایک واقعہ جو صفحہ ۱۹۹-۱۹۸ پر مذکور ہے بیک وقت آج سے ایک مختلف الاقدار ریاستی معاشرے میں بھی مولوی صاحب کی اہمیت اور سیرت پر کئی باتیں کہہ جاتا ہے۔ "حکومت آصفیہ کے صدر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر ایک دفعہ اورنگ آباد کے دورے پر آئے آں جہانی کے دل میں آپ کی بڑی قدر تھی۔ چناں چہ وہ آپ سے ملنے بنگلے پر آئے اور کوئی دو تین گھنٹے وہاں ٹھہرے........"

(تبصرہ از راقم) پاکستان ہندوستان کے جن افراد نے قبل از تقسیم کی بڑی ہندوستانی ریاستیں نہیں دیکھیں، بطور خاص جنھوں نے سلطنتِ عثمانیہ حیدرآباد کا ماحول نہیں دیکھا اور اس معاشرے کے تہذیبی آداب معاشرت سے واقف نہیں وہ بمشکل اندازہ لگاسکیں گے کہ اس دور میں وزیر اعظم کا محض ایک ڈائرکٹر مدارس کے گھر آنا اور اتنی دیر قیام کرنا کیا معنی رکھتا تھا۔ راقم کو جاگیردارانہ معاشروں کے بارے میں جو تحفظات ہیں وہ اپنی جگہ۔ یہ گفتگو اس مخصوص ماحول کے تناظر میں ہورہی ہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد وہ شخصیت تھے جن کے فضائل ان کے دوسرے معاصرین نے تو بیان کیے ہی ہیں خود علامہ اقبال کی اچھی خاصی عمر میں ان سے خط و کتابت علامہ مرحوم جیسے جدید ذہن اور غیر ریاستی باشندے کے احترام و عقیدت کی عجیب جھلکیاں دکھاتی ہے۔ منصبی حیثیت کے لحاظ سے مولوی صاحب اور مہاراجہ کشن پرشاد میں کوئی مناسبت ہی نہ تھی۔ زمین آسمان کا فرق۔ معاشرہ سرکاری حفظِ مراتب کے پیچاک میں گھرا ہوا۔ مولوی صاحب کوئی درباری شاعر بھی نہ تھے (مہاراجہ

موصوف کی شعر پسندی زیادہ معروف ہے) اس پس منظر میں مہاراجہ موصوف کی فراخ طبعی اور علم دوستی تو اُبھرتی ہی ہے مولوی صاحب کا وہ مقام بھی واضح تر ہوتا ہے جو انہیں اس وقت حاصل ہو چکا تھا جب ان کی اور انجمن کی خدمات اتنی نہ تھیں جو ۱۹۳۹ء کے بعد اردو تحریک میں ان کی تحریکی شدت خلوص اور انجمن کی پے بہ پے انتہائی بیش قیمت اشاعتوں سے ظاہر ہو چکی ہیں (یہ سطریں لکھتے وقت پاکستان میں مولوی صاحب کا کتابچہ "انجمن کا المیہ" یاد آتا ہے۔ کیسی شخصیت کو کیسے کیسے درجے کے لوگوں نے نہ صرف ذہنی بلکہ جسمانی ایذائیں پہنچائی ہیں) اور آگے چلیے (اقتباس جاری) "اس وقت مقبرہ کے گرد (جس کے قریب مولوی صاحب کا بنگلہ تھا) چاروں طرف پولیس کا پہرہ تھا۔ ایک آدمی پھٹے حال مقبرے کی طرف پشت کیے آپ سے ملنے بنگلے کی طرف آ رہا تھا۔ جب قریب پہنچا تو پولیس کے جوان نے اسے روک دیا مگر وہ کہنے لگا میں صاحب سے ملنے آیا ہوں ایک ضروری کام ہے......... آپ کمرے میں مہاراجہ بہادر سے گفتگو میں مشغول تھے۔ شاید کسی کھڑکی یا دروازے میں سے آپ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ آپ نے آدمی سے کہا (اس سیاق و سباق میں "آدمی" سے بزرگوں کی مراد ملازم یا تنخواہ دار ماتحت معاون ہوتی تھی) اس شخص سے پوچھو کیا چاہتا ہے۔..."

یہاں رک کر سوچیے کہ کیا آج کے اتنے جمہوری ترقی یافتہ دور میں اتنا بھی ممکن ہے کہ خواہ کتنا ہی فاصل ہو، کوئی ماتحت عہدیدار اپنے افسر، وہ بھی ایسے افسر اعلیٰ سے گفتگو کا سلسلہ کسی خستہ نووارد کو دور سے دیکھ کر منقطع کرتے ہوئے اتنی جرات کے ساتھ اس کی طرف توجہ کر سکے ..... آج تو بڑے بڑے عوامیت اور جمہوریت کے نام لیوا ہی نہیں، چھوٹے چھوٹے افسر تک معزز ملاقاتیوں کو وقت دے کر بھی گھنٹوں انتظار کراتے ہیں اور بار بار ٹالتے بھی رہتے ہیں ..... " دریافت پر معلوم ہوا کہ کسی تحتانیہ مدرسے کا چوکیدار ہے آپ کے پاس ایک درخواست پیش کرنی چاہتا ہے۔ آپ نے کہا اس کی درخواست لے لو اور کہو اس وقت میں مصروف ہوں، کل آ کر مجھ سے ملے۔"

یعنی مولوی صاحب نہ صرف وزیر اعلیٰ سے گفتگو توڑتے ہیں بلکہ ایسے معمولی

سائل پر معاملاتی توجہ بھی دیتے ہیں..... اور آگے چلیے۔

"مہاراجہ بہادر کے چلے جانے کے بعد درخواست کو پڑھا۔ اس میں درخواست گزار نے لکھا تھا صدر مدرس نے مجھے مارا اور جس چپل سے مارا ہے وہ منسلک ہے۔ چنانچہ درخواست کے ساتھ ایک چپل منسلک تھی۔" یہ سادہ لوحی اور انصاف طلبی کے لیے فراہمی ثبوت کا ایک عجیب واقعہ بھی بن گیا اور بڑا مزے دار لطیفہ بھی۔

"صبح کو دیکھا گیا کہ وہ چوکیدار آپ کے سامنے میز پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ آپ نے اس سے کہا اچھا یہ بتاؤ تم اس مدرسے میں رہنا چاہتے ہو یا صدر مدرس کا تبادلہ کر دیا جائے۔ چوکیدار نے کہا صاحب میں اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ اپنے گاؤں میں رہنا چاہتا ہوں۔ آپ نے مسکرا کر کہا "اچھا جاؤ صدر مدرس کا تبادلہ کر دیا جائے گا۔" صدر مدرس کا تبادلہ کر دیا گیا۔"

یہاں ہم بآسانی قیاس کر سکتے ہیں کہ صبح تک مولوی صاحب نے اس امر کی تحقیق کر لی ہوگی کہ چوکیدار نے سچ بولا ہے۔ ورنہ وہ نہ صرف اسے صبح حاضری سے روک دیتے بلکہ ناشتے میں تو شریک ہی نہ کرتے۔ تالیفِ قلب اور انصاف کی یہ مثال نادر بھی ہے اور مولوی صاحب کی سیرت پر بڑی خوبصورت روشنی بھی ڈالتی ہے۔

مضمون بعنوان "عظیم الشان" میں مولوی صاحب کی اورنگ آبادی زندگی کے علاوہ ان کی سیرت و کردار پر ایسی بہت سی معلومات ملتی ہیں جو حیرت انگیز بھی ہیں، لائقِ تقلید بھی (گو اب شرافت کے باب میں ایسی تقلید بہت ہی مشکل ہو چکی ہے) اور مولوی صاحب پر دستیاب مطبوعہ مواد میں بڑے اضافے بھی.....

یوں مولوی صاحب پر ربانی صاحب کا ایک اور مضمون بھی اسی مجموعے میں شامل ہے (مطبوعہ "قومی زبان" بابائے اردو نمبر ۱۹۶۶ء، جب کہ اول الذکر مضمون کا ماہ و سال اشاعت اس کے آخر میں نہیں دیا گیا) "مولوی صاحب پر لکھنے والے" (صفحہ ۲۸۶) جس میں مولوی صاحب پر ایک ہم عصر معترض کے حوالے سے تردیدی گفتگو کے علاوہ بہت سی نئی معلومات ملتی ہیں۔ یہ مضمون جیسا کہ عرض کیا گیا ۱۹۶۶ء میں چھپا یعنی مولوی صاحب کے انتقال (۱۶ اگست ۱۹۶۱ء) کے پانچ برس بعد جب ربانی صاحب کسی طور انجمن سے متعلق نہ تھے اور ان پر کسی قسم کی اخلاقی پابندی بھی نہ

تھی کہ اتنی مداحانہ تحریر لکھیں جیسی کہ وہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو مضمون (اول الذکر) انھوں نے مولوی صاحب کی حیات میں لکھا وہ بھی کسی ذاتی مقصد کے لیے یا محض بھٹئی نہیں تھا۔ ربانی صاحب نے مولوی صاحب کو بعض ادوار میں بہت قریب سے دیکھا تھا اور ان کی صفات کے صدق دل سے قائل تھے جن کا اظہار ان کی وفات کے پانچ برس بعد بھی کیا۔ ایک اور بات واضح ہوتی ہے۔ آج کل ہی نہیں خود اس دور میں ایسے جوابی مضمون خاصی تلخ کلامی سے مملو بھی ہو جاتے تھے معترض کا کچا چٹھا بکھیر دیا جاتا تھا۔ معترض پر سخت جوابی الزامات لگائے جاتے تھے ....اور آج کل تو ایسے دفاعی مضامین جیسے جارحانہ ہو گئے ہیں ان کا تذکرہ کرنا بھی اچھا نہیں لگتا جب کہ بعض لکھنے والے بڑے وقیع خواتین و حضرات ہوتے ہیں۔ ربانی صاحب کے اپنی نہایت ہی ممدوح و محبوب شخصیت کا دفاع ایک مثالی شرافتِ تحریر اور دفاعِ ممدوحین کے باب میں ایک باوقار، مستحکم، رہنما نمونہ ہے......

مصنف نے بعض موضوعات پر کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ بعض پر خاصے اجمال کے ساتھ، مگر پڑھتے وقت دلچسپی کم نہیں ہوتی۔ اس دور کے بہت سے بزرگوں میں ایسی دل نشین زبان بھی سب کو میسر نہیں تھی۔ اغلاق، مبالغہ، ابہام، طویل طویل فقرے اور "فیصلے" عام تھے۔ مصنف کی تحریر ان عناصر سے بری ہے۔ آج کی سی، وہ بھی نہایت صاف، زبان معلوم ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض مضامین تحقیقی نتائج کے طور پر لکھے گئے ہیں گو دراصل بیانیہ اور تاثراتی ہیں بہرحال جدید تقاضے بعض ایسی روایات کے ماخذوں کا حوالہ ضرور طلب کرتے ہیں جن میں قدیم ادوار کے بعض افسانہ نما واقعات آتے ہوں۔ وہ حوالے ان مضامین میں مفقود ہیں (اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بیانات یقیناً بے ماخذ ہوں گے) مثلاً تاج محل کی تعمیر، ایک بہت ہی خوبصورت بیانیہ ہے۔ تاج محل دیکھے بغیر جس طرح اس مضمون سے اس کی تصویر سامنے آجاتی ہے وہ تاثر تاج محل پر لکھے جانے والے بے اندازہ ادب میں بہت کم محسوس ہوتا ہے۔ مگر کیا اچھا ہوتا اگر قاری کی مزید رہنمائی کے لیے وہ حوالے بھی دے دیے جاتے جن سے فاضل مصنف نے استفادہ کیا ہے۔ صفحہ ۱۲۹ کے دوسرے پیراگراف میں خود فرماتے ہیں کہ

"تاج محل کی مفصل تاریخ موجود ہے۔ اس میں بڑے بڑے صناعوں، معماروں اور دوسرے ماہرین فن کے نام تک درج ہیں" اگر اس تاریخ کا حوالہ بھی آجاتا تو عام قاری مزید حصول معلومات میں آسانی محسوس کرتا اور ایک آدھ بیان کردہ واقعے کی سند بھی اسی ریکارڈ پر آجاتی مثلاً صفحہ ۱۳۶ پر ایک دلچسپ گو ناقابل یقین واقعہ ملتا ہے جس کی حوالہ جاتی تائید اس کا تجزیہ بہتر طور پر کرنے میں مدد دیتی جب کہ اس کے بغیر وہ محض خوش عقیدگی پر مبنی شاہجہاں آبادی روایت معلوم ہوتا ہے فرماتے ہیں کہ "جب تاج محل تیاری کے قریب پہنچا تو اس کی خوب صورتی کی شہرت دور دراز ملکوں میں پہنچ گئی۔ بعض بادشاہوں نے اس کو دیکھنے اور نقشہ اتارنے کے لیے آدمی ہندوستان روانہ کیے مگر جب یہ لوگ آگرہ پہنچے تو ان کو بڑی مایوسی ہوئی۔ تاج محل کا نقشہ بنا لینا تو بڑی بات تھی اس کو دور سے دیکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ہر طرف سے مقبرے کا پردہ تھا وہاں جانے کی عام اجازت نہ تھی اور ہر موسم کا شامیانہ تاج محل کو ڈھکے رہتا تھا۔ غرض عمارت کے پردے کا بڑا سخت انتظام تھا۔ ان دنوں کئی ملکوں کے نقشہ نویس تاج محل دیکھنے کی کوشش میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے وزیر اعظم سے مشورہ کیا وزیر نے ان کی منت اور دور دراز سفر کی تکلیف کا خیال کر کے ایک تدبیر نکالی۔ ایک خواص سے بادشاہ کی خدمت میں ایک مسجد بنوانے کی درخواست پیش کرادی۔ اس خواص کا نام سرہندی بیگم تھا۔ چنانچہ اس کو مسجد بنوانے کی اجازت مل گئی اور عمارت تیار ہو گئی۔ ایک دن جب کہ موسم گرما کا شامیانہ تبدیل ہو رہا تھا تو ان غیر ملکی نقشہ نویسوں نے اس مسجد کی چھت پر سے تاج محل کا نظارہ کیا اور اس کا نقشہ اتار لیا اور وزیر کا شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔ مسجد سرہندی بیگم کو آج کل ستندی مسجد کہتے ہیں۔"

خدانخواستہ یہ واقعہ ربانی صاحب نے وضع نہیں کیا۔ بوقت تحریر راقم کو تاج محل سے متعلق کسی کتاب میں اس حوالے کا استحضار نہیں مگر یہ ضرور رپورٹ ہوا ہوگا۔ پھر بھی مصنف کا یہ بیانِ روایت، ماخذ کا حوالہ نہ دینا، اس پر اپنے تبصرہ کیے بغیر من و عن نقل کر دینا، اس کی خوب صورتی پر حرف لائے بغیر اس کی علمی شان کو بغیر استناد و تجزیہ رکھتا ہے جو راقم کو کھٹکتی ہے۔ یوں شاہ جہاں جیسے امیر مغل بادشاہ

کے زمانے میں تعمیرات پر جس طرح روپیہ خرچ ہوتا تھا اور انجینئرنگ نے جس جس حد تک ترقی کرلی تھی، اس کے پیش نظر یہ امر "ناممکنات" میں سے نہیں کہ تاج محل جیسی اونچی عمارت کو روشائی تک چاروں طرف سے قناتیں یا پردے اٹھا کر چھپا رکھا گیا مگر نہ تو اتنے اونچے اور پھیلے ہوئے اسٹرکچر کو پردے میں رکھنے کے امکان اور ضرورت کو عقل تسلیم کرتی ہے نہ اس امر کے شواہد رپورٹ ہوئے ہیں کہ کن بادشاہوں نے اسے دیکھنے اور نقشہ اتارنے کے لیے اپنے آدمی ہندوستان روانہ کیے تھے (اور بعد میں تاج محل کی نقل کہیں ہوئی بھی یا نہیں) اس وقت آس پاس ان وسائل کے بادشاہ تھے ہی کون؟ ہندوستان تو دکن تک مغلوں کے پاس تھا اور دکن کے پار کوئی ایسی سلطنت نہ تھی جو سلطنت مغلیہ کی ہم پایہ ہوتی (ان میں سے کوئی بادشاہ نہ تھا۔ خود مختار سلاطین اور بڑے امرا تھے) چین سے ایسی کسی مہم کا آنا بالکل قرین قیاس نہیں لگتا کیوں کہ اس وقت چین سے مغلوں کے سفارتی تعلقات ثابت نہیں اور ان کا فن تعمیر کسی ایسے استفادے کا محتاج نہ تھا۔ عرب میں کوئی بادشاہ نہ تھا۔ سلطنت عثمانیہ البتہ عروج پذیر تھی لیکن وہ دور تھی اور اس سے بھی مغلوں کے ایسے گہرے سفارتی تعلقات نہ تھے۔ ایران البتہ ایک بڑا اہم ہمسایہ تھا اور ایران سے مغل سلطنت کے روابط بعض پیچیدگیوں کے باوجود نہایت گہرے تھے، لیکن تاج محل کے چیف انجینئرز خود ایرانی نژاد بتائے گئے ہیں۔ ایرانی فن تعمیر خود بڑی بلندیاں چھو چکا تھا اور اگر شاہ ایران کوئی ایسی سفارت بھیجتے تو مغل بادشاہ کا جو اپنے پردادا کے وقت سے ایک طرح ان کا ممنون چلا آتا تھا مبینہ سیاسی مسابقت کے باوجود اس معاملے میں (کہ کوئی سیاسی، سرحدی توازن طاقت کا مسئلہ نہ تھا) انھیں ایسی اجازت دینے سے انکار کرنا ایک "غیر شاہانہ" رویہ لگتا ہے۔

برسبیل تذکرہ۔ راقم نے اپنے لڑکپن تک ایک بالکل ہی اجڑی ہوئی دلّی دیکھی۔ پھر بھی بعض سیدھے سادے خوش عقیدہ بزرگوں سے خود تعمیر دہلی کے متعلق (ایسی) ایسی روایتیں سن رکھی ہیں جو بڑی دلچسپ کہانیاں، امکانات سے بالکل بعید، لگتی ہیں۔ آج بھی دلّی میں لال قلعے اور لکھنؤ میں امام بارگاہ آصف الدولہ کے آس پاس پیشہ ور غیر رجسٹرڈ گائیڈ سستے کاغذ پر چھپے ہوئے پمفلٹ فروخت کرتے

ہیں جن میں قطعی طور پر ناقابلِ یقین بیانات اور اعداد و شمار شائع کیے جاتے ہیں۔

زبانی روایتوں میں جامع مسجد دہلی کے متعلق ایک روایت سے ہر پرانا دلی والا واقف ہے شاید ناصر نذیر فراق مرحوم کے صاحبزادے سید ناصر خلیق فگار نے (جو راقم کے لڑکپن میں حیات تھے اسے بطور تاریخ لکھا بھی ہے) اس کے مطابق جب جامع مسجد کے معماروں نے مسجد کی بنیادیں ڈال دیں تو نقشے اور پیمائش لے کر غائب ہو گئے۔ شاہ جہاں نے بہت تلاش کرایا، تین برس بعد اچانک نمودار ہوئے، پکڑے گئے۔ دربار میں پیش ہوئے۔ بادشاہ نے جزر و توبیخ اور سزائے قتل (یا کوئی سزا) سناتے وقت وجہ پوچھی۔ عرض کی کہ "ہمارے علم کے مطابق ضروری تھا کہ ان بنیادوں پر تین برساتیں، تین جاڑے، تین گرمیاں گزر جائیں ورنہ وہ اتنی پختہ نہ ہو پاتیں کہ عمارت کا بوجھ صدیوں تک سہہ جائیں۔ حضور شاہ جہاں آباد اور جامع مسجد کی تعمیر میں تاخیر کے روادار نہ تھے اور فنِ تعمیر سے ناواقف بھی ہیں ہم لاکھ حضور سے عرض کرتے کہ اتنا انتظار ضروری ہے۔ اغلب تھا کہ حضور یہ معروضہ تسلیم نہ کرتے۔ چنانچہ ہم نے یہ رسک لیا۔ اگر ہماری نیت میں فتور ہوتا تو ہم دوبارہ حاضر ہی نہ ہوتے۔"

شاہجہاں نے یہ عذر یا موقف قبول کر لیا۔

راقم اس روایت کو خدانخواستہ وہ درجہ نہیں دے سکتا جو حضرت ربانی مرحوم کے منقولہ بالا بیان کا ہے۔ صرف ایک مثال دینے کی جرات کی گئی ہے کہ ربانی صاحب نہ سہی بعض بزرگان پیشیں بڑھا بھی دیتے تھے کچھ زیبِ داستاں کے لیے۔

یہ بیان کسی بھی تاریخ یا داستان سے ماخوذ ہو.... یہ الگ بات کہ بڑا دلچسپ ہے۔ شاہجہانی دور کے جاہ و حشم سے متعلق ایک علامتی حیثیت ضرور رکھتا ہے۔

"قدیم قبریں" (نوٹ: صفحہ ۳۲ تا ۳۹) ایک ایسے قاری کے لیے جو اس مضمون میں اختصاص نہ رکھتا ہو۔ ایک ایسی بیش بہا تحریر ہے جس کی مثال اردو مقالوں میں شاذ ہی ملے گی۔ مصنف نے کئی تقاضوں کا احاطہ کرتے ہوئے اسی دل نشیں انداز میں اتنا مواد پیش کر دیا ہے جس کے شائق قاری کو کئی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا۔ یہ اس مجموعے کا ایک خاص تحفہ کہا جا سکتا ہے۔

"فن اور زندگی" (صفحہ ۱۵۵ تا ۱۵۸) اتنے بڑے موضوع کے مطالبات دیکھتے

ہوئے کافی مختصر مقالہ ہے۔ مگر ربانی صاحب مرحوم کی نہایت گہری نظر کے ساتھ ایک بڑا خوب صورت اجمال بھی جسے آج بھی ایسے مباحث میں رہنمایانہ حیثیت مل سکتی ہے.... اس کے علاوہ کہ یہ ایک روشن خیال فاضل بزرگ کے مختصرات ہیں ان میں فن اور زندگی کے رشتوں پر قدما کا خلاصہ افکار بھی آمیز لگتا ہے۔ انجمن کی ایک اشاعت "افکارِ عالیہ" میں

GREAT IDEAS OF THE VESTERN WORLD

سے ایک مقالہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ آرٹ، (فن) جیسا کہ اکثر قارئین واقف ہوں گے اس سلسلہ کتب میں ۱۰۲ موضوعات پر چون عظیم مغربی دانشوروں کے "رویے" اقوال اور مباحث ایک طرح خلاصہ کیے گئے ہیں۔ یہ سلسلہ برٹے بی کا والوں نے ۱۹۶۸ء میں چھاپا تھا۔ چون جلدوں پر مشتمل بہت مہنگا مجموعہ کتب ہے۔ ہندوستان، پاکستان میں ساتویں دہائی سے پہلے نہیں پہنچا ہوگا۔ اغلب ہے کہ ربانی صاحب کی نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن وہ یقیناً ارسطو سے لے کر پہلی صدی تک کے کئی ایسے بڑے مفکرین سے خوب واقف ہوں گے جنھوں نے فن اور زندگی پر سوچا ہے۔ یہ مختصر مضمون نہ تو ان کے راست حوالے دیتا ہے نہ متعلقہ تفصیلات میں جاتا ہے۔ مگر اس کی سادگی کو محض بزرگانہ خود اعتمادی نہ سمجھا جائے تو یہ ان مباحث میں سے کئی کو سموتا ہوا لگتا ہے۔

راقم کو اعتراف ہے کہ جب تک اس مجموعے کو بالتفصیل نہیں پڑھا تھا اس کا تاثر یہ رہا کہ یہ بزرگ جو ہماری کم نصیبی کے سبب شہرت کے لحاظ سے یہاں اپنی حیثیت کے مطابق اہم قرار نہیں دیے گئے، مولوی صاحب سے شراکتِ کار اور قربت و طوالت تعلق کے سبب قابلِ احترام تو ضرور ہیں، مگر نہ معلوم ان کے مقالے کتنا بتاتے سکھاتے ہیں۔ بادی النظر میں کتابیات کا فقدان کسی قدر پریشان کن بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ راقم زمرۂ فضلا میں شامل نہیں۔ نہ ایسی یادداشت اور فراست سے بہرہ ور کہ مختلف ادوار میں چھپے ہوئے ان کے سب مضامین پڑھتا اور ان کی اہمیت ذہن نشین رہتی۔ مگر جب یہ مقالے بالاستیعاب پڑھے تو بڑی ندامت کے ساتھ حیرت ہو رہی ہے کہ ان کا مجموعہ اتنی تاخیر سے چھاپنے کی ذمہ داری، جس میں کسی

حد تک انجمن بھی شریک رہی، اس پر بھی ہے اور اس لیے وہ اس تاخیر پر صدقِ دل سے معذرت خواہ ہے۔ آج تک ربانی صاحب مرحوم کے لیے کسی نے جویائی نہیں کی تو ہمیں اپنے آپ کو خود یاد دلانا چاہیے تھا کہ یہ فرض جلد ادا ہونا ہے۔ یہ الگ بات کہ ہمارے حالات کے اُتار چڑھاؤ نے، جن کا ذکر راقم نے اکثر مقدموں میں کیا ہے، ہمیں اپنا اشاعتی کام اس طرح نہیں بڑھانے دیا جس کا مطالبہ ایسی اشاعتوں کی اہمیت اور ہمارے عزائم کرتے تھے۔

جب زیرِ نظر کتاب شائع کرنے کا فیصلہ ہوا، ہم کتابت اور کاتب حضرات کی پیدا کردہ معروف دشواریوں میں گھرے ہوئے ٹائپ کو ترجیح دینے پر مجبور تھے (عزیز حامد مدنی مرحوم کی نہایت قیمتی کتاب بھی ٹائپ میں چھپی ہے) اب ہم کمپیوٹر کی طرف جا رہے ہیں۔ کاش اس کتاب کو بھی کمپیوٹر نستعلیق میں لاسکتے (کہ یہی نستعلیق رواج پا رہے ہیں) لیکن ایک تیار کتاب پر دوبارہ اتنا خرچ کرنا ہماری صوابدید میں نہیں آتا۔

ایسے پیارے اندازِ بیان، اتنے متنوع موضوعات، ایسی معلومات اور افکار کے ساتھ یہ پیش کش ایک مایہ افتخار ہے۔ واضح کر دیا جائے کہ ایسے بزرگ مقالہ نگار اپنے بارے میں قارئین کا اعتماد و احترام یقینی سمجھتے ہوئے یہ فرض کر لیا کرتے تھے (اور اب بھی اکثر ایسا ہوتا ہے) کہ ان کے ہر بیان کو تاوقتیکہ وہ کوئی کھلا تنازعہ نہ ہو تحقیقی مقالوں کی طرح قدم قدم پر کتابیاتی حوالوں کی ضرورت نہیں۔ وہ کوئی نیا دعویٰ بھی نہیں کرتے۔ تواریخ، مقبول روایات اور عام معلومات کو ایک دوسرے سے پروتے ہوئے نرم روی کے ساتھ قاری کی اطلاعاتی اور جمالیاتی جہات میں اضافے کر دیتے ہیں غلام ربانی صاحب اس مکتب کے بہترین نمائندوں میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ قارئین ملاحظہ کریں گے کہ یہ مقالے ہمارے ادبی سرمائے کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ ایسے بزرگ ہمارے لیے نہ جانے کیسے کیسے خزانے چھوڑ گئے ہیں۔ ہماری بے بضاعتی، مصالح اور ترجیحاتی خلط ملط کے پیچاک، بھرپور تلاش اور اس کے نتائج عام نہیں کر پائے۔ اب ہم پوری جستجو کر رہے ہیں کہ جناب غلام ربانی مرحوم کے زیادہ سے زیادہ مقالے تلاش و جمع کر کے انھیں دوسرے مجموعوں کی صورت میں شائع

کریں۔ اس مجموعے کے لیے جناب غلام ربانی صاحب کا خصوصی شکریہ ادا کرنا فرض ہے۔ اگر وہ اتنی توجہ نہ فرماتے تو ہم ان انتہائی خوبصورت مضامین کی اشاعت سے بھی محروم رہتے۔

امید ہی نہیں یقین ہے کہ یہ اشاعت کئی لحاظ سے قیمتی بھی مانی جائے گی اور قبول عام بھی پائے گی۔

(۱۹۹۲ء)

بابائے اردو

ڈاکٹر اسلم فرخی

پہلا ایڈیشن

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ایک بہت بڑے آدمی گزرے ہیں۔ ان کی کہانی بڑی دلچسپ بھی ہے اور ہماری ہمت بھی بڑھاتی ہے۔ انھوں نے ہماری قومی زبان کو بڑے بڑے حملوں سے بچایا بھی اور اسے دور دور تک پھیلایا بھی۔ قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے آزادی سے پہلے ہی اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دے دیا تھا۔ سارے مسلمان بھی چاہتے تھے۔ جب کہ ہندوستان کے بعض طاقت ور لوگ اردو کے خلاف ہو رہے تھے۔ بابائے اردو نے جو پہلے ہی اردو کے سب سے بڑے خادم مانے جاتے تھے تحریک پاکستان میں شامل ہو کر اردو بچاؤ اور اردو پھیلاؤ کے مورچے سنبھالے۔ خدا کے فضل سے تحریک پاکستان بھی کامیاب ہوئی اور اردو بھی خوب پھل پھول رہی ہے۔

ہمارے بڑے آدمیوں کی کہانیاں ابھی کم لکھی گئی ہیں۔ انجمن ڈاکٹر اسلم فرخی کی ممنون ہے کہ انھوں نے سادہ زبان میں بابائے اردو کی یہ کہانی اشاعت کے لیے ہمیں دی۔ پروفیسر ڈاکٹر فرخی جامعہ کراچی میں اردو کے استاد تھے۔ ریٹائر ہو کر انجمن کو اس کے علمی ادبی کاموں میں مشورے دیتے رہتے ہیں۔ اور طالب علم اور اردو استاد کی حیثیت سے وہ بابائے اردو کے نام اور کاموں سے پہلے ہی واقف تھے۔ ساتھ ہی انھیں بابائے اردو سے ذاتی تعلقات کا شرف بھی حاصل رہا اور اب انجمن سے تعلق نے انھیں بابائے اردو سے پوری پوری واقفیت کی آسانیاں فراہم کر دیں تو ان کو وہ سب کچھ معلوم ہو چکا ہے جس سے بابائے اردو کی زندگی بنی۔ ان کی یہ کتاب بابائے اردو کی ایک قد آدم تصویر ہے۔

آج کے بچوں کو بڑی عمر میں جا کر تو بابائے اردو کے متعلق اور بہت کچھ پڑھنا پڑے گا لیکن چھوٹی عمر میں انھیں جس حد تک معلوم ہونا چاہیے وہ سب اس کتاب میں موجود ہے۔ انھیں ایک اور بات بھی معلوم ہونی چاہیے تاکہ وہ بڑے ہو کر

اپنے عظیم بزرگوں کے احترام کے عملی ثبوت دیتے رہیں ..... جب بابائے اردو کا انتقال ہوا تو اس وقت کی مقامی حکومت جو علم و ادب کے مشاہیر کی طرف سے لاپروا تھی یہ چاہتی تھی کہ وہ کسی عام قبرستان میں دفن کر دیے جائیں.... میں اس وقت انجمن کا سیکریٹری تو نہیں تھا مگر منتظمہ کمیٹی کا رکن تھا اور مجھے بابائے اردو نے ہی اس کمیٹی میں نامزد کرایا تھا۔ میں نے خفیہ طور پر راتوں رات طلبا سے انجمن کے احاطے میں ایک قبر کھدوائی۔ شہریوں کے مطالبے پر ان کا جنازہ صبح سے دوپہر تک انجمن سے اُٹھا کر بندر روڈ پر لایا گیا۔ جہاں لاکھوں لوگ اسے کندھا دیتے رہے۔ پھر میں جنازے کو واپس انجمن کے احاطے میں لے آیا۔ ہزاروں آدمی ساتھ تھے۔ مقامی حکومت کے کارندے کچھ نہ کر سکے۔ بابائے اردو اپنی خواہش کے مطابق انجمن کے احاطے ہی میں دفن کر دیے گئے۔ اس طرح ان کا مزار انجمن کے دفتر اور وفاقی اردو کالج کی زینت بھی ہے اور ہزاروں عقیدت مند اُن کے مزار پر فاتحہ پڑھتے رہتے ہیں۔

امید ہے کہ یہ خوبصورت انداز میں لکھی ہوئی کہانی جو ایک حقیقت بھی ہے ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ بچوں کو قیمتی معلومات کے ساتھ حوصلہ ملے گا اور ان میں عمل کا شوق بھی پیدا ہوگا۔ بہت سی مشکلوں کے باوجود اپنے وطن، اپنی زبان، اپنے ادب، کی خدمت جم کر کی جائے تو اللہ تعالیٰ ضرور کامیابی عطا کرتا ہے۔ بابائے اردو اس بات کی زندہ مثال تھے ..... اور ہیں۔ پروفیسر اسلم فرخی نے ہم سب کی طرف سے نئی اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک بڑا فرض ادا کر دیا ہے۔

۱۹۹۳ء

مشترک حرفے چند

جمیل الدین عالی

۱۹۹۲ء

یہ حرفِ چند تو ایسی اشاعتوں میں مشترک ہے جو (مدتوں بعد) انجمن دوبارہ چھاپ رہی ہے۔ یہ سب کتابیں آزادی سے پہلے شائع ہوئی تھیں۔ نایاب ہو چکی تھیں اور ان کی اشاعتِ نو پر بہت سے فضلا مسلسل اصرار فرماتے تھے۔ یوں ابھی ہمارے پاس دو سو کے قریب ایسی کتابیں ہیں جو تقسیمِ ہند سے پہلے شائع ہوئیں۔ جن کی افادیت آج بھی مسلم ہے اور جو بازار میں نایاب ہو چکی ہیں بعض ہمارے ذخیرے میں موجود نہیں، بہت سی وجوہ ان کی اشاعتِ نو میں حارج رہیں۔ جنھیں انشاءاللہ آہستہ آہستہ دُور کر دیا جائے گا لیکن فی الحال ہم نے کئی شعبے سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل کا انتخاب کیا۔

(۱) ایران بہ عہدِ ساسانیان
مؤلفہ پروفیسر کرسٹن سین / ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال (یہ علامہ اقبال نہیں)

(۲) تنقیدِ عقلِ محض
ایمانوئیل کانٹ کی شہرہ آفاق کتاب کا ترجمہ۔ از۔ ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم

(۳) جوامع الحکایات (جلد اوّل۔ جلد دوم)
ترجمہ از اختر شیرانی مرحوم

(۴) سعادت یار خاں رنگین
مؤلفہ ڈاکٹر صابر علی خاں

(۵) نفح الطیب
ترجمہ مولوی محمد خلیل الرحمٰن مرحوم

(۶) نوادر الالفاظ
مرتبہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم

(۷) الف لیلہ ولیلہ (جلد اوّل تا جلد ہفتم یعنی پوری سات جلدیں)
ترجمہ ڈاکٹر ابوالحسن منصور مرحوم

(۸) تاریخ الحکما
ترجمہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم

(۹) روسی ادب (جلد اوّل و جلد دوم)
مؤلفہ پروفیسر محمد مجیب مرحوم (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

روسی ادب کا بیشتر حصّہ ۱۹۳۰ء تک تیار ہو گیا تھا۔ پھر بقول مؤلف وہ اگلے آٹھ برس تک نظرِ ثانی کرتے رہے۔ کتاب ۱۹۴۰ء میں چھپی۔ اس میں بعد از انقلابِ روس کے مصنّفوں کا ذکر نہیں اور ملاحظہ کیجیے کہ فاضل مؤلف کی (جنھوں نے آگے جا کر بڑی شہرت اور فضیلت کی منزلیں طے کیں۔ گو راقم ان کی بعد از تقسیم ایک بہت ہی مشہور تالیف "دی انڈین مسلمس" کے بعض حصّوں سے سخت اختلاف رکھتا ہے) انتہائی ایماندارانہ اور خالص علمی وضاحت جو انھوں نے جلد اوّل کے مختصر سے دیباچے میں پیش کر دی ہے۔ واضح رہے کہ پروفیسر مرحوم روسی زبان خوب جانتے تھے۔

"...... سب سے زیادہ اندیشہ مجھے ان دوستوں کی طرف سے ہے جنھیں روس کی قدر کرنا انقلاب کی تعلیم نے سکھایا ہے اور جنھیں صرف روسی ادب کے اس حصّے سے مطلب ہے جو انقلاب کی طرح تازہ اور انقلاب کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ حضرات شاید اس کتاب کو ایک صریحی دھوکا سمجھیں۔ اس لیے کہ انقلاب کے زمانے کے نئے مصنّفوں کا اس میں ذکر ہی نہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے ان نظریوں سے اتفاق ہے جو انقلاب کے زمانے میں ادب اور ادیبوں کے فرائض سمجھانے کے لیے پیش کیے گئے ہیں لیکن اس کا بھی یقین دلانا چاہتا ہوں کہ روسی ادب کی اس تاریخ میں یہ کمی کسی اصولی اختلاف کی وجہ سے نہیں رہ گئی اس کا سبب صرف

میری معذوری ہے۔ میں اس زبان کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جو روس میں اچانک انقلابی تحریک کے ساتھ رائج ہو گئی اور اس زمانے کی تصانیف اہلِ زبان میں حاصل کرنا خاصا دشوار بھی تھا (حکومت برطانیہ کی عائد کردہ پابندیاں)

اس وضاحت کا یہ حصہ خاص طور سے اس لیے نقل کیا گیا ہے کہ ان دو جلدوں کی اشاعتِ نو کے بارے میں کوئی سیاسی غلط فہمی نہ ہونے پائے اور اس لیے بھی یہ کہ ایک بڑے فاضل، عالم اور استاد کی سچائی اور منکسر المزاجی کے حوالے سے ہمارے تنقیدی، تالیفی عہد کو ایک ہزار معانی نمونہ بھی پیش کرتا ہے..... راقم کو یہ حصہ تمام کتابوں کے حرفے چند میں آجانے پر ذرا تردد نہیں۔ شاید یہ ان تمام اشاعتوں کے محترم قارئین کے لیے ہماری یہ اشاعت حاصل کرنے کی تشویق و ترغیب بھی فراہم کرے..... اس طرح ہمارا مالی نقصان کچھ کم بھی ہو سکے گا اور قارئین کو پیش از انقلاب روسی ادب پر ایک بڑے مستند مؤلف کی محنت سے استفادے کا موقع بھی مل جائے گا.....

ان نو اشاعتوں کے ساتھ درج ذیل کتابیں بھی دوبارہ شائع ہو رہی ہیں جو آزادی کے بعد انجمن نے پاکستان منتقل ہو کر چھاپی تھیں۔ ان کی طلب اور ضرورت بھی مسلم ہے:

(۱) اُردو تنقید کا ارتقا

از ڈاکٹر عبادت بریلوی

(۲) اُردو انگریزی ڈکشنری

از بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم۔ یہ اس کا پانچواں ایڈیشن ہے۔

(۳) اسٹوڈنٹس انگریزی اُردو ڈکشنری

از بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم (تیرھواں ایڈیشن)

(۴) میر تقی میر

از ڈاکٹر جمیل جالبی (یہ ہمارے بابائے اُردو یادگاری خطبات میں سے

ایک ہے)

(۵) غالب کے خطوط

(جلد اول) مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم

مناسب ہے کہ اس مشترکہ حرفے چند میں اول الذکر گروپ سے چند کتابوں کا بہت ہی مختصر ذکر کر دیا جائے، جن کے عنوان سے متن کا اندازہ پورا نہیں ہوتا۔ روسی ادب کے ایک پہلو پر چند سطریں اوپر آ ہی چکی ہیں۔

(۱) ایران بہ عہد ساسانیان

یہ ترجمہ جو خاص انجمن کی فرمائش پر ہوا بڑی تاریخی اور علمی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر تاریخ بھی ایک ارتقائی تسلسل ہے تو ہم اپنے عزیز و محترم ہمسائے جدید ایران کو بھی عہد ساسانی کا مطالعہ کیے بغیر پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ ڈاکٹر محمد اقبال ایک نہایت فاضل بزرگ گزرے ہیں۔ بابائے اُردو ان سے اپنے مراسم خاص کی بنا پر یہ ترجمہ کرا سکے تھے۔

(۲) تنقید عقلِ محض

فلاسفہ عالم میں کانٹ کا مقام اور مشکل بیانی مسلم ہے مگر بابائے اُردو مرحوم نے ڈاکٹر عابد حسین مرحوم سے اس کا ایسی خوب صورت اور رواں اُردو میں ترجمہ کرا کے آج سے ۵۱ سال پہلے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اُردو میں کانٹ جیسے فلسفی کے ایسے ایسے گہرے اور بسیط افکار بھی سما سکتے ہیں......

(۳) نفح الطیب

علامہ مقری کی مشہور کتاب اندلس پر تھی (ہے) اس کا ترجمہ اپنی علمی اہمیت کے علاوہ آج اندلس میں ہماری بڑھتی ہوئی دلچسپی کے لیے بیش قیمت پس منظریہ مواد فراہم کرتا ہے۔

(۴) الف لیلہ ولیلہٗ

اس کے کئی اُردو ترجمے ہوئے تھے، مگر رائج ہوا ایک نہایت ناقص ترجمہ جو نول کشور پریس سے چھپا تھا.... ضرورت تھی کہ ایک مستند ترجمہ کسی مستند عالم ادیب سے کرایا جائے۔ ڈاکٹر ابوالحسن منصور، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھاتے

تھے۔ بابائے اُردو کی فرمائش پر انھوں نے یہ بہت ہی خوب صورت ترجمہ کیا جسے جدید خطوط پر ترتیب کر کے چھاپا گیا۔ الف لیلۂ ایک زندہ سلسلۂ داستان ہے۔ اُمید ہے یہ ترجمہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

(۵) اُردو تنقید کا ارتقا

یہ دراصل ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کا تحقیقی مقالہ ہے جو پاک و ہند کی بیشتر جامعات میں شاملِ نصاب ہے۔ اس پر بابائے اُردو نے خود مقدمہ لکھا تھا (نئی اشاعت میں بھی شامل ہے) اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۶) غالب کے خطوط

یہ تین جلدوں میں ہیں لیکن فی الحال پہلی جلد کی اشاعت دوبارہ کی جا رہی ہے۔ کیوں کہ پہلی اشاعت ختم ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم انجمن ترقی اُردو ہند کے معتمد ہیں۔ انھوں نے کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد غالب کے تمام دستیاب خطوط اپنی تحقیق و ترتیب کے ساتھ جمع کر دیے ہیں۔ انجمن نے ان سے پاکستان میں اشاعت کے لیے حقوق لے رکھے ہیں۔ یہ تمام ان ماہرین غالبیات کی رائے میں جنھوں نے اس تدوین پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ تاحال خطوطِ غالب کی سب سے بہتر اور جامع تدوین ہے۔ اس پر ڈاکٹر خلیق انجم کا تفصیلی مقدمہ خاصے کی چیز ہے..... چوتھی جلد ابھی ہندوستان میں بھی شائع نہیں ہوئی۔ (جب شائع ہوگی۔ انجمن پاکستانی ایڈیشن بھی شائع کر دے گی)

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راقم جرأت کرتا ہے کہ اسی حرفِ چند میں انجمن کی کتابوں کا مختصر ذکر کر دے۔ جو قبل تقسیم اور بعد تقسیم شائع ہو کر ہماری دنیائے فکر و تہذیب میں بڑے اہم اضافے کر چکی ہیں۔ یہ الگ بات کہ ہم اپنے کن خزانوں کو پہچانتے ہیں اور ان سے کس حد تک فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تہذیبی تربیت کئی جہتوں میں ہوتی ہے۔ انجمن نے سائنس جیسے "خشک" مضمون سے لے کر بنیادی فلسفیانہ مباحث جیسے ادق موضوعات کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادب، قدیم اُمہات الکتب، عمرانیات، سوانح، قدیم مخطوطات ..... نئی تنقید ..... تقریباً تمام تہذیبی موضوعات پر اعلیٰ معیار کی اشاعتیں پیش کی ہیں اور کیے جاتی ہے۔ یہ تجارتی لحاظ سے

تاحال ایک نہایت غیر منافع بخش سودا ہے۔ مگر یہ تیسری دنیا کی جاریہ خصوصیات میں سے ایک ہے اور نہایت کم شرح خواندگی کا ایک ناگزیر نتیجہ بھی کہ جو لوگ پڑھ بھی سکتے ہیں۔ سنجیدہ کتابوں کی طرف توجہ نہیں کرتے ..... اگر رفتہ رفتہ معیاری اشاعتوں کی تعداد میں مقدار کے لحاظ سے یہ معمولی اضافے بھی نہ ہوتے رہیں جو ہم اور دوسرے علمی ادارے کرتے رہتے ہیں تو انسان کے اندر کا وحشی کہیں زیادہ خونخوار درندہ بن جائے۔ ادب ہمارے اندر کے وحشی درندے کو پوری طرح مار نہ سکے، کسی حد تک سدھاتا اور رام کرتا رہتا ہے.....

چونکہ انجمن تقسیم پر ہندوستان سے بڑی افراتفری میں کراچی آئی اور دہلی میں اس کا بہت سا ریکارڈ جل بھی گیا اس لیے ابھی تک یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی کُل اشاعتیں کتنی ہیں۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ انجمن قائم ۱۹۰۳ء میں ہوئی تھی مگر بوجوہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ کا ایک شعبہ رہی۔ ۱۹۵۰ء تک کی پوری تاریخ انجمن کی پنجاہ سالہ جوبلی از سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم (۱۹۵۱ء) میں ملتی ہے۔ اس کی ابتدائی روایتوں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مگر اولین باقاعدہ کتابی اشاعتوں کے مستند اذکار اس میں بھی جمع نہیں ہو سکے۔ (جب سے ہم نے شعبہ تحقیق نئی عمارت میں منتقل کیا ہے۔ ہمارے ہاں کام کرنے والے مہمانوں اور کارکنوں کو کسی قدر سکون بھی ملا اور کاغذات و دستاویزات بھی مناسب طور پر مرتب کیے جا رہے ہیں۔ انشاءاللہ بہت جلد ان سے کئی نئے حقائق برآمد ہونے کی توقع ہے۔ فی الحال یا تاحال ہم ایک رجسٹر پر حصر کرتے ہیں جس کی رو سے ہماری پہلی کتاب یا اشاعت "مبادی سائنس" ہے۔ یہ ایک ترجمہ تھا۔ مترجم معشوق حسین خاں۔ سال اشاعت ۱۹۱۰ء۔ برسبیلِ تذکرہ۔ ۱۹۱۰ء جیسے دور میں جب اس کے سابق معتمد علامہ شبلی نعمانی حیات تھے اور سرپرستی فرماتے تھے۔ جب مولوی عزیز مرزا معتمد تھے (اور بابائے اُردو معتمد نامزد نہیں ہوئے تھے) انجمن کا سائنس کو اپنی اولین ترجمات میں شامل کرنا کیا ثابت کرتا ہے؟ اہلِ نظر خود سوچ سکتے ہیں:

شروع سے اب تک ہمارے پاس ۴۹۸ کتابوں کی فہرست موجود ہے، مگر قیاس غالب ہے کہ کتابیں پانسو سے زیادہ چھپ چکی ہیں۔ کئی کا اندراج ہونے سے رہ گیا

ہے۔ بعد از تقسیم مولوی صاحب کی وفات تک انجمن پر پاکستان میں جو اچھے بُرے دن گزرے۔ وہ مولوی صاحب کے کتابچے "انجمن کا المیہ" میں آگئے ہیں۔ اس کے بعد بھی ۱۹۵۹ء تک وہ اور انجمن سخت ابتلا میں رہے۔ ۱۹۵۹ء میں تنظیم نو شروع ہوئی تو سرکاری انتظامیہ نے اشاعتوں پر ان کی توجہ نہیں ہونے دی۔ چھوٹے چھوٹے دفتری مسائل میں پھانسے رکھا (یہ داستان کبھی الگ سے بیان ہوگی) ۱۹۶۱ء میں وہ سخت بیمار ہو گئے۔ ۱۶ اگست کو انتقال کر گئے (پھر نیا دستور بنا، نئے صدر جناب اختر حسین مرحوم آئے، راقم ۱۹۵۹ء میں ڈاکٹر ریاض الحسن مرحوم کے ساتھ عارضی سرکاری منتظمہ میں مولوی صاحب کی طرف سے نامزد غیر سرکاری رکن تھا (دیگر اراکین کچھ اعلیٰ افسران بلحاظ عہدہ تھے مثلاً کمشنر کراچی اور سیکریٹری کمشنر کراچی بہ طور معتمد انجمن) اس زمانے میں کوئی نئی اشاعت ظہور پذیر نہ ہو سکی۔ بمشکل ماہنامہ "قومی زبان" اور سہ ماہی "اردو" بے قاعدگی کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۶۲ء میں نیا دستور بنا۔ اختر حسین صاحب سابق گورنر مغربی پاکستان، صدر اور راقم معتمد اعزازی مقرر ہوئے۔ جناب مشفق خواجہ سابق شعبہ علم و ادب کے نگراں تھے۔ ہم بعض نامور اور فاضل متولیان کو بھی تنظیم میں لے آئے۔ پروفیسر رضی الدین صدیقی، راجہ امیر محمد خاں محمود آباد، مسٹر جسٹس انعام اللہ خاں، ممتاز حسن، ڈاکٹر نذیر احمد، پیر حسام الدین راشدی، مولانا عبدالقادر، ڈاکٹر سید عبداللہ، (سیٹھ احمد داؤد اعزازی خازن مقرر ہوئے تھے۔ کئی برس رہے، مگر انجمن ان سے ایک پیسہ بھی نہ لے سکی) پھر حاجی عبدالرزاق دہلوی مرحوم اعزازی خازن مقرر ہوئے۔ انھوں نے کافی عملی دلچسپی لی) ایک وقت میں میر خلیل الرحمٰن، جمیل نشتر اور ابن حسن برنی بھی متولیان میں شامل ہو گئے تھے۔

انجمن نے دوسرے منصوبوں اور مہمات کے علاوہ جو اشاعتی خدمات سر انجام دی ہیں ان کی ایک جھلک مندرجہ ذیل فہرستِ کتب سے ملتی ہے۔ دورِ اول تو تمام تر بابائے اُردو سے ہی منسوب ہے۔ دورِ دوم کے دوران معتمدِ اعزازی تو راقم الحروف ہی رہا تھا مگر صدور تین ہوئے۔ جناب اختر حسین مرحوم (۱۹۶۲ء تا ۱۹۸۳ء) جناب قدرت اللہ شہاب (۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۷ء) اور جناب نور الحسن جعفری ۱۹۸۷ء تا وقت تحریر

..... اللہ تعالیٰ انھیں سلامت رکھے۔ اپنے وسیع انتظامی اور مالی تجربے سے انجمن کی بنیاد بھی مضبوط کرتے جاتے ہیں۔ تمام منصوبوں کی سرپرستی پوری توجہ سے فرماتے ہیں۔ دفتر مقررہ ایام و اوقات میں باقاعدہ آتے ہیں۔

فہرستِ کتب

(یہ ایک منتخب فہرست ہے)

مخطوطاتِ انجمن ترقی اُردو (اُردو) مرتبہ: افسر صدیقی

انجمن کے کتب خانے میں اُردو مخطوطات کا ایک نادر ذخیرہ موجود ہے ان میں بعض مخطوطے ایسے ہیں جن کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہے اور وہ انجمن کے ذخیرے میں ہے۔ چھ حصوں پر مشتمل مخطوطاتِ انجمن کی یہ توضیحی فہرست اُردو میں تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے معلومات کا ایک اہم خزینہ ہے۔

مخطوطاتِ انجمن ترقی اُردو (فارسی) مرتبہ: سید سرفراز علی

انجمن کے فارسی، عربی مخطوطات کی توضیحی فہرست

مآخذات: مرتبہ سید سرفراز علی

مصنّفوں، شاعروں، ادیبوں کے ناموں کی توضیحی لُغت۔ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مستند حوالوں کا بیش بہا مجموعہ۔ سید سرفراز علی رضوی نے بڑی محنت اور تحقیق سے یہ حوالہ جاتی لُغت مرتب کی ہے۔ دو حصے پہلے شائع ہو چکے ہیں تیسرا حصہ ۱۵۱۲ مصنّفوں، شاعروں اور مشاہیر کے حوالوں پر مشتمل ہے۔

مصطلحاتِ علوم و فنون عربیہ۔ مؤلف محی الدین غازی اجمیری

علوم مشرقی کی اصطلاحات کی توضیحی لُغت۔ یہ لُغت اُردو میں اپنی نوعیت کی واحد تالیف ہے جسے بڑی دیدہ ریزی اور محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ راقم کی کچھ سوالاتی جرائیں بھی شامل ہیں۔

اشاریہ اُردو

انجمن کا علمی ادبی رسالہ "اُردو" اُردو کے قدیم ترین جاری رسائل میں ہے۔ برصغیر کے تمام مستند اہلِ قلم کے مضامین اس رسالے میں شائع ہوتے رہے ہیں اور

اکثر و بیشتر مضامین مستند علمی حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

"اُردو" میں شائع شدہ مضامین کا یہ اشاریہ ۱۹۶۲ء تک کے مضامین پر محیط ہے۔

اسٹینڈرڈ۔ انگریزی اُردو ڈکشنری۔

(۱۹۶۸ء سے اب تک پانچ ایڈیشن)

انجمن نے بڑے اہتمام اور محنت سے بابائے اُردو کی سرکردگی میں برصغیر کے منتخب اہلِ علم کی ایک جماعت سے انگریزی اُردو کی ایک مستند لغت مرتب کروائی تھی۔ یہ لغت پہلی بار ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی تھی بعد کی اشاعتوں میں مفید اضافے بھی ہوتے رہے۔ چوتھا ایڈیشن متعدد اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ بائیبل پیپر پر چھپی ہوئی یہ لغت کنسائز آکسفرڈ ڈکشنری کے نمونے پر مرتب ہوئی ہے۔

پاپولر انگریزی اُردو ڈکشنری (ساتواں ایڈیشن)۔

یہ اسٹینڈرڈ ڈکشنری کا اختصار ہے جو عام قاری کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔

اسٹوڈنٹس انگریزی اُردو ڈکشنری (تیرھواں ایڈیشن)۔

یہ ڈکشنری طلبہ کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ اس میں وہ تمام الفاظ شامل ہیں جو نصابی کتابوں میں بالعموم استعمال ہوتے ہیں۔

اُردو انگریزی ڈکشنری (چار ایڈیشن آچکے ہیں اب پانچواں آرہا ہے)۔

اُردو الفاظ کے انگریزی مترادفات پر مشتمل یہ ڈکشنری عام قاری اور اہلِ علم دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

پاکٹ انگریزی اُردو ڈکشنری (چوتھا ایڈیشن)۔

طلبہ اور عام قاری کے لیے مفید علمی تحفہ۔ انجمن نے یہ جیبی ڈکشنری بائیبل پیپر پر بڑے اہتمام سے شائع کی ہے۔

لغت کبیر (الف مقصورہ)

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اُردو زبان کی ایک مبسوط لغت مرتب کرنا شروع کی تھی لیکن اس کام کا بڑا حصہ ۱۹۴۷ کے انقلاب میں ضائع ہوگیا۔ مسودے کا

جو حصہ محفوظ رہ گیا تھا وہ الف ممدودہ اور الف مقصورہ پر مشتمل تھا جسے انجمن نے دو جلدوں میں شائع کر دیا۔ فی الحال صرف جلد دوم دستیاب ہے جو الف مقصورہ پر مشتمل ہے۔

نصرتی۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق

بیجاپور کے ملک الشعرا نصرتی کی شخصیت اور فن کا پہلا مستند اور مبسوط جائزہ۔
انتخابِ کلام شرح اور مفید حواشی۔ بابائے اُردو کا ایک اہم علمی کارنامہ۔

مقالات اخطباتِ گارسین دتاسی

گارسین دتاسی انیسویں صدی کا وہ نامور مستشرق اور شیدائے اُردو تھا جس نے برصغیر سے کالے کوسوں دور پیرس میں رہ کر اُردو زبان وادب کے نہایت اہم اور مفید سالانہ جائزے پیش کیے اُردو کے مشہور شاعر ولی کا دیوان مرتب کر کے پیرس سے شائع کیا اور ساری زندگی اُردو کی خدمت میں گزاری۔

مقالات

، دتاسی کے سالانہ ادبی اور علمی جائزوں کے مجموعے ہیں، جن سے اُس عہد کی علمی، ادبی، لسانی اور تعلیمی صورت حال پوری طرح واضح ہوتی ہے۔ انجمن نے بڑے اہتمام سے یہ جائزے اُردو میں منتقل کرائے ہیں۔

مترجمین میں سرراس مسعود، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ڈاکٹر حمید اللہ جیسے اہلِ علم شامل ہیں۔

اُردو تھیٹر۔ مؤلفہ: ڈاکٹر عبدالعلیم نامی (چار جلدیں)

اُردو ڈراموں کی مکمل انسائیکلوپیڈیا ہے۔ فاضل مؤلف نے ایک طویل عرصے کے مطالعے اور معلومات جمع کرنے کے بعد اُردو ڈراموں، ڈرامہ نگاری اور ڈرامہ کمپنیوں کی توضیحی فہرست مرتب کی ہے جس سے اُردو ڈرامے کی پوری کیفیات اور تاریخ کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں مرتب ہوئی ہے۔ فی الحال صرف جلد دوم، سوم اور چہارم موجود ہیں۔

اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ۔ از مولوی عبدالحق

بابائے اُردو کا وہ معرکہ آرا مقالہ جس میں اُردو زبان کے فروغ میں صوفیائے کرام کی سرپرستی کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مقالے کو اُردو تحقیق میں ایک مستند دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

اقبال۔ مرتبہ: بابائے اُردو مولوی عبدالحق

علامہ اقبال کی وفات کے فوراً بعد شائع ہونے والا رسالہ "اُردو" کا اقبال نمبر جو اپنے مضامین، اقبال کا تصورِ خودی، رومی، نطشے، اقبال اور اقبال آرٹ کی وجہ سے اقبال شناسی میں غیر معمولی اہمیت کا حامل سمجھا گیا۔ نئے ایڈیشن میں بعض نئے مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اختر شیرانی۔ ڈاکٹر یونس حسنی

مشہور نغمہ طراز شاعر اختر شیرانی کے مستند سوانح اور ان کے فن کا محققانہ جائزہ۔ ڈاکٹر یونس حسنی کی یہ تالیف اختر شیرانی کے آثار و افکار کا مبسوط اور مستند جائزہ ہے۔

جمالیات اور اُردو ادب = ڈاکٹر ریاض الحسن

ڈاکٹر ریاض الحسن جمالیات کے خصوصی مطالعہ کی وجہ سے ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اُردو میں جمالیات کے حوالے سے پہلی تعارفی کتاب تالیف کی تھی۔ "جمالیات اور اُردو ادب" ڈاکٹر صاحب کا بابائے اُردو یادگاری لیکچر ہے جس میں جمالیات کے حوالے سے اُردو ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مشہور اطالوی مصنف کروچے کی کتاب "جمالیات" کا تقریباً پورا ترجمہ اطالوی سے براہ راست ہمارے لیے کر گئے ہیں ترجمہ انشاءاللہ پورا ہونے پر شائع کیا جائے گا۔

رسالہ شگن (لُولُوئے از غیب) = مرتبہ: ڈاکٹر محمد ایوب قادری

عہد عالم گیری کی ایک مثنوی۔

مرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزمِ ادب = سید حسام الدین راشدی۔

عہدِ اکبری و جہانگیری کے معروف سندھی امیر مرزا غازی بیگ ترخان کے

عہد کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا تفصیلی مرقع۔ سندھ کے نامور محقق سید حسام الدین راشدی کا اہم علمی کارنامہ۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق ۔ حیات اور علمی خدمات

شہاب الدین ثاقب

بابائے اُردو کی حیات اور کارناموں کا محققانہ جائزہ۔ بابائے اُردو کے بارے میں ایک مستند علمی دستاویز

اسلوبیاتِ میر ۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

خدائے سخن میر تقی میر کے کمالِ شعری کا تنقیدی جائزہ۔ ڈاکٹر نارنگ کی یہ تالیف عہدِ نو میں میر کی تفہیم کے سلسلے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک بابائے اُردو یادگاری خطبہ ہے۔

مقالاتِ برنی ۔ جلد اول و دوم: سید حسن برنی

سید حسن برنی برصغیر کی تاریخ اور علم و ادب پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کے تاریخی علمی اور ادبی مقالات مختلف رسائل اور اخبارات میں بکھرے ہوئے تھے۔ انجمن نے بڑی محنت سے ان متفرق مضامین کا ایک انتخاب مرتب کیا ہے۔ جن سے تاریخ اور علم و ادب کے مختلف گوشے روشن ہوئے ہیں۔

البیرونی ۔ سید حسن برنی

نابغۂ روزگار البیرونی کے بارے میں شائع ہونے والی پہلی (۱۹۱۵ء) اُردو کتاب جو آج بھی اس موضوع پر مستند ترین تالیف ہے۔ اس تصنیف کے بعد سے پاکستان میں البیرونی پر جو بین الاقوامی مذاکرے ہوئے اور دوسرا تحقیقی کام ہوا، راقم الحروف نے اس کا ایک طویل خلاصہ بھی شامل کر دیا ہے۔

ہندوستان، پس منظر و پیش منظر ۔ سید محمد تقی

معروف دانش ور سید محمد تقی نے اس تالیف میں ہندوستان کی تاریخ، سیاست، سماجی زندگی اور معاشی ڈھانچے کا معروضی جائزہ لیا ہے۔

تلخیصِ معلیٰ۔ مؤلفہ: کلب حسین نادر۔ مرتبہ: ڈاکٹر انصار اللہ نظر

کلب حسین نادر کی یہ کتاب مدت سے کمیاب تھی۔ ڈاکٹر نظر نے اسے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے زبان واصول و اصلاح زبان کے سلسلے میں ایک اہم تحقیقی تالیف۔

فن شاعری۔ ارسطو... ترجمہ: پروفیسر عزیز احمد

ارسطو کی مشہور تصنیف بوطیقا کا اُردو ترجمہ۔ بوطیقا شعری تنقید کی بنیاد ہے اور ملک کی تمام دانش گاہوں کے نصاب میں شامل ہے۔

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی۔ انشاء اللہ خاں انشا

سید انشا کی طباعی کا نادر نمونہ، وہ داستان جس میں صرف ہندی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک پرمغز مقدمے کے ساتھ۔

پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو۔ سید ہاشمی فرید آبادی

برصغیر میں اُردو تحریک کی مستند دستاویز۔ انجمن ترقی اُردو کے قیام ۱۹۰۳ء سے ۱۹۵۳ء تک کے دور کا علمی، ثقافتی اور سیاسی جائزہ۔ تحریک پاکستان میں اُردو کے کردار کی مکمل توضیح اس کتاب کے آخری ابواب بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے لکھے ہوئے ہیں۔ جن میں ۱۹۴۷ء کے دلدوز واقعات، بعض ہندوستانی اربابِ حکومت کی اُردو دشمنی اور انجمن کے ہندوستان سے پاکستان منتقل ہونے کی روداد ہے۔

تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت

جلد اوّل۔ دوم۔ سید ہاشمی فرید آبادی۔

برصغیر کی تاریخ کا مستند اجمالی خاکہ۔ ممتاز مورخ سید ہاشمی فرید آبادی کی یہ تالیف پاکستان میں لکھی جانے والی برصغیر کی پہلی تاریخ ہے جسے تاریخ کے معاصر ماخذات سے براہِ راست مرتب کیا گیا ہے۔ سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ تہذیبی، معاشرتی اور علمی پس منظر کو بڑی خوبی کے ساتھ اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ پاکستان میں نصابی حیثیت رکھتی ہے۔

پہلی جلد میں برصغیر کی قدیم تاریخ، مسلمانوں کی آمد آمد، سندھ، پنجاب اور بعد ازاں پورے برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے عہد اورنگ زیبی تک کے واقعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسری جلد عہد اورنگ زیبی سے قیامِ پاکستان کے

ابتدائی دور کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

دریائے لطافت۔ مصنفہ انشا اللہ خاں انشا

مترجمہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

علم اللسان ہفت زبان شاعر انشا اللہ خاں انشا کی مشہور قواعد اُردو جسے قواعد میں بنیادی حوالے کی حیثیت حاصل ہے یہ اُردو کے علم اللسان۔ قواعد۔ انشا، محاورات اور روزمرہ کے بارے میں اُردو زبان کے ملکی ماہر کی مرتب کی ہوئی پہلی کتاب ہے اور اس کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ پنڈت کیفی نے انشا کی اس معرکہ آرا کتاب کا ترجمہ بھی نہایت رواں دواں اور سلیس انداز سے کیا ہے۔ عرصے سے کمیاب تھی اب انجمن نے دوسرا ایڈیشن اہتمام سے شائع کیا ہے۔

چراغِ شناسائی۔ مرتبہ: ڈاکٹر محمد حنیف فوق

اردو، فارسی کی طرح رباعی کی صنف ترکی زبان میں بھی ہے۔ معروف ترک شاعر فواد بایرام اوغلو کی رباعیوں کا منظوم اُردو ترجمہ۔ ابتدا میں رباعی کے فن پر تفصیلی اظہارِ خیال۔ ترکی کے رجحانات اور روایت کا مُرقّع۔ یہ مجموعہ پاک ترک دوستی اور برادرانہ تعلقات کے سلسلے میں ثقافتی اور ادبی افہام و تفہیم کی شاندار کوشش ہے۔

غزل نما۔ مرتبہ: ادا جعفری

اُردو کے بے شمار خوش نوا شاعر ایسے بھی ہیں جن کے نام اور کلام سے عام پڑھنے والے واقف نہیں۔ بڑھتی ہوئی مصروفیتوں کے اس دور میں عام قاری کے لیے ایسے شعرا کے دیوان تلاش کرنا اور پڑھنا ممکن نہیں رہا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اُردو کی مشہور شاعرہ ادا جعفری نے "غزل نما" میں ان بزرگ شعرا کے کلام کا انتخاب کیا ہے جن کا کلام آسانی سے دستیاب نہیں۔ شاعروں کے کلام کے ساتھ ساتھ ان کے حالات بھی مختصر طور پر قلم بند کیے گئے ہیں۔ یہ انتخاب شعری سلیقے اور غزل کی روایت سے گہری شناسائی کا مظہر ہے۔

داستانِ زبان اُردو - ڈاکٹر شوکت سبزواری

اُردو زبان کی ابتداء، ارتقا اور تشکیل کے مختلف مدارج کا تحقیقی جائزہ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری لسانیاتی مطالعے کے ایک اہم عالم تھے۔ داستانِ زبان اُردو میں انھوں نے سائنٹفک انداز سے اُردو زبان کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے یہ کتاب مختلف جامعات میں شاملِ نصاب ہے۔

پاکستان میں اُردو تحقیق - ڈاکٹر معین الدین عقیل

قیامِ پاکستان سے ۱۹۸۴ء تک پاکستان میں اُردو تحقیق نے جو سفر طے کیا ہے اس کا معروضی اور علمی جائزہ۔ پاکستان میں اُردو تحقیق کے مزاج و منہاج کی معتبر دستاویز۔ پاکستان میں اُردو تحقیق ایک متوازن جائزہ ہے جس سے پاکستان میں اُردو تنقید و تحقیق کا اندازہ ہوتا ہے۔

ابنِ انشا، احوال و آثار - ڈاکٹر ریاض احمد ریاض

ممتاز شاعر اور مزاح نگار ابنِ انشا کے فکر و فن کا مبسوط اور تحقیقی جائزہ۔ اس مقالے پر پنجاب یونیورسٹی نے مصنّف کو پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔

ہندی اُردو کے جدید مشترک اوزان - ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی

اُردو اور ہندی کے مشترک اوزان کے حوالے سے اُردو عروض کا محققانہ جائزہ۔

مولانا احسن مارہروی۔ آثار و افکار - ڈاکٹر صابر جلیسری

دبستانِ داغ کے مشہور شاعر اور محقق مولانا احسن مارہروی خدمتِ زبان و ادب کی وجہ سے ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ مولانا احسن طویل عرصے تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اُردو میں ... سے انجام دیتے رہے تھے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صابر جلیسری نے مولانا کے آثار و افکار کا محققانہ جائزہ لیا ہے۔

مضامینِ اختر جونا گڑھی - قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی اُردو ادب میں اپنے محققانہ فکر، بالغ نظری اور ادبی سوجھ بوجھ کی وجہ سے ممتاز مرتبے کے حامل ہیں۔ یہ مجموعہ قاضی صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا انتخاب ہے جس میں ولی کے بارے میں ان کے معرکہ آرا مضامین بھی شامل ہیں۔

تنقید اور جدید اُردو تنقید ۔ ڈاکٹر وزیر آغا

اُردو کے ممتاز نقاد ڈاکٹر وزیر آغا کا اُردو تنقید اور جدید تنقید کا ماہرانہ تجزیہ جو اُردو تنقید کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ بابائے اُردو یادگاری لیکچر کے سلسلے میں ایک اہم کڑی۔

کاروانِ صحافت ۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

اُردو صحافت کا محققانہ جائزہ۔ اُردو صحافت کے مختلف پہلوؤں کا مستند مُرقّع۔ یہ کتاب ملک کی مختلف جامعات میں داخلِ نصاب ہے۔

مولانا صلاح الدّین احمد ۔ مرتبہ: ڈاکٹر وزیر آغا۔ ڈاکٹر انور سدید

مولانا صلاح الدّین احمد منفرد اور صاحبِ طرز انشا پرداز۔ تحریک اُردو کے نامور مجاہد صاحبِ کردار اہلِ قلم تھے۔ انھوں نے ساری زندگی زبان و ادب کی خدمت میں گزاری اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی مولانا کے بارے میں لکھے جانے والے مضامین کا انتخاب ان کے آثار و افکار کا مبسوط جائزہ ہے۔

جدید اُردو شاعری ۔ از عزیز حامد مدنی

عزیز حامد مدنی عصرِ حاضر کے اہم شاعر اور دانش ور تھے۔ جدید اُردو شاعری حصّہ اوّل میں اس اہم شاعر اور دانش ور نے اپنے عہد کی شاعری کے پس منظر، فضا اور شعری تحریکوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ایک بڑے فنکار کے خیالات و افکار کا نادر مُرقّع۔ ایک مستند ادبی دستاویز۔

دیوانِ حسن شوقی ۔ مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی

دکن کے مشہور مثنوی نگار اور غزل گو شاعر حسن شوقی کا دیوان جس میں جنگ تالی کوٹ کے حوالے سے مثنوی فتح نامہ نظام شاہ بھی شامل ہے۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ نظامی دکنی۔ مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی

اُردو زبان کی پہلی مثنوی جو نویں صدی ہجری کی تصنیف ہے۔ اُردو شاعری کا قدیم ترین نمونہ، اس مثنوی کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہے جو انجمن کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے افسر امروہوی مرحوم کی معاونت سے اس نسخے

سے متن مرتب کیا تھا اور ایک عالمانہ مقدمہ لکھا۔ اس پر راقم کا "حرفے چند" تاریخ مخطوطہ بیان کرنے کے علاوہ اس کے متنی مفاہیم پر ڈاکٹر جالبی کے موقف سے مختلف اسلامی علامتوں کے حوالے سے، کچھ تجاویز تعبیر و سوالات پیش کرتا ہے۔

دیوانِ شاہ تُراب۔ مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش

بارھویں صدی ہجری کے صوفی شاعر شاہ تُراب علی بیجاپوری کا مجموعہ کلام۔ اُردو شعر و ادب کے ارتقا کو سمجھنے کے لیے دیوان کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

نوسرہار۔ اشرف بیابانی۔ مرتبہ: افسر امروہوی

شاہ اشرف بیابانی کی اس مثنوی کو افسر امروہوی نے بڑی محنت اور تحقیق سے مرتب کیا ہے۔

مثنوی نل دمن۔ احمد سراوی۔ مرتبہ: ڈاکٹر سید عبداللہ

فیضی فیاضی کی مشہور مثنوی کا پُرلطف خلاصہ۔ بارھویں صدی ہجری کے نصف ثانی میں مکمل ہونے والی یہ مثنوی اُردو شاعری کے ارتقاء کی تفہیم میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

جنگ نامہ آصف الدولہ و نواب رامپور۔ خلیفہ محمد معظم عباسی

مرتبہ: ڈاکٹر محمد ایوب قادری

شعرائے اُردو اور فارسی کے تذکرے ادبی تاریخ و تنقید کا بنیادی مآخذ ہیں۔ قدیم تذکروں کی بازیافت اور اشاعت سے اُردو ادب کے بے شمار گوشے روشن ہوتے ہیں۔ انجمن نے اُردو شعرا کے تذکروں کی اشاعت پر خصوصی توجہ کی ہے۔ فی الحال درج ذیل تذکرے دستیاب ہیں۔

نکات الشعرا۔ مولوی عبدالحق

میر تقی میر کا یہ تذکرہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے عالمانہ مقدمے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اعلیٰ نصابی حیثیت رکھتا ہے۔

عقدِ ثریا۔ مؤلفہ: شیخ غلام ہمدانی مصحفی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے یہ تذکرہ شعرائے فارسی کے حوالے سے مرتب کیا

تھا۔ بابائے اُردو کے محققانہ مقدمے کے ساتھ نادر تحفہ۔

گلشن ہمیشہ بہار۔ مؤلفہ: نصر اللہ خان خویشگی مرتبہ: ڈاکٹر اسلم فرخی

مولوی نصر اللہ خان خویشگی کا یہ تذکرہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے تذکرے گلشن بیخار کا ایک عالمانہ اور محققانہ ردِ عمل ہے۔ اسے ڈاکٹر فرخی نے جدید خطوط پر مرتب کیا ہے۔ یہ ابتدائی تنقید۔ اردو شعر پر ہر دو مکاتیب کا ایک دلچسپ موازنہ ہے۔

تذکرہ آزردہ

مؤلفہ: مفتی صدر الدین آزردہ۔ مرتبہ: مختار الدین آرزو

قطعہ منتخب

مؤلفہ: عبدالغفور نساخ۔ مرتبہ: ڈاکٹر انصار اللہ نظر

منتخب اُردو قطعات کے حوالے سے نادر اور اہم تذکرہ

عروس الاذکار

مؤلفہ: نقش حیدر آبادی۔ مرتبہ: افسر صدیقی

۱۲۸۹ھ میں مکمل ہونے والا شعرائے دکن کا تذکرہ جو بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

حدیقۃ المرام

مؤلفہ: واصف مدراسی۔ مترجم: سخاوت مرزا

علمائے مدراس کا تذکرہ۔

شامِ غریباں

مؤلفہ: لچھمی نرائن شفیق۔ مرتبہ: اکبر الدین صدیقی

فارسی کے ایسے شاعروں کا تذکرہ جو ایران سے برصغیر آگئے تھے اور یہیں کی خاک کا پیوند ہوئے۔

تذکرہ ہمیشہ بہار

مؤلفہ: کشن چند اخلاص۔ مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی

فارسی گو شعرا کا تذکرہ جو عہد اکبری تا جلوس محمد شاہ کے شعرا پر محیط ہے۔

افکار حالی۔ مرتبہ: بابائے اُردو مولوی عبدالحق

خواجہ الطاف حسین حالی کے بارے میں بابائے اُردو کے مقالات کا مجموعہ۔

خیالاتِ عزیز۔ مولوی عزیز مرزا

مولوی عزیز مرزا علی گڑھ تحریک اور برصغیر میں مسلمانوں کی علمی ترقی کے نامور رہنما تھے۔ ان کے علمی اور ادبی مضامین کا یہ مجموعہ ان کی بہترین یادگار ہے۔

مضامینِ سلیم۔ مولوی وحید الدّین سلیم

وحید الدّین سلیم سرسید کے ادبی معتمد جامعہ عثمانیہ میں اُردو زبان و ادب کے پروفیسر اور لسانیات کے ممتاز عالم تھے۔ انجمن نے ان کے مضامین یکجا کر کے تین حصّوں میں شائع کیے ہیں۔

جلد اوّل میں علمی اور ادبی مضامین۔ جلد دوم میں تاریخی اور سوانحی اور جلد سوم میں انشائیے شامل ہیں۔

مقالاتِ ناصری

میر ناصر علی دہلوی۔ مرتبہ: انصار ناصری

صلائے عام والے میر ناصر علی دہلوی اُردو کے البیلے انشا پرداز تھے۔ ان کے مضامین اُردو میں شاعرانہ نثر کا بہترین نمونہ ہیں۔

طنزیات و مقالات

میر محفوظ علی۔ مرتبہ: محی الدّین بدایونی

میر محفوظ علی مولانا محمد علی جوہر کے رفیقِ کار اور صاحبِ طرز انشا پرداز تھے۔ میر صاحب کے مضامین کا یہ مجموعہ بڑے اہتمام سے مرتب کیا گیا ہے۔

مکاتیبِ عبدالحق بنام مولانا محوی

مرتبہ: مولانا عبدالقیوم دسنوی

بابائے اُردو کے مکاتیب کا نادر مجموعہ

نصاب اردو۔ نثر و نظم:

یہ نصاب ایک مدت تک کراچی کے کالجوں میں شاملِ درس رہے۔ اُردو نثر و

نظم کا نمائندہ انتخاب۔

انتخابِ جدید۔ مرتبہ: ڈاکٹر وزیر آغا

جدید اُردو شاعری کا خصوصی انتخاب۔

مُنّد مالا۔ مصنّفہ: وِن نکا اچاریہ

ترجمہ: صدانی نقوی

چوتھی صدی عیسوی کے مشہور سنسکرت ڈرامے کا اُردو ترجمہ

داس کیپٹال

مصنّفہ: کارل مارکس ترجمہ: سید محمد تقی (جلد اوّل)

مارکس کی عہد آفریں تصنیف کا صاف ستھرا اور سلیس اُردو ترجمہ

رومیو جیولیٹ۔ شیکسپیر۔ ترجمہ عزیز احمد

شیکسپیر کے مشہور المیے کا رواں دواں ترجمہ۔

مثنوی قہرِ عشق۔ شیکسپیر۔ ترجمہ: شان الحق حقی

شیکسپیر کے مشہور ڈرامے انطونی کلوپطرہ کا منظوم اُردو ترجمہ جس میں اصل کی ساری خوبیاں اور لطافت موجود ہے۔ دوسرا ایڈیشن (انگریزی متن کے ساتھ)

فاؤسٹ۔ گوئٹے۔ ترجمہ: پروفیسر عبدالقیوم باقی

جرمنی کے نامور شاعر گوئٹے کے شہرہ آفاق ڈرامے کا منظوم اُردو ترجمہ۔

تاریخ مشاہیر یونان و روما۔ پلوٹارک

(اشاعت ثانی) ترجمہ: ہاشمی فرید آبادی

پلوٹارک کی مشہورِ عالم تالیف کا اُردو ترجمہ۔ جلد اوّل۔ مزید تین جلدیں زیر اشاعت ہیں۔

افکارِ عالیہ۔ ترجمہ اور خلاصہ: ڈاکٹر خان رشید

چون عظیم مغربی مفکرین کے ایک سو چار تصورات پر فکری کاوشوں کا مجموعہ۔

دانش مغرب کی تفہیم کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

گورکی کی آپ بیتی۔ مصنفہ: میکسم گورکی

ترجمہ: ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

مشہور روسی مصنف گورکی کی خود نوشت۔ عالمی ادب کی ایک روشن مشعل۔ صرف پہلی جلد دستیاب ہے۔

غالب کے خطوط

جلد اول، دوم اور سوم۔ مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم

غالب کے خطوط کا مکمل مجموعہ۔ اُردو میں تحقیق و ترتیب کا شاہکار۔ یہ تینوں جلدیں غالب کے خطوط کا مکمل احاطہ کرتی ہیں۔

اُردو دیوانِ غالب کامل۔ مرتبہ: کالی داس گپتا رضا

غالب کا یہ دیوان زمانی اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مرزا نے کون سی غزل کس سن میں لکھی تھی۔ غالب کے فکری ارتقا کو سمجھنے کے لیے اس دیوان کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ جناب کالی داس گپتا رضا نے یہ دیوان مرتب کر کے اُردو تحقیق میں ایک نئی علمی روایت کو فروغ دیا ہے۔

غالب آشفتہ نوا۔ ڈاکٹر آفتاب احمد خاں

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں کو غالب کے تنقید نگاروں میں اہم حیثیت حاصل ہے۔ غالب کی عشقیہ شاعری کے بارے میں ان کے مضمون کو کلاسیکی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ غالب آشفتہ نوا ڈاکٹر صاحب کے ۹ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں غالب کی عشقیہ شاعری، غالب کا آشوبِ آگہی جیسے اہم مضامین بھی شامل ہیں۔ مطالعۂ غالب کے سلسلے میں غالب آشفتہ نوا نہایت اہم کتاب ہے۔

ہنگامۂ دلِ آشوب۔ مقدمہ اور حواشی: سید قدرت نقوی

غالب کی لسانی تحقیق کے جواب اور جواب الجواب کے طور پر لکھی جانے والی تحریروں کا مجموعہ

مہر نیم روز۔ ترجمہ: پروفیسر عبدالرشید فاضل

غالب کی تحریر کردہ خاندانِ تیموری کی تاریخ کا مستند اُردو ترجمہ۔

گلِ رعنا معہ آشتی نامہ غالب

مرتبہ: سید قدرت نقوی

غالبیات کے سلسلے میں ایک اہم دریافت۔ کلامِ غالب کا نادر انتخاب۔ اصل مخطوطے کا عکس بھی شامل کتاب ہے۔

سبد باغ دو دُر۔ مقدمہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی

غالب کے فارسی کلیاتِ نظم و نثر کا تتمہ۔

پشتو شاعری۔ مرتبہ: فارغ بخاری۔ رضا ہمدانی

پشتو شاعری کا سیر حاصل انتخاب کا منظوم ترجمہ۔

پنجابی زبان و ادب کی تاریخ

مرتبہ: پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی

پنجابی زبان و ادب کے ارتقا کا تفصیلی جائزہ۔ پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی کی یہ کتاب پاکستان کی اہم علاقائی زبان کی ادبی رفتار کی مکمل روداد ہے جس میں پنجابی ادب ن خصوصیات مختلف ادوار اور اُردو اور پنجابی زبان کے رابطے کو بڑی خوبی سے واضح ا گیا ہے ایک باب میں پنجابی لوک گیتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک اہم یخی دستاویز ہے۔ حکومت پنجاب نے اس کتاب پر انعام بھی دیا ہے۔

مثنوی سیف الملوک

مصنفہ: میاں محمد بخش۔ مرتبہ: شفیع عقیل

پنجابی کے ممتاز شاعر میاں محمد بخش کی شہرہ آفاق مثنوی کی تلخیص اور اُردو ہ (دوسرا ایڈیشن)

موج موج مہران۔ مترجم: الیاس عشقی

معاصر سندھی شعرا کے سندھی کلام کا منظوم ترجمہ۔ انتخاب۔ از مراد مرزا

پنجابی کے پانچ قدیم شاعر۔ از شفیع عقیل

(سید ہاشم شاہ، شاہ حسین، حامد شاہ عباسی، خواجہ غلام فرید اور میاں محمد بخش) کا ق علمی تعارف

جراثیمات۔ مرتبہ: محمد احمد جامی
جراثیمات کے بارے میں معلوماتی تالیف۔

مہ و انجم
مرتبہ از مارٹن ڈیوڈسن۔ ترجمہ: ثنا الحق صدیقی
فلکیات کے بارے میں مستند معلومات کا گنجینہ صرف چند نسخے دستیاب ہیں۔

جدید معلومات سائنس۔ مرتبہ: میجر آفتاب حسن
صرف چند نسخے دستیاب ہیں۔

حیوانیات۔ پروفیسر محشر عابدی
اُردو میں حیوانیات کے موضوع پر مرتب کی جانے والی ابتدائی تالیف۔

کیمیا
قومی زبان کو ہر سطح پر ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے رائج کرنے کی غرض سے انجمن نے اُردو میں سائنس کی تدریسی سہولتوں کے لیے اصطلاحات کے تراجم کا آغاز کیا تھا۔ انجمن کے اس کام کو متعدد دوسرے اداروں نے مزید وسعت دی۔ فی الحال کیمیا سے متعلق چند نسخے دستیاب ہیں۔

اقتصادیات

فرہنگ اصطلاحات بینکاری
از محمد احمد سبزواری۔ جمیل الدین عالی کی معاونت اور مقدمے کے ساتھ
بینکاری کی تازہ ترین کتاب۔ بینکاری کے اُردو ترجمے اور مترادفات

ننھے منّوں کے لیے ننھی منی نظمیں۔ خاطر غزنوی
ننھے منّوں بچوں کے لیے پیاری پیاری نظمیں

پاکستان کی کہانی۔ بیگم سلمہ زمن
ننھے منّے پڑھنے والوں کے لیے تحریکِ پاکستان اور قیام پاکستان کی روداد۔ ایک دلچسپ اور دلوں کو بھانے والی کہانی کے انداز میں جسے پڑھ کر بچوں کے دلوں میں

پاکستان سے محبت بڑھے گی اور یہ احساس بھی ہوگا کہ پاکستان کس طرح قائم ہوا۔

یہ فہرست جیسا کہ عرض کیا گیا پوری نہیں ہے۔ صرف ایک نمونہ ہے۔ ان متنوع اور نہایت اہم علمی موضوعات کا۔ جن پر انجمن کام کرتی رہی اور کر رہی ہے۔ دوسری بہت سی اہم کتابوں کا حوالہ اس لیے نہیں آسکا کہ فی الحال محولہ بالا کتابوں کی چند جلدیں ہی اسٹاک میں ہیں یعنی شائقین کی طلب پر انھیں فراہم ہو سکتی ہیں۔ (انجمن شروع سے آج تک اپنی مطبوعات کی فہرست کسی قدر تعارف کے ساتھ الگ چھاپ رہی ہے) بعض کے دوسرے ایڈیشن آگئے ہیں۔

امید ہے کہ زیر نظر کتابیں جن پر یہ مشترک حرفے چند پیش کیا گیا۔ اس خلا کو بھی پورا کریں گی جو ان کے نایاب ہونے سے اتنے دن تک محسوس کیا جاتا رہا ہے اور نئے قارئین کو ایک جھلک اس جستجو، اس محنت اور ان ترجیحات کی بھی دکھائیں گی جن میں ہمارے معزز پیش رو اور ہم، کسی تجارتی غرض کے بغیر، ۱۹۰۳ء سے اب تک "مبتلا" ہیں۔ یہ تو یقین ہے ہی کہ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

(۱۹۹۲ء)


maablib.org

ہماری چند مطبوعات

[illegible]	ڈاکٹر آفتاب [illegible]	[illegible]
[illegible] اردو تنقید	ڈاکٹر [illegible]	[illegible]
[illegible]	مرتبہ: ڈاکٹر [illegible] فاروقی	[illegible]
[illegible]	جمیل الدین عالی	[illegible]
اردو اور ہندی کے مشترک اوزان	ڈاکٹر [illegible]	[illegible]
[illegible] (حصہ اول)	مرتبہ: ڈاکٹر [illegible]	[illegible]
(حصہ دوم)	" " " "	[illegible]
(حصہ سوم)	" " " "	[illegible]
[illegible]	مرتبہ: [illegible]	[illegible]
[illegible]	ڈاکٹر [illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible] مرتبہ: [illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible] مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible] اردو	[illegible]	[illegible]
تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت - جلد اول و دوم	مرتبہ: سید ہاشمی فرید آبادی	[illegible]
[illegible] - حصہ اول	[illegible]	[illegible]
[illegible] حصہ اول	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible] ہاشمی	[illegible]
[illegible] اردو	ڈاکٹر [illegible]	[illegible]
[illegible]	مرتبہ: [illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ، کراچی [illegible]